رونقِ بزمِ جہاں

ڈاکٹر اسلم فرخی

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے
(مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں
تبدیل کیا جاتا ہے، ہمارے کتابی سلسلے
کا حصہ بننے کیلئے **وٹس ایپ** پر رابطہ
کریں

فہرست

حکایت ان خاکوں کی

ایک مدت سے متعدّد بیماریوں کی بنا پر میرا لکھنا پڑھنا تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ محدب شیشہ بھی کام نہیں دیتا۔ صرف اپنی دیرینہ عادت کے مطابق صبح سویرے اخبار میں شہ سرخیاں پڑھ لیتا ہوں۔ اسی عالم میں جولائی ۱۲ء میں میرے چھوٹے بھائی انور احسن صدیقی کا ایک بڑی جان لیوا بیماری کے بعد انتقال ہو گیا۔ انور ہماری آنکھوں کا تارا، ذہین، نکتہ رس عالم، ادیب، شاعر، ناول نگار، خاکہ نگار اور مترجم تھا۔ طالبِ علمی کے زمانے میں نامور طالب علم رہ نما بن گیا تھا۔ پہلے مارشل لاء میں کراچی کے دس طلبہ کے ساتھ قید کاٹ چکا تھا۔ اُس کے انتقال کا ہم سب کو بڑا صدمہ ہوا۔ میں اُس کے جنازے کے پاس بے بس بیٹھا ہوا گہری سوچ میں غرق تھا۔ انور کی زندگی کے واقعات فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اسی کیفیت میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ انور کا خاکہ لکھنا چاہیے۔ سوچتا رہا کئی بار ہمّت کی مگر نہ آنکھوں نے ساتھ دیا نہ ہاتھ نے نہ ذہن نے۔ یہاں تک ۲۰۱۳ء کا دسمبر شروع ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ Now or Never کا مرحلہ آ گیا ہے۔ لکھنا ہے تو لکھو ورنہ سب کچھ بھول جاؤ۔ اس خیال کا آنا اور میرا قلم سنبھالنا، ہمت کر کے لکھنا شروع کر دیا اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خاکہ مکمل ہو گیا۔ انور کے خاکے میں مولوی صاحب کا تذکرہ تھا۔ ان کا خاکہ بھی لکھ دیا۔ یہ خاکہ لکھ رہا تھا کہ ملتان سے ڈاکٹر عبد السلام نے اطلاع دی کہ یارِ قدیم لطیف الزماں کا انتقال ہو گیا۔ ان کا خاکہ بھی لکھ گیا اور عزیز دوست اور شاعر یعقوب لطیف کا خاکہ بھی لکھا گیا۔ اختر صاحب میرے بڑے دیرینہ دوست تھے ارادہ تھا کہ ان کا خاکہ لکھوں گا وہ بھی لکھ گیا۔ ایک بزرگ عزیز کا خاکہ لکھنا چاہتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے ٹلتا رہا وہ بھی اس سلسلے میں لکھ لیا گیا۔

یہ سارے خاکے میں نے آصف فرخی کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے پڑھے اور کہا،

"ابو! آپ نے بڑے اُداس خاکے لکھے ہیں۔" اُداسی کا لفظ سن کر مجھے شبیر علی کاظمی یاد آئے جن کی زندگی کا ایک حصہ اُداسی میں گزرا تھا۔ اُن کا خاکہ بھی لکھا گیا۔ اب آصف نے پھر کہا، "ابو! یہ سارے خاکے ہو گئے "مہادیو" کا خاکہ بھی تو لکھیے۔" مہادیو گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں بنگالی کے اُستاد اور میرے عزیز دوست تھے۔ اُن کا خاکہ بھی لکھ دیا گیا اور "قلم آمجار سید و بشکست" لکھنا پڑھنا۔ اخبار کی شہ سرخیوں تک محدود۔ دن بھر بیٹھے ہوئے اونگھتے رہو۔

کچھ خاکے لکھے ہوئے رکھے تھے۔ شائع ہوئے تھے مگر کتاب کی صورت میں نہیں آئے تھے انہیں یک جا کر کے ایک مجموعے کی شکل دی اور محمد حسین آزاد کا خاکہ جو میں نے لاہور میں آزاد کے صد سالہ یوم وفات کی تقریب میں پڑھا تھا وہ بھی شامل کر لیا۔ یہ خاکہ میری کتاب نگارستان آزاد کا سرنامہ تھا۔ نگارستان آزاد شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی کوئی بھی نسخہ باقی نہیں بچا۔

قارئین اس خاکے کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے چنانچہ یہ خاکہ بھی اس مجموعے میں شامل کرنا مناسب سمجھا گیا اور خاکوں کی ترکی تمام ہو گئی۔

اب میں ہوں اور بقول غالبؔ، "اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔" نجانے شہر آرزو کا ماتم کب تمام ہو گا۔

۲۷ اپریل ۲۰۱۴ء

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۳۵ء

سدا بہار کہانیوں والی بڑی ماں

"لڑکی ہوئی ہے!" اس آواز سے ماں، دادی، نانی، سب کی باچھیں کھل گئیں۔ کیوں نہ کھلتیں، پہلوٹی کی لڑکی تھی۔ باہر مردانے میں اطلاع گئی تو دادا نے پوتی کو دیکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ لڑکی ہونے سے ان کے مردانہ وقار کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی۔ رہ گئے باپ، تو وہ بچارے سدا کے بلّلے، باپ کے سامنے کیا دم مارتے۔ ہی ہی کر کے چپ ہو گئے لیکن دل ہی دل میں بڑے خوش ہوئے کہ سارے زمانے میں اُن کی مردانگی کا اعلان ہو گیا ہے۔ دادا کی ناخوشی کی بات اندر گئی تو ماں، دادی، نانی سب کے چہرے مُرجھا گئے مگر تھوڑی دیر میں جب بڑی پھوپی جھم جھم کرتی آ پہنچیں تو سب کے چہرے بحال ہو گئے۔ پھوپی نے بچی کو غور سے دیکھا۔ بولیں "سچ مچ چاند کا ٹکڑا ہے۔ کیا موہنی مورت ہے۔ روشن پیشانی، نازک دہانہ، نازک نازک ہاتھ پیر، بالکل گلاب کا پھول ہے۔" یہ کہہ کر پھوپی نے اپنے بڑے سے کارچوبی بٹوے سے ملکہ شاہی روپیہ نکال کر زچہ کے پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے ٹھیکرے میں پھینکا اور زور سے کہا "ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ لڑکی ہماری ہوئی۔" حلال خوری جو بڑی دیر سے کونے میں بیٹھی ہوئی تھی فوراً لپکی اور ٹھیکرے سے روپیہ نکال کر اپنے ڈب میں رکھ لیا۔ نانی چھٹی لے کر آئیں۔ بال اُترے۔ عقیقہ ہوا۔ احمدی بیگم نام رکھا گیا جو عرفِ عام اور کثرتِ استعمال سے "امدی" ہو گیا۔ یہ سب ہوا مگر دادا کے ماتھے کی شکن نہیں گئی۔

امدی بڑی ہوئیں۔ پڑھنے لکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ دادا کا قول تھا کہ "لڑکی کو پڑھا کر ہمیں خاندان کا نام نہیں اچھلوانا ہے۔" حالانکہ خاندان کی بعض لڑکیاں اپنے اپنے گھروں پر پڑھتی تھیں۔ ماں نے امدی کو قرآن مجید کی چند سورتیں یاد کرا دیں، نماز سکھا دی۔ امدی کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ سب کو حیرت یہ تھی کہ امدی نے سورتیں ایسی جلدی یاد کر لیں۔ ماں کا بس ہوتا تو پورا قرآن شریف پڑھا دیتیں مگر دادا کی اجازت نہیں تھی۔

ماں نے امدی کو سلائی پرائی پر لگایا مگر اس کام میں اُن کا جی نہیں لگا۔ ماں سلائی پرائی میں سارے خاندان میں مشہور تھیں۔ بڑا نازک بخیہ کرتی تھیں۔ کپڑے کاٹنے میں بڑی ماہر تھیں۔ غرارہ، تنگ پیجامہ، کُرتا، مردانہ کُرتا، پیجامہ سب بڑے سلیقے سے اور بہت اچھے کاٹتی تھیں۔ شادی بیاہ کے موقعے پر غرارے اُنہیں کے سپرد کیے جاتے تھے۔ مغلانیوں کو مات کرتی تھیں مگر بیٹی نے کچھ سیکھ کر نہیں دیا۔ لاکھ ماں نے انگلیوں میں سوئیاں چبھوئیں مگر اُس اللہ کی بندی پر اثر ہی نہیں ہوا۔ کچھ گونتھنا، کانٹھنا سیکھ لیا۔ بس یہی بہت تھا۔ پھٹاٹوٹا سی لیا۔ پیوند لگایا۔ باقی اللہ اللہ۔

کھانا پکانے میں امدی کا دل خوب لگن تھا۔ چھوٹی سی عمر میں انہوں نے ماں کو طاق پر بٹھا دیا۔ سارا باورچی خانہ اُن کے ذمے۔ بگھارے بینگن ایسے مزے کے پکاتی تھیں کھانے والے انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔ قورمہ اعلیٰ درجے کا پکاتی تھیں۔ چپاتی وہ جسے ریشمی کہتے ہیں، گاجر اور انڈے کے حلوے بہت اچھے بناتی تھیں۔ شب برات میں اُن کے بنائے ہوئے حلووں کی دھوم ہوتی تھی۔ سب کہتے تھے، حلوہ بنانے میں امدی کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ ان کے سلیقے سے باورچی خانہ چُنار رہتا تھا۔ صاف ستھرا۔ دھوئیں اور گرد سے پاک۔ برتن بھانڈے سب اپنی اپنی جگہ قرینے سے اور سارے برتن چماچم کرتے ہوئے۔

امدی بڑی ہوتی گئیں۔ اُنہیں بڑی بوڑھیوں کی باتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ جہاں خاندان کی چار بوڑھیاں جمع ہیں وہاں امدی پانچویں ہوتیں۔ باتیں بڑے غور سے سنتی تھیں۔ سنتی کیا تھیں دل میں اُتار لیتی تھیں اور ایسے مزے سے دہراتی تھیں کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے تھے۔ انہیں کہانیوں سے دلی رغبت تھی۔ ہر ایک سے فرمائش کر کے کہانی سُنتیں اور یادداشت کی کتاب میں ٹانک لیتیں۔ ان کی ہم جولیوں میں جو لڑکیاں اردو پڑھی ہوئی تھیں اُن سے فرمائش کرتیں۔ پنڈ پڑ جاتیں۔ ہم جولیاں اُنہیں کتابوں سے کہانیاں سُناتی تھیں۔ ایک دفعہ دادا نے اُنہیں کتاب سے کہانی سُنتے دیکھ لیا۔ آپے سے باہر ہوگئے۔ اُس لڑکی کا جو کتاب سے کہانی سنا رہی تھی اپنے گھر میں آنا جانا بند کر دیا مگر امدی پر اس ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور کہانیوں کی دنیا میں گم رہیں۔ بات صرف سننے کی نہیں تھی سنانے کی بھی تھی۔ کہانی بڑے سلیقے اور مزے سے سناتی تھیں۔ زور کی جگہ زور، ہنسی کی جگہ ہنسی، لڑائی کا ذکر آگیا تو امدی بھی تن گئیں۔ لہجہ بدل

گیا۔ غم کا بیان ہوا تو کہانی سناتی جارہی ہیں۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتی جارہی ہیں۔ سارے خاندان میں ان کی کہانیوں کا شہرا ہو گیا۔ بعض لوگوں نے ان کی کہانیاں سن کر کہا کہ "یہ لڑکی اگر پڑھ جاتی تو آسمان میں تھگلی لگاتی۔ بہت بڑی داستان گو ہوتی۔"

ایک دن امدی کے سخت گیر دادا نزلے بخار میں مبتلا ہوئے اور چند ہی روز میں چٹ پٹ ہو گئے۔ ان کے اُٹھ جانے سے گھر کی فضا بدل گئی۔ امدی کے باوا کو باپ کے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا۔ وہ بھی بیمار رہنے لگے۔ اُدھر پھوپی نے شادی کے لیے زور ڈالنا شروع کر دیا۔ دادا کا چہلم ہو چکا تو پھوپی کا اصرار بہت بڑھ گیا۔ آخر تاریخ طے ہو گئی۔ برات آئی۔ امدی دلہن بنیں۔ ہم جولیوں نے کہا "کیا چاند سے بنّو ہے۔" گانا بجانا بھی ہوا۔ امدی کی ماں بڑے سلیقے کی عورت تھیں۔ بڑا بھاری جہیز دیا۔ پھوٹی آنکھ کا تارا یہی ایک بیٹی تھی۔ جو کچھ پاس پلّے تھا سب کچھ اُس کو دے دیا۔ امدی روتی بلکتی "بابل۔ ہم تو تیرے آنگن کی چڑیاں" سُنتی سسرال پہنچیں۔ میکہ فرخ آباد میں تھا سسرال تین میل دور فتح گڑھ میں تھی۔ فرخ آباد شہر کہلاتا تھا۔ فتح گڑھ کو سب کمپو کہتے تھے۔ اِکے تانگے ہر وقت چلتے رہتے تھے۔ آنے جانے کی کوئی دقت نہیں تھی۔

امدی سسرال پہنچیں تو کچھ دن پھوپی جان صدقے قربان ہوتی رہیں۔ پھر جو انہوں نے رنگ بدلا تو امدی کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ ایسے ایسے طعنے "اماں باوا نے یہی سکھایا ہے۔ پھوہڑ کہیں کی۔" پھر بات اور بڑھی۔ کوسنا کاٹنا شروع ہوا۔ پھر نوبت مار پیٹ پر آ گئی۔ امدی کی ساس بڑی ہتھ چھٹ عورت تھیں۔ چار چوٹ کی مار پڑنے لگی۔ جو چیز ہاتھ میں ہے امدی پر کھینچ ماری۔ طمانچہ مار دیا۔ دھکا دے دیا۔ "اے ہے۔ یہ تم نے روٹی پکائی ہے یا کتّے کا کفن سیا ہے۔ تجھے تو بس باتیں مٹکانے میں مزا آتا ہے۔ نگوڑی۔ نامراد۔" امدی کے شوہر یوسف ماں کے بڑے لاڈلے تھے۔ گھر میں کم رہتے تھے آزاد پنچھی تھے۔ کوئی کام دھام بھی نہیں کرتے تھے۔ بیوی کے مقابلے میں ماں کی پچ کرتے تھے۔

ساس امدی کو عاجز کرنے کے لیے نئے نئے بہانے ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ ایک دن محلے پڑوس کی کچھ عورتیں امدی کی ساس سے ملنے آئیں۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ساس نے امدی کی طرف دیکھا اور کہا "اے بہو! اس وقت تو گلگلے ہو جائیں۔ بڑا مزا دیں گے۔" یہ کہہ

کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "دیکھو اتنے بڑے۔" امدی اٹھ کر باورچی خانے جانے لگیں تو ساس نے ہاتھ پیچھے کر کے "چھوٹے چھوٹے کا اشارہ کیا۔ امدی نے گرم گرم گلگلے دو رکابیوں میں لا کر سب کے سامنے رکھ دیے۔ گلگلے بڑے بڑے تھے۔ ساس نے قہر کی نگاہوں سے امدی کو دیکھا۔ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ جب عورتیں چلی گئیں تو وہ ڈونکیں، "اری کم بخت تو تو گھر لٹا دے گی۔ اتّے بڑے بڑے گلگلے بنائے۔ یہ گلگلے تھے کہ تیری اماں کا سر تھے۔ نامراد۔ تجھے تو ایسی جگہ مارے جہاں پانی بھی نہ ہو۔"

دن رات کی تھکا فضیحتی تھی۔ امدی چپکے چپکے روتی رہتی تھیں۔ میکے جانے پر پابندی تھی۔ کبھی کبھار جانا ہو گیا تو ماں کی صورت دیکھتے ہی امدی کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آتے تھے۔ وہ بیچاری بھی کیا کرتیں۔ یہی کہتیں۔ "نہ رو بٹیا۔ یہ وقت سدا نہیں رہے گا۔"

امدی میکے سے واپس آتیں تو ساس ادبدا کر بیٹے کے سامنے کہتیں۔ "میکے جاتی ہے تو بڑے بڑے گٹھر باندھ کر چپکے سے ساتھ لے جاتی ہے۔ بڑی میکہ بھراؤ ہے تمہاری بیوی۔ یہ تو سارا گھر اپنے میکے پہنچادے گی۔"

امدی ساس کی بہتیری خدمت کرتیں مگر انہیں تو امدی کی صورت سے چڑ تھی۔ امدی کے میکے والے کہتے تھے۔ "امدی کے حق میں ساس ڈائن ہو گئی ہے۔" ساس بوڑھی ہو گئی تھیں۔ امدی سر دُھلاتیں۔ بالوں میں تیل ڈالتیں۔ کنگھی کرتیں۔ کبھی کبھی انہیں نہلاتی بھی تھیں۔ کپڑے بدلواتیں۔ کھانا کھلاتی۔ ہاتھ پاؤں دباتیں۔ سب کچھ کرتیں مگر وہی موت کا چلّو ہاتھ میں۔ امدی اپنی کھال کی جوتیاں بنوا کر بھی پہنا دیتیں تو ان کے بھانویں نہ پڑتا۔ ایک دن سب کھانا کھا رہے تھے۔ امدی بھی سہمی ٹھٹھکی کھانا زہر مار کر رہی تھیں۔ ساس نے گھورا اور بیٹے سے کہا، "دیکھ رہے ہو۔ کیا بڑے بڑے نوالے کھا رہی ہے۔ مر بھکی کو اپنے گھر میں کھانا بھی نہیں نصیب ہوتا تھا۔ فاقے ماری یہاں سب کچھ ہڑپ کر جاتی ہے۔" بیٹے بھی سپوت تھے۔ ماں کی بات سن کر کھی کھی کرنے لگے۔ یہ نہ کہہ سکے کہ اماں! ذرا تو لحاظ کیا کرو۔ اپنا کھانا دیکھو۔ اس بڑھاپے میں بھی ہڈیاں چوستی ہو۔ بڑے مزے سے بڑے بڑے نوالے کھاتی ہو۔ کہتے کیسے۔ ماں منھ نوچ لیتیں۔

امدی کے یہاں ایک بیٹی بھی ہو گئی۔ سکینہ نام رکھا گیا۔ دادی کو پوتی سے کوئی رغبت

نہیں تھی۔ اپنے ہی نخروں میں لگی رہتی تھیں۔ بیٹی کے ہونے سے امدی کا غم کچھ کم ہو گیا۔ مگر جب یہ خیال آتا کہ خدانخواستہ میری طرح میری بیٹی کی ساس بھی ڈائن ہو گئی تو کیا ہو گا۔ سوچ میں پڑ جاتیں۔ ساس ٹہوکا دیتیں، "اے۔ کس سوچ میں بیٹھی ہو۔ اماں یاد آ رہی ہوں گی۔ تمہارا بس چلے تو ابھی یکہ منگاؤ اور دفع ہو جاؤ۔ نگوڑ ماری۔ کام کی نہ کاج کی۔ ڈھائی سیر اناج کی۔"

ساس سارے دن فیل مچاتی رہتیں۔ امدی کو کوستی رہتیں۔ دبا کے خدمت لیتیں اور بات بات پر لتّے لے ڈالتیں۔ بڑھاپے میں ان کا بتا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ میاں یوسف ہمیشہ گھر سے غائب رہتے۔ ماں کے سامنے ہی نہیں پڑتے تھے۔

آخر ایک دن بڑی بی کا بھی بلاوا آ گیا۔ امدی کو آزادی مل گئی لیکن ڈھنڈار مکان میں اُن کا جی نہیں لگتا تھا۔ دل میں ہول اُٹھتا رہتا تھا۔ سکینہ بڑی ہو گئی تھی۔ مگر بیچاری گھر میں قید تھی۔ نہ کوئی ہم جولی، نہ سہیلی، نہ کوئی بات چیت کرنے والا۔ اٹّھوں ماری اکیلی گڑیوں سے کھیلتی رہتی تھی۔ میاں یوسف عموماً گھر سے غائب۔ دو دو تین تین دن صورت نہیں دکھاتے تھے۔ کام دھام کچھ کرتے نہیں تھے۔ تھوڑی سی جائیداد تھی۔ اُسی کی آمدنی سے گزر اوقات ہوتی تھی۔

یوسف میاں گانے بجانے کے رسیا تھے۔ ایسے ویسے رسیا۔ سارے شہر میں اُن کا شہرا تھا۔ آج گنگا پار راجے پور میں گانے کا جلسہ ہے۔ گانے والیوں کو کھچڑی دینے میاں یوسف کو بھیجا گیا۔ آج اندر گڑھ میں ٹھاکر بلراج سنگھ کے یہاں مجرا ہے۔ میاں یوسف ناچنے والیوں کو سائی دینے گئے تھے۔ وہی منتظم ہیں۔ یاقوت گنج میں فقیر محمد خان کے یہاں بھنڈئی ہو گی۔ سارا انتظام میاں یوسف کے سپرد ہے۔ وہ خود بھی ستار بھی بجاتے تھے۔ رونقِ محفل ہوتے تھے۔ سب اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور اصرار کر کے اپنے یہاں مہمان رکھتے تھے۔ یوسف میاں ستار اچھا بجاتے تھے۔ اس وجہ سے بھی وہ ناچ رنگ کی محفلوں میں مقبول تھے۔

ایک صبح یوسف میاں بڑے خوش خوش گھر آئے۔ دو تین دن سے غائب تھے۔ بیوی کو آواز دی، "اجی سنتی ہو۔" امدی نے کہا، "جی۔ کیا حکم ہے۔" یوسف میاں بولے، "حکم وکم کچھ نہیں ہے۔ ان دنوں شہر میں ایک بڑا نامی گرامی طبلیا آیا ہوا ہے۔ بڑی دون کی لیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ بڑا کڑوا طبلیا ہے۔ رات بھائی بنّے خان کہنے لگے۔ بھائی یوسف تمہاری اور اس کی ایک

جھوٹ ہو جائے۔ ستار اور طبلے کا مقابلہ مزا دے جائے گا۔ وہ طبلیا کہنے لگا۔ نا میاں نا۔ میں اتائیوں کے ساتھ نہیں بجاتا۔ اس پر میں نے کہا، خان صاحب۔ میں اتائی ضرور ہوں مگر ایسا بھی نہیں۔ وہ ہنسنے لگا۔ مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ بولا، ذرا سی دیر بے تالہ کر دوں گا۔ خیر صاحب مقابلہ شروع ہوا۔ میں نے بھی جان لڑا دی۔ اُس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آر پر آر۔ آخر ایک جگہ میں نے ایسا باج بجایا کہ وہ بے تالہ ہو گیا۔ بڑی کر کری ہوئی۔ ساری شیخی خاک میں مل گئی۔ کہنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتائیوں میں ایسے گُنی بھی ہوتے ہیں۔" امدی بے تعلقی سے میاں کی باتیں سنتی رہیں۔

سکینہ نے جو باپ کی باتیں غور سے سن رہی تھی، پوچھا۔ ابا ستار کیسا ہوتا ہے۔ یوسف نے کہا۔ "کسی دن لا کر تمہیں دکھا دیں گے۔" امدی اب کچھ بولنے لگی تھیں۔ کہنے لگیں، "ستار اس گھر میں نہیں آئے گا۔ یہ سب چیزیں گھر سے دور ہی رہیں تو اچھا ہے۔" میاں یوسف اس وقت نیکی کے جامے میں تھے۔ بیوی کی بات سن کو چپکے ہو رہے۔ ستار باہر ہی بجتا رہا۔

میاں یوسف کی بے اعتدالیاں حد سے بڑھ گئیں۔ ماں کا کچھ ڈر خوف تھا وہ جاتا رہا۔ ایک دن منجھلے میاں نے اُنہیں اپنے یہاں بلایا۔ منجھلے میاں یوسف کے خالہ زاد بھائی تھے۔ عمر میں کچھ بڑے تھے۔ مگر منجھلے میاں سارے خاندان کے سربراہ سمجھے جاتے تھے۔ سارے بھائیوں کو پال رہے تھے۔ امیر کبیر تھے۔ خیموں کے ڈیروں کے کارخانے تھے۔ فتح گڑھ میں بہت بڑا کارخانہ تھا۔ ایک کارخانہ کانپور کا تھا۔ تیسرا اندور میں تھا۔ اندور کے راجہ ہلکر سے ان کی یاد اللہ تھی۔ اُس کے کہنے پر وہاں کارخانہ قائم کیا تھا۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ منجھلے میاں کے دوست تھے۔ افغانستان کے بادشاہ امیر عبدالرحمن خان سے بھی اُن کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ خیمے ڈیرے وہاں بھی جاتے تھے۔ بڑے دل والے تھے۔ بہت بڑی کوٹھی بنوالی تھی جس میں سارے بھائی اور نجانے کتنے اُلفتے رہتے تھے۔ رجواڑوں کا سا حال احوال تھا۔

یوسف میاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ منجھلے میاں نے بلایا ہے تو ذرا گھبرائے۔ کھٹک گئے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ خیر گئے۔ منجھلے نے بٹھایا۔ پھر بڑی نرمی سے بات چھیڑی۔ "شہر بھر میں بدنامی ہو رہی ہے۔ یہی حال رہا تو شہر کے شریف لوگ تم سے ملنا جلنا چھوڑ دیں گے۔ دن رات

ڈوم ڈھاڑیوں میں گھرے رہتے ہو۔ ذرا آئینہ لے کر اپنی شکل دیکھو۔ بالکل ڈھاڑی معلوم ہوتے ہو۔ کوئی کام دھام کرو جو چار آدمیوں میں عزت ہو۔ میرے بھائی ہو اس لیے لوگ تمہیں گوارا کر لیتے ہیں ورنہ کوئی تمہارے پاس بھی نہ پھٹکے۔ بولو! کیا کام کرو گے؟ کپڑے کی دکان کھلوا دوں۔ آج ہی فرخ آباد میں لالہ پنّالال سے کہلوائے دیتا ہوں۔ کپڑا آ جائے گا۔ باقی کام تمہارا ہے۔ محنت کرو گے تو دکان چلے گی اور ہاں بھاوج اور سکینہ اکیلے مکان میں پڑی ہوئی ہیں۔ کوٹھی میں بہت جگہ ہے۔ دونوں کو لے کر یہاں آ جاؤ۔ دو چار آدمیوں کی صورت تو نظر آئے گی۔"

منجھلے میاں کا کہنا، کہنا نہیں حکم تھا۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی تھی۔ یوسف، امدی، سکینہ سب کوٹھی میں آ بسے۔ ایک بڑا سا کمرہ انہیں مل گیا۔ منجھلے کی بیوی نے جو منجھلی کہلاتی تھیں اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ منجھلی بڑی سیر چشم، کھلے دل اور کھلے ہاتھ کی بیوی تھیں۔ سارے کنبے کا خیال رکھتی تھیں۔ عید بقر عید کے موقعے پر جب سب کے کپڑے بنتے تو امدی، سکینہ، منجھلی اور اُن کی نواسی کے بھی نئے جوڑے بننے لگے۔ بندھے بزار کوٹھی آتے۔ کپڑوں کے تھان دکھاتے اور منجھلی سب کو پاس بٹھا کر پسند کرتی جاتیں۔ منجھلے میاں کے چھوٹے بھائی "میاں" کہلاتے تھے لیکن ان کی بیوی کو سب سنجھلی کہتے تھے۔ خاندان کا سارا حسن ان کی صورت میں سما گیا تھا۔ بڑی نیک، عبادت گزار، سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ انہوں نے امدی کو کلیجے سے لگا لیا۔ منجھلے میاں کے بھتیجے احسن میاں بھی اُنہیں کے ساتھ تھے۔ احسن میاں کی بیوی نے جو لکھنؤ کی تھیں اور اسکول کی پڑھی ہوئی تھیں، دونوں ماں بیٹیوں کی بڑی تواضع کی۔ امدی کے دل کی کلی کھل گئی۔ آنا جانا ملنا ملانا تو پہلے بھی تھا مگر اب بڑی گھتم مٹھتم ہو گئیں۔

یوسف میاں کی دکان چل نکلی۔ دن بھر دکان پر اور رات کو وہی رفتار بے ڈھنگی۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ رات کو گیارہ بجے سے پہلے گھر آ جاتے تھے۔ معلوم تھا کہ کوٹھی کا پھاٹک رات کے گیارہ بجے بند ہو جاتا ہے پھر فجر سے پہلے نہیں کھلتا۔ چیخو چلاؤ تو منجھلے سن لیں گے۔ ناخوش ہوں گے۔ اگر کسی رات کو دیر ہو جاتی تو کسی یار دوست کے یہاں پڑ رہتے یا کوٹھی کی دکانوں میں سے دکان کے آگے والے چبوترے پر لمبی تانتے مگر یہاں مشکل تھی کہ رات کو گزرنے والے چوکیدار اُنہیں تنگ کرتے۔ جب وہ ہڑبڑا کر اٹھتے اور چوکیدار یہ دیکھتے کہ ارے یہ تو منجھلے میاں

کے بھائی ہیں تو چکپے ہو جاتے۔

کچھ دن کے بعد منجھلے میاں نے یوسف کو پھر بلایا۔ بولے "بھائی یوسف! سکینہ اب بڑی ہو گئی ہے۔ اس کے بیاہ شادی کی فکر کرو۔ کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈو۔" یوسف بیچارے اچھا رشتہ کیا ڈھونڈتے۔ خاندان بھر میں یہ کام منجھلی انجام دیتی تھیں۔ انہوں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر فرخ آباد میں ایک اچھا رشتہ تلاش کر لیا۔ خاندان اچھا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ لڑکا کتابوں کی دکان کرتا تھا۔ سبحان نام تھا۔ نیک اور شریف تھا مگر کہنے والوں نے کہا۔ مزاج میں ذرا لٹک ہے۔ اپنے پیر صاحب کے یہاں زیادہ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ کسی نے اس بات کا خیال بھی نہیں کیا۔ سکینہ کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ منجھلے میاں کے گھر کی شادی تھی۔ دھوم دھام کیوں نہ ہوتی۔ میاں یوسف کی بیٹی کی شادی تھی۔ ناچ گانا کیوں نہ ہوتا۔ خوب ہوا۔ منجھلے میاں نے اجازت دے دی تھی۔ برات کے ساتھ آنے والی ڈومنیوں نے سمدھنوں کو سڑی سڑی کھلی اور ڈھکی سنائیں۔ ان کی گالیوں پر امدی نہالوں نہال ہوئی جا رہی تھیں۔ بس نہیں تھا کہ تن کے کپڑے اتار کر دے دیتیں۔ سکینہ چھکوں پھکوں روتی سسرال سدھاریں۔ امدی اکیلی رہ گئیں۔

کوٹھی میں لڑکیاں بہت تھیں۔ جمیلہ، ہاجرہ، زہرا، منّی، اصغری۔ سب نے امدی کو جو اب بڑی ماں کہلانے لگی تھیں، سکینہ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ سارا دن گھیرے رہتی تھیں۔ احسن کی دلہن اُن کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ "اے بڑی ماں! یہ شربت پی لو۔ بڑا ٹھنڈا ہے۔ بڑی ماں! یہ چھپرا مؤ سے پیڑے آئے ہیں چکھ کر تو دیکھو۔ اماں جان (منجھلی) نے تو بڑی تعریف کی۔ مگر اکلوتی بیٹی کی جدائی کا غم کلیجہ نوچتا ہی رہا۔ ان کی زندگی میں اکیلے پن کا زہر گھل گیا۔

یوسف نے شروع شروع میں تو بڑی محنت کی مگر پھر اپنے اصلی رنگ پر آ گئے۔ کپڑوں کے تھان یاروں کے پیٹ میں پہنچنے لگے۔ دکان میں اُلّو بولنے لگا۔ ایک دن لالہ پنّا لال نے منجھلے میاں کو دبے لفظوں میں بتایا کہ ذرا یوسف کی دکان کا جائزہ تو لو۔ منجھلے میاں نے آدمی بھیجا تو اس نے آ کر بتایا کہ "وہاں تو بھیروں ناچ رہا ہے۔ دکان خالی پڑی ہے۔" منجھلے میاں بڑے آدمی تھے۔ بولے کچھ نہیں۔ دکان میں تالے ڈلوا دیے۔ یوسف کو آزادی مل گئی۔

ایک دفعہ بڑی ماں سو کر اٹھیں تو بڑی بے چین بے چین تھیں۔ ناشتہ بھی ڈھنگ سے

نہیں کیا۔ دوپہر کو کھانے پر سب کے ساتھ بیٹھیں تو دو تین لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ کہنے لگیں، "نجانے کیسا کھانا ہے۔ سارا حلق کڑوا ہو گیا۔" منجھلی چڑ گئیں۔ کہنے لگیں۔ کھانا تو ہم سب نے کھایا ہے کسی کا حلق کڑوا نہیں ہوا۔ کیوں سنجھلی؟" سنجھلی نے کہا "امدی کو وہم کی بیماری ہے۔ ذرا ذرا سی بات کا وہم کرتی ہیں۔ بڑی ماں نے اُس رات بھی کھانا نہیں کھایا۔ یہی کہتی رہیں، "کڑواہٹ حلق میں گھلی جا رہی ہے۔ ہمارا دل دکھ رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ ضرور ہونے والا ہے۔"

اُس رات فتح گڑھ میں مجرے کی محفل تھی۔ بڑا مجمع تھا۔ بڑی رونق تھی۔ ایک ناچنے والی ناچنے اُٹھی تو اُس کے حامیوں اور مخالفوں میں تکرار ہونے لگی۔ پہلے تکرار ہوئی۔ پھر ہاتھا پائی۔ گتھم گتھا شروع ہوا اور آخر آخر لاٹھی چلنے لگی۔ بندوق پستول کا زمانہ نہیں تھا لاٹھی ہی مرد کا زیور سمجھی جاتی تھی۔ یوسف میاں بیچ بچاؤ کے لیے دوڑے۔ تجربہ کار لٹھیت ہمیشہ حریف کی ٹانگوں پر وار کرتے ہیں تاکہ وہ گر جائے اور جوابی حملہ نہ کر سکے۔ سر پر وار نہیں کرتے کیونکہ اگر لاٹھی کا وار سر پر پڑ جائے تو جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ایک پھر تیلے ناتجربہ کار نوجوان نے بے سوچے سمجھے یوسف میاں کے سر پر لاٹھی کا بھرپور وار کیا۔ بیچارے صلح صفائی کرا رہے تھے، لاٹھی پڑتے ہی تیورا کر گرے۔ لوگ دوڑے تو دیکھا کہ سسک رہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں ختم ہو گئے۔ اتفاق سے فتح گڑھ کے داروغہ جی بھی جلسے میں تھے۔ دو تین سپاہی بھی تھے۔ سپاہیوں نے دوڑ کر اُس نوجوان کو پکڑ لیا۔ منجھلے میاں کو خبر ہوئی۔ کیا کر سکتے تھے۔ مقدمہ چلا اُس نوجوان کو عمر قید ہو گئی۔ لاٹھی مارنے والے کے ساتھ ساتھ امدی کو بھی جیسے عمر قید ہو گئی۔ بُرے تھے بھلے تھے، تھے تو سر دھرے۔ امدی کی آنکھ میں آنسو کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ رنڈاپے کا سفید دوپٹہ اوڑھ لیا۔ ہنسنا بولنا، کہانیاں سنانا سب موقوف۔ چپ لگ گئی۔ کہتی تھیں "میرے دل کو پہلے سے خبر ہو گئی تھی، کھانا جو کڑوا ہو گیا تھا۔

سکینہ کبھی کبھی آتی تھی۔ وہ بھی خیر سے بال بچوں والی ہو گئی تھی۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ اُنہیں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ امدی کا سب سے زیادہ خیال سنجھلی نے کیا۔ خیال منجھلی بھی کرتی تھیں۔ اپنے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں۔ کپڑے لتّے کا بھی خیال رکھتیں۔ احسن کی دلہن ان کی دن رات خدمت کرتیں مگر سنجھلی کی بات کچھ اور تھی۔ وہ خود زخم کھائے بیٹھی تھیں۔

کلیجے پر میاں اور بچوں کا داغ تھا۔ بیٹا ایک ہی تھا۔ لائق فائق، پڑھ لکھ گیا تو منجھلے نے اُسے اپنے کام میں لگانا چاہا۔ اُس نے کہا "میں تو نوکری کروں گا۔ کسی کا دست نگر نہیں بنوں گا۔" کچہری میں نوکر ہو گیا۔ ایک دن کچہری جا رہا تھا راستے میں ٹھوکر لگی۔ گر پڑا اور ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا "دل بند ہو گیا ہے۔" فتح گڑھ والوں نے پہلی دفعہ یہ جملہ سنا۔ سنجھلی کے میاں جو منجھلے میاں سے چھوٹے تھے، میاں کہلاتے تھے۔ بھائی کے لاڈلے تھے۔ منجھلے میاں نے اندور میں خیموں ڈیروں کا کارخانہ کھولا تو انہیں منتظم بنا کر وہاں بھیجا۔ میاں وہاں بارہ برس رہے۔ شروع شروع میں کارخانے کی اچھی دیکھ بھال کرتے۔ پھر ایک مرہٹن گھر میں ڈال لی۔ اندر مرہٹن کا راج۔ مرہٹے چوتھ وصول کرتے رہتے مرہٹی گھر گھس تھی۔ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ وہ تو اندور میں سب سے دور رہے۔ سنجھلی بیاہی تیاہی ہونے کے باوجود رانڈوں کی سی زندگی گزارتی رہیں۔ وہ خاندان کی سب سے خوب صورت اور سلیقہ مند بی بی تھیں مگر بدنصیب تھیں۔ آخر کار وہی ہوا جو ہونا تھا۔ منجھلے میاں اندور گئے۔ مرہٹن کو گھر سے نکالا۔ کارخانہ بند ہو گیا۔ میاں کو ساتھ لے آئے۔ واپس آنے کے کچھ ہی دن بعد میاں کا انتقال ہو گیا۔ سنجھلی کی بدنصیبی پر ٹھپا لگ گیا۔ ایک یتیم نواسی اور منجھلی کے سہارے زندگی بسر کر رہی تھیں۔ وہ امدی کا درد خوب سمجھتی تھیں۔ دونوں چپکی بیٹھی ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہتی تھیں۔ احسن میاں کے بچوں سے دل بہلاتی رہتی تھیں۔

منجھلے میاں کا اقبال بھی گہنا گیا۔ اندور کا کارخانہ ختم ہوا۔ کانپور کا کارخانہ بند ہوا۔ فتح گڑھ کے کارخانے کا کام ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کے مال کی خریدار ریاستیں تھیں۔ کابل کے امیر عبدالرحمن خان تھے۔ ریاستوں نے ادائیگی میں ڈھیل دینا شروع کر دی۔ کام بن کر جا رہا ہے۔ پیسہ نہیں آ رہا ہے۔ بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ قرض بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے قرض کی ادائیگی میں کوٹھی بکی۔ برابر میں حکیم جی والا مکان تھا، بہت بڑا اور شان دار۔ وہاں چلے گئے۔ وہ بھی قرق ہو گیا۔ آخر آخر میں بڑی حویلی کو مسکن بنایا۔ بڑی حویلی بڑی لق و دق حویلی تھی۔ مکانیت بہت تھی۔ مردانے اور زنانے دونوں میں بڑے بڑے صحن تھے۔

کوٹھی چھوڑنے کے بعد منجھلے میاں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ حکیم جی والے مکان میں رہے۔ لوگ اُن سے ملنے آتے رہتے تھے۔ وہ خود کہیں نہیں جاتے تھے۔ بڑی حویلی میں انہوں

نے اپنے سارے نوادر باہر کے بڑے کمرے میں سجوا دیے تھے۔ صبح ناشتہ کر کے باہر آتے۔ کمرے کا تالہ کھولتے۔ خود جھاڑ پونچھ کرتے اور پھر برآمدے میں کمرے کے دروازے کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر اس سرمائے کو دیکھتے رہتے تھے۔ کیا کیا عجائب چیزیں تھیں۔ لکڑی کے بڑے چبوترے پر کسی ہوئی دودھیا پتھر کی ایک مسجد تھی۔ گنبد اور میناروں سے آسمانی نور جھلکتا تھا۔ اندر دو ایک نمازی نماز پڑھتے ہوئے، ان کی جوتیاں مسجد کے صحن کے قریب، وضو کا حوض سنگ تراش نے بڑے کمال سے بنایا تھا۔ رنگ سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ پانی موجیں مار رہا ہے۔ ایک چاندی کا ہاتھی تھا۔ بیسیوں چیزیں تھیں۔ ساری زندگی کا ذخیرہ تھا جو آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ کمرے کے دروازے میں تالا ڈال کر منجھلے میاں مولوی صاحب سے کچھ دیر اخبار سنتے پھر اندر چلے جاتے۔

یہ کاروبار جاری تھے کہ بڑی حویلی میں بڑی ماں کی کہانیوں کا زور بہت بڑھ گیا۔ شام ہوئی کھانا وانا ہو چکا۔ گرمی کے دن ہیں۔ صحن میں سب کے پلنگ بچھے ہوئے ہیں۔ کیوڑے کی خوشبو سے مہکتی ہوئی آگرے کی تنگی صراحیاں قرینے سے رکھی ہیں۔ منجھلی کے دالان میں دو لیمپ جل رہے ہیں۔ آنگن کے دونوں طرف دو لالٹین روشنی دے رہی ہیں۔ احسن میاں کے دالان میں بھی لیمپ روشن ہے۔ وہ لیٹے ہوئے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ بچے اپنے اپنے بستروں پر مچل رہے ہیں۔ ”بڑی ماں۔ کہانی۔ بڑی ماں کہانی“ بڑی ماں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ شور بڑھا تو انہوں نے کہا ”آج نہیں۔ کل۔“ شور ہوا ”کل کی کل دیکھی جائے گی۔“ احسن کی دلہن نے ڈانٹا، ”دُند نہ مچاؤ۔ کل سُن لینا۔“ بچوں نے کہا، ”کل نہیں آج۔“ آخر بڑی ماں نے کہانی شروع کی۔ شرط یہ ہوئی کہ کوئی بچہ بیچ میں نہیں بولے گا۔ صرف ہنکارا بھرے گا۔ فیصلہ شہزادہ جان عالم کی کہانی پر ہوا۔ بڑی ماں کی کہانیوں میں درجہ بندی تھی۔ چھوٹے بچوں کے لیے جانوروں اور شیخ چلّی کی کہانیاں تھیں۔ بڑے بچوں کے لیے پہلے نمبر پر کتابی کہانیاں تھیں۔ الف لیلہ کی کہانیاں، علی بابا چالیس چور، چراغ الہ دین، لوٹے والے جن کی کہانی، سندباد جہازی، باغ و بہار کی، کتّوں والے سوداگر کی کہانی۔ اس کے بعد وہ کہانیاں تھیں جو بڑی ماں نے بڑی بوڑھیوں سے سُن کر یاد کی تھیں۔ سنگل دیپ کی پدمنی کی، تم چلو میں آتا ہوں، لال سبز کبوتروں کی کہانی، صبر باد شہزادی کی کہانی، غلام بار

جنگلی کی کہانی۔

کہانی شروع ہوگئی۔ "ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔" خدا اگر سب کا بادشاہ ہے تو صرف ہمارا تمہارا کیوں ہے۔" ایک طرف سے آواز آئی۔ بڑی ماں بد کیں، "اسی لیے تو ہم کہانی سناتے ہیں۔ غلطی ہوگئی۔ معاف کرو۔ تو بھائی اُس بادشاہ کا ایک شہزادہ تھا۔ نام تھا جان عالم۔" "کیا وہ دنیا کی جان تھا؟" ایک بچے نے بولنے والے کو ڈانٹا۔ "چپ ہو جاؤ۔ ورنہ بڑی ماں کہانی نہیں سنائیں گی۔"

تو بھیا۔ ایک دن شہزادہ جان عالم شہر کی سیر کو نکلا۔ بازار سے گزرا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک چڑی مار ہاتھ میں پنجرا لیے کھڑا ہے۔ پنجرے میں ایک طوطا ہے جو آدمیوں کی طرح باتیں کر رہا ہے۔" "کیا سچ مچ طوطا آدمیوں کی طرح باتیں کر سکتا ہے۔" "پھر بولے۔" "اچھا اب نہیں بولوں گا۔" "جان عالم نے طوطا فوراً خرید لیا۔ محل میں لے آیا۔ دن رات اُس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ ایک دن طوطے نے بتایا کہ فلاں شہر میں رات کو روشنی نہیں ہوتی۔" "مٹی کا تیل نہیں ملتا ہوگا۔" بڑی ماں نے سُنی ان سنی کردی۔ "طوطے نے کہا۔ وہاں کی جو شہزادی ہے انجمن آرا وہ رات ہونے سے پہلے محل کی چھت پر آجاتی ہے۔ اُس کے چہرے کی روشنی سے سارا شہر جگ مگ جگ مگ کرتا ہے۔" "شہزادی نہ ہوئی ہنڈا ہوگئی۔" بڑی ماں اپنی رو میں کہتی رہیں۔ "میں تو اسی شہزادی سے بیاہ کروں گا۔ چلو چلتے ہیں۔ طوطے میاں تم راستہ دکھاؤ۔ بس جان عالم نے فوج فاٹا لاؤ لشکر ساتھ لیا اور چل دیا شہزادی انجمن آرا کی تلاش میں۔ چلتا رہا چلتا رہا۔ ایک پیر مرد سے ملاقات ہوئی۔" "پیر مرد کیا ہوتا ہے۔" "چپکے سنو پیر مرد بوڑھے آدمی کو بزرگ کو کہتے ہیں۔" پیر مرد نے پوچھا۔ اے شخص۔ (بڑی ماں شخص کو شَخص کہتی تھیں) تو کہاں جا رہا ہے؟ جان عالم نے کہا۔ میں شہزادی انجمن آرا کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ پیر مرد نے کہا۔ کیوں اپنی اوقات ضائع کرتا ہے۔ مگر جب جان عالم اُس کے پیروں پر گر پڑا تو اس نے کہا۔ اچھا جا۔ پورب کی طرف چلا جا اور اگر کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے یاد کرلینا۔"

جان عالم پورب کی طرف چل دیا۔ جنگل بیابان۔ فقط اُس کی فوج اور خدا کی ذات۔ چلتے چلتے رات کے وقت ایک شہر میں پہنچا۔ شہر پناہ کا پھاٹک پھاٹوں پھاٹ کھلا تھا۔ جان عالم اور اس

کی فوج دراتی اندر چلی گئی۔ دیکھا تو ہر آدمی کالے کپڑے پہنے ہوئے۔ رات کے اندھیرے میں کالے کپڑے بڑے بھیانک معلوم ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بھتنے چل پھر رہے ہوں۔ جان عالم نے ایک آدمی سے پوچھا۔ "بھائی کالے کپڑے کیوں پہنے ہو۔ یہ کون سا شہر ہے؟" اُس آدمی نے کہا۔ "ہمارے شہزادی انجمن آرا اور اُس کے محل پر ایک دیو نے قبضہ کرلیا ہے۔ محل کی طرف پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ شہر والوں نے محل کی تباہی پر کالے کپڑے پہن لیے ہیں۔ سارا کاروبار بند ہے۔ چوپٹ ہو گیا ہے۔"

جان عالم محل کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچا تو ایک دیو کالا بھجنگ۔ نیلے ہاتھ پاؤں۔ تاڑ کا تاڑ۔ ننگ دھڑنگ۔ ایک طرف سے آواز آئی۔ "بڑی ماں کیا دیو واقعی ننگا تھا۔ بڑا بے شرم تھا۔" نہیں بھائی لنگوٹی باندھے ہوئے تھا۔ اُسے دیکھ کر جان عالم کو پیر مرد یاد آئے۔ یاد کیا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ پیر مرد سامنے کھڑے کہہ رہے ہیں۔ "بیٹا جان عالم۔ تین دفعہ اِنّا اعطینا کی سورت پڑھ کر تلوار پر دم کرو اور دیو پر وار کرو۔" پیر مرد تو یہ کہہ کر غائب ہو گئے۔ جان عالم نے تین دفعہ انا اعطینا کی سورت پڑھ کر ماری جو تلوار۔ اس فقرے میں باجی آپا کا سارا جسم تن گیا۔ آواز اونچی ہو گئی۔ زور زور سے سانس لینے لگیں۔ سارا زور "ماری" پر تھا۔ کہاں تو دیو کے نتھنوں سے سانس کے ساتھ چنگاریاں جھڑ رہی تھیں۔ کہاں چار ٹکڑے ہو کر گر گیا۔ بڑے زور کی آندھی آئی۔ غبار چھا گیا۔ جب غبار چھٹ گیا تو نہ دیو تھا نہ اُس کا کوئی نشان۔ جان عالم نے شہزادی انجمن آرا کو قید سے نکالا۔ شہزادی باہر نکلی تو سارے شہر میں روشنی ہو گئی۔ اُلٹے نقارے سیدھے ہو گئے۔ شہر والے خوشی کے مارے ناچنے لگے۔"

بڑی ماں یہاں تک پہنچیں تو ایک آدھ کے سوا سارے بچے سو چکے تھے۔ جاڑوں میں کہانی احسن میاں کے کمرے میں ہوتی تھی۔ بہت بڑا کمرہ تھا۔ آگے دالان۔ کمرے میں قاعدے سے پلنگ بچھے ہوئے۔ بچے بڑے سب لیٹے تھے اور بڑی ماں کی کہانی جاری۔

بیاہی تیاہی عورتوں کے لیے بڑی ماں کی کہانیاں قدرے مختلف تھیں۔ حکیم محمد علی طبیب کی جعفر عباسہ۔ اختر النساء۔ شوکت آرا۔ ساری کہانیاں جو انہوں نے پڑھوا کر سنی تھیں اور اپنے انداز میں ڈھال لی تھیں۔ جعفر عباسہ کی کہانی میں جب ہارون کا غلام سرور ہارون کے حکم

سے جعفر کو قتل کرنے جاتا تو بڑی ماں کی آنکھوں سے جاری ہو جاتے۔ سُننے والیوں پر بھی رقت طاری ہو جاتی اور سب ہارون کو برا بھلا کہنے لگتیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بڑی ماں نے بڑی بڑی کتابیں سُن کر اپنے ڈھب کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں کیسے تیار کر لی تھیں۔

بڑی ماں کی کہانیوں میں بعض دفعہ ایسی باتیں آجاتی تھیں جنھیں بچے سمجھ نہیں پاتے تھے۔ کہانی جاری ہے۔ بڑی ماں نے پینترا بدلا، "ہاں تو سُن رہے ہو۔" بچوں نے ہنکارا بھرا۔ "سن رہے ہیں۔" "تو بھائی یہ ہماری تمہاری دنیا یہ ہے۔ یہ بھی ایک کہانی ہے۔ اور ہم سب بھی اپنی اپنی کہانیاں بناتے رہتے ہیں۔ کل ہماری طلبی ہو گی۔ ساری کہانیاں سُنی جائیں گی۔ جن کی کہانیاں اچھی ہوں گی ان کے لیے جنت کا پھاٹک کھول دیا جائے گا۔ وہ مزے کریں گے۔ جن کی کہانیاں اچھی نہیں ہوں گی وہ دوزخ میں ڈھکیل دیے جائیں گے۔ بڑی مار پڑے گی۔" "بڑی ماں کہانیاں اچھی کیسے ہوتی ہیں؟" "اچھے کاموں سے۔ پڑھو لکھو۔ نام پیدا کرو۔ ماں باپ کی خدمت کرو۔ بڑوں کی عزت کرو۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ۔ محنت کرو۔ حلال رزق حاصل کرو۔" "بڑی ماں! وہ کیا ہوتا ہے؟" ایک چھوٹے بچے نے پوچھا۔ "جو کچھ کھاؤ وہ حلال کی کمائی کا ہو۔" "کیوں بڑی ماں۔ وہ جو سامنے پیشکار صاحب رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ رشوت لیتے ہیں۔ اُن کے گھر کا پانی بھی نہیں پینا چاہیے۔ تو بڑی ماں اُن کی کہانی تو خراب ہو گی۔" "ہاں بیٹا۔ اُن کی کمائی حرام کی ہے اور بھائی نیکی کرو۔ سیدھے راستے پر چلو۔" ایک بچے نے ٹوکا، "بڑی ماں! یہ کون سی کہانی سُنا رہی ہو۔ یہ بھی کوئی کہانی ہے۔" مگر بڑی ماں کہانیوں میں ایسے ٹکڑے ضرور جوڑتی رہتی تھیں اُن کی کہانیوں کی دھوم سارے گھر میں تھی۔ کبھی کبھی دوسرے گھروں کے بچے کہانی سننے کے لیے احسن میاں کے یہاں مہمان بھی آتے تھے۔ عورتیں بھی آتی تھیں۔ بڑی رونق رہتی تھی۔

یہ سلسلے جاری تھے کہ ایک صبح سکینہ کا دیور فرخ آباد سے دوڑا ہوا آیا۔ کہنے لگا، "بھائی صاحب کل صبح سے غائب ہیں۔ صبح کو اچھے بھلے گھر سے نکلے تھے۔ شام کو لوٹ کر نہیں آئے۔ اس وقت تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ ہم نے ان کے سارے ٹھکانے دیکھ ڈالے۔ کوئی پتہ نہیں چلتا۔" یہ سُن کر بڑی ماں پر جیسے بجلی گر پڑی۔ احسن کی دلہن کو ساتھ لے کر فوراً فرخ آباد دوڑیں۔ وہاں پہنچ کر یہی معلوم ہوا کہ روز کی طرح صبح گھر سے نکلے تھے مگر روز کی طرح شام کو لوٹے نہیں۔

سارے عزیز پیارے ڈھونڈ رہے ہیں۔ کوتوالی میں بھی رپٹ لکھوا دی ہے۔ اُن کے پیر صاحب سے پوچھا تو وہ بڑے خفا ہوئے، ”کہنے لگے میں اپنے ہر مرید کے آنے جانے کا حساب نہیں رکھتا۔“ ڈھونڈنے والوں نے ہر جگہ ڈھونڈا۔ قنوج، تروا، چھپرا موٗ، گنگا پار راجے پور اور اندر گڑھ، قائم گنج، شمس آباد سب جگہ دریافت کر لیا کچھ پتہ نہیں چلا۔

سکینہ کے گھر میں ٹپس پڑ گئی مگر ان کے سسرال والے بڑی محبت اور قاعدے قرینے والے تھے۔ سکینہ اور اُن کے بچوں کو پھول کی طرح رکھا۔ کسی بات میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ کمی تو بڑی ماں کی زندگی میں آگئی۔ ایک زخم اور لگ گیا۔

تین چار برس اسی گومگو میں گزر گئے۔ بڑی حویلی پر اداسی چھائی رہی۔ منجھلے میاں خاموش زندگی گزارتے رہے۔ امدی بیچاری پھڑپھڑاتی رہیں۔ ہُڑک اٹھتی تو اکّہ منگا کر فرخ آباد چلی جاتیں۔ اب وہ اپنے کمرے میں بہت کم جاتی تھیں۔ گرمیاں ہوتیں تو رات کو آنگن میں سوتیں۔ جاڑے ہوتے تو احسن میاں کے کمرے میں منڈلاتی رہتیں۔ احسن کی دلہن اُن کے لیے الگ پلنگ بچھواتیں۔ بستر لگواتیں۔ لحاف رکھتیں مگر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر چپکے سے کہتیں، ”اے بیٹی دلہن۔ میں یہیں اسلم اور بھلّو کے پینیتانے پڑ رہوں گی۔ ان کا لحاف خوب بڑا ہے۔ سردی نہیں لگے گی۔“ اسلم فوراً بگڑ کر کہتے۔ ”ساری رات لحاف اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں۔ لپیٹ لیتی ہیں۔ ہمیں سردی لگتی ہے۔ ایسے زور زور سے خراٹے لیتی ہیں کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔“ ماں ڈانٹتیں۔ ”چپ ہو جاؤ۔ بڑوں سے اس طرح بات نہیں کرتے۔“ اصل میں بڑی ماں ڈرتی بہت تھیں۔

صبح جب بڑی ماں ناشتہ کر لیتیں۔ رات کے سالن سے پراٹھا کھا لیتیں۔ انڈا انہیں پسند نہیں تھا۔ ”یہ دو آنے کے بارہ والے انڈے۔ ہمیں اچھے نہیں لگتے۔ بساند ہوتی ہے۔ انڈے تو ہمارے فرخ آباد میں ہوتے تھے۔ یہ بڑے بڑے۔“ کوئی بچہ لقمہ دیتا۔ ”بطخ کے ہوتے ہوں گے۔“ ناشتے سے فارغ ہو کر تمباکو کھاتیں۔ پھر کہتیں۔ رات کو اسلم نے ایسی لاتیں ماریں کہ سارا بدن ہل گیا۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔“ اسلم نے چڑ کر کہا، ”ہم نے لاتیں ماریں۔ یہ نہیں کہتیں کہ سارا لحاف اپنی طرف کھینچ لیا۔“ بڑی ماں سُنی ان سنی کر کے منجھلی کی طرف چلی جاتیں۔

اچانک فرخ آباد سے خبر آگئی کہ سکینہ کے میاں گھر لوٹ آئے۔ بڑی ماں فوراً فرخ آباد

پہنچیں۔ واقعی سجان آ گئے تھے۔ سامنے بیٹھے تھے۔ چپ چاپ۔ معلوم ہوا کہ صبح فجر کے وقت کسی نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ گھر والے آنکھیں ملتے جاگے۔ دروازہ کھلا تو اللہ کی شان نظر آئی۔ بے سان و گمان۔ میاں سجان۔ حق حیران۔ پریشان پریشان کھڑے تھے۔ بڑی مشکل سے پہچان میں آئے۔ حال سے بے حال۔ چیتھڑے لگے۔ سر جھاڑ منھ پہاڑ۔ بال وحشیوں کی طرح بڑھے ہوئے۔ ناخن جیسے پھاوڑے کے پھل۔ پیروں پر بڑے بڑے چھالے۔ بدن پر میل کی تہیں جمی۔ اندر لائے گئے۔ آنکھیں ڈگر ڈگر منھ ستا ہوا۔ بٹھایا۔ سب اُن کے گرد بیٹھ گئے۔ بات کرنا چاہی تو وہ اللہ کا بندہ بالکل چپ نہ ہاں نہ ناں۔ حجام بلایا گیا۔ بال کٹے۔ دونوں بیٹوں نے مل مل کر نہلایا۔ جھانویں سے بدن رگڑ رگڑ کر میل کی تہیں صاف کیں۔ اُجلے کپڑے پہنوائے۔ سب کچھ ہوا مگر وہ منھ میں گھنگیاں دیے بیٹھے رہے ناشتے کا وقت ہوا ناشتہ کیا۔ سو رہے۔ کھانا کھایا الٹا غفیل ہو گئے۔ نجانے کس بلا کی بھوک تھی۔ جو سامنے آیا، مر بھکوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ چٹ کر گئے اور سو گئے۔ کچھ پوچھو تو کوئی جواب نہیں۔ بڑی مشکل سے قبولے کہ پیر صاحب نے حکم دیا تھا۔ "صفائے باطن کے لیے جنگل بیابانوں میں سفر کرنا ضروری ہے۔" اُن کے ایک رشتے دار نے جو بڑا ہنسوڑ تھا۔ ہنس کر کہا۔ "بھائی صاحب صفائے باطن کے لیے صفائے ظاہر بھی ضروری ہے۔" بات آئی گئی ہو گئی۔

بڑی ماں کو قدرے سکون ملا مگر بدنصیبی نے اُن کا گھر دیکھ لیا تھا۔ ایک دن ساری بڑی حویلی میں اُن کے چیخنے چلانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ "مار ڈالوں گی قطامہ کو۔ کمینی کہیں کی۔ آئی بڑی ساہوکار بن کر۔ اتنی جوتیاں ماروں گی کہ چاند گنجی ہو جائے گی۔ دور۔ دفان۔" سب دوڑے۔ امدی کو دیکھا تو سارا بدن اکڑا ہوا۔ ماتھے پر پسینہ، منھ لال۔ کسی نے پنکھا جھلا۔ کسی نے ٹھنڈا پانی پلایا۔ بڑی دیر کے امدی بولیں۔ "وہ تھی کالی مائی کہہ رہی تھی۔ مایا لے لو۔ بچہ دے دو۔" لوکانہ لگاؤں اُس کے منھ میں۔ لو بھلا میں اپنا بچّہ دے دوں گی۔" کسی نے کہا، "بڑی ماں تمہارا تو کوئی بچہ ہے ہی نہیں۔" چمک کر بولیں۔ "ہے کیوں نہیں۔ ماشاء اللہ۔ اللہ رکھے۔ دو نواسے ہیں۔ اُس کمینی کو بھینٹ لینے کے لیے اور کوئی نہیں جڑا۔ میرے ہی بچے رہ گئے ہیں۔"

اُس وقت تو یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مگر ہفتے پندرہ دن کے بعد اس کی گونج پھر سنائی

دیتی۔ بڑی ماں کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بڑی حویلی میں چار دیگیں ہیں۔ چاروں میں اشرفیاں ہیں۔ اُن کا بس چلتا تو بڑی حویلی کو کھدوا کر اشرفیاں نکلوا لیتیں۔

منجھلے میاں بھی یہ چیخ پکار سنتے رہتے تھے۔ اُن کی مالی حالت بالکل کمزور ہو گئی تھی۔ گزارا مشکل ہو گیا تھا۔ خیال آیا کہ اگر اشرفیاں مل جائیں تو سارے دلدر دور ہو جائیں۔ یہ سوچ کر انہوں نے فتح گڑھ کے سیانوں کو بلوایا۔

سیانوں نے سارے دن محنت کی۔ بڑی حویلی کا چپہ چپہ چھان مارا۔ جگہ جگہ کی مٹی سونگھی۔ کہیں کہیں زمین کھود کر دیکھا۔ شام کو سب نے ہاتھ باندھ کر کہا، "منجھلے میاں۔ دیگیں تو آوش ہیں۔ پرنتو ہر ایک کے منہ ناگ مہاراج براج رہے ہیں۔ انہیں جگہ سے ہٹانا کسی مہاپُرش کا کام ہے۔" سیانے اپنا محنتانہ لے کر رخصت ہو گئے۔

فتح گڑھ میں چار بزرگ تھے۔ چھدامی شاہ، بُردبار، متین، عبادت گزار، پرہیز گار۔ شہر بھر ان کا کلمہ پڑھتا تھا۔ نیک، متقی اور اللہ کی محبت سے سرشار تھے۔ دوسرے بزرگ شتو شاہ تھے۔ ان کا نام شمس الحق تھا۔ سرکاری ملازم تھے۔ ڈاکیے تھے۔ شہر میں دن میں دو دفعہ ڈاک بانٹتے تھے۔ ان پر جذب طاری رہتا تھا۔ بڑے دیانت دار انسان تھے۔ بسنت کے موقعے پر گاگروں کا جلوس انہیں کی سرکردگی میں نکلتا تھا۔ آگے آگے قوال حضرت امیر خسرو کے بسنتی اشعار گاتے ہوئے جو انہوں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کی خوشنودی کے لیے لکھی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے شتو شاہ، گیسو کندھوں پر لہراتے ہوئے۔ بسنتی کُرتا۔ بسنتی مہربند۔ سر پر ہلکی اینڈوی۔ اُس پر بسنتی رنگ کی گاگر۔ بڑی احتیاط سے قدم اُٹھائے آگے بڑھتے تھے۔ ان کے بعد بہت سے لوگ گاگریں سر پر رکھے۔ بسنتی جوڑے پہنے۔ ہاتھوں میں سرسوں کے پھول لیے رواں دواں۔ بڑا دلکش منظر ہوتا تھا۔ مقبول شاہ گُن متھن بزرگ تھے۔ اپنے آپ میں گم۔ بات کم کرتے تھے۔ اپنے خیالوں میں ڈوبے رہتے تھے۔ چوتھے درویش جمیل شاہ تھے۔ یہ بڑے لپاڑیے تھے۔ ان کی روداد سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اُس زمانے میں حج میں پانچ سو روپے خرچ ہوتے تھے اور تین چار مہینے لگتے تھے۔ متوسط طبقے کے لوگ دانہ دانہ جمع کرتے جب پانچ سو کی رقم ہو جاتی تو حج کے لیے روانہ ہو جاتے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو گھر سے نکلے۔ مانگتے کھاتے۔

کہیں بے ٹکٹ ریل میں۔ کہیں پیدل۔ کسی نہ کسی طرح بمبئی پہنچ کر صابو صدیق کے مسافر خانے میں پڑ جاتے۔ کوئی دریادل مسلمان سیٹھ یا کوئی مخیر آدمی انہیں جہاز کا ٹکٹ دلوا دیتا۔ جدے پہنچ جاتے۔ وہاں معلموں کی بحث و تکرار۔ بدوؤں کی یلغار۔ ہر طرف اونٹوں کی قطار دیکھ کر بے قرار ہو جاتے۔ کسی نہ کسی طرح مکے پہنچ جاتے۔ اللہ کا گھر۔ سب کا گھر۔ حج کرتے۔ عمرے کرتے۔ پھر کسی قافلے کے ساتھ پیدل نکل کھڑے ہوتے۔ قافلہ آگے بڑھ جاتا تو امیر مینائی کی نعت کا مشہور شعر پڑھتے ہوئے۔

قافلے والے چلے جاتے ہیں آگے آگے
مدد اے شوق کہ پیچھے میں رہا جاتا ہوں

دوڑنے لگتے اور پھر۔

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا قافلہ دل کا

اُس بار گاہ اعلیٰ و اقدس میں پہنچ جاتے جو سب بار گاہوں کی بار گاہ ہے۔ جو سب کا ملجا و ماویٰ ہے۔ جہاں کوئی محروم نہیں رہتا۔ کوئی مغموم نہیں رہتا۔ مزے سے زندگی گزارتے اور پھر جس طرح گئے تھے اُسی طرح واپس آجاتے۔ اس سفر یں سات آٹھ مہینے صرف ہوتے۔

جمیل شاہ ایک سال فتح گڑھ سے بہت دن غائب رہے۔ لوٹے تو کچھ زمزمیاں۔ کچھ سُرمے کی شیشیاں۔ کچھ تسبیحیں۔ کچھ کھجوریں ساتھ تھیں جو اہل شہر میں تقسیم ہو گئیں۔ انہوں نے خود اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ محفلوں میں حج کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ شومیِ قسمت کہ شہر کے ایک معتبر آدمی نذیر حسن جو معتبر تر باپ لطیف حسن ریٹائرڈ تحصیل دار کے بیٹے اور خوش باش تھے۔ شکاری تھے۔ سیاح تھے وہ ایک لمبے سفر کے بعد فتح گڑھ لوٹے۔ ایک محفل میں انہوں نے جمیل شاہ کو حج کی مبارکباد وصول کرتے دیکھا۔ لوگ ان کے ہاتھ پیر بھی چوم رہے تھے۔ نذیر حسن سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے سر محفل جمیل شاہ کو ٹوکا۔ کہا "تم حاجی کیسے ہو گئے۔ بقر عید کے دن تو تم مجھے تلہر میں ملے تھے۔" جمیل شاہ نے کہا، "وہ پچھلے سے پچھلے سال کی بات ہے۔" بڑی بحث ہوئی۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ جمیل شاہ کو "حاجی بمبا" تسلیم کر لیا جائے۔ منجھلے میاں نے

اُنہیں نہیں بلوایا۔

جب چھدامی شاہ، تنو شاہ اور مقبول شاہ آگئے تو منجھلے میاں نے مسئلہ اُن کے سامنے پیش کیا اور مدد چاہی۔ چھدامی شاہ مراقبے میں چلے گئے۔ تنو شاہ بھی مراقب ہوگئے۔ مقبول شاہ تو رہتے ہی مراقبے میں تھے۔

بڑی دیر کے بعد چھوامی شاہ نے سر اوپر اُٹھایا۔ بڑے ادب اور ملایمیت سے کہا۔ "منجھلے چچا! (اُن کے باپ منجھلے میاں کے دوست تھے) اس خیال کو چھوڑ دیجیے۔ یہ نیرنگ نظر اور ذہن کا خلفشار ہے۔ پھر انہوں نے اور زیادہ نرمی سے کہا۔ کیا آپ اس ضعیفی میں رزق حرام سے اپنے وجود کو آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ تنو شاہ نے بھی اُن کی تائید کی اور مقبول شاہ تو تھے چپ شاہ۔ بالکل خاموش رہے۔ منجھلے میاں نے خیال چھوڑ دیا۔

منجھلے میاں نے تو خیال چھوڑ دیا مگر بڑی ماں کا دیگوں پر اعتقاد اور زیادہ راسخ ہوگیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ چار دیگیں ہیں اور ان میں پندرہ ہزار چھ سو اشرفیاں ہیں۔

انہوں نے چپکے چپکے اپنے داماد کو بلوایا اور کہا۔ "اے میاں! ذرا اپنے پیر صاحب سے تو کوئی عمل پوچھو۔ میں خاموشی سے پڑھ کر اس چڑیل اور اس کے ناگوں کو بھسم کر دوں گی۔" دو تین دن کے بعد میاں سبحان نے کہا۔ "پیر صاحب قبلہ کا ارشاد ہے کہ حرام دولت حاصل کرنے کے لیے کوئی وظیفہ نہیں ہوتا۔" بڑی ماں اُن کے لحاظ میں خاموش رہیں بعد میں کہنے لگیں، یہ بھی پاگل۔ ان کے پیر صاحب بھی پاگل۔ جب کھن کھناتی اشرفیاں نکلیں گی تو سب کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

بڑی ماں نے اس پر بس نہیں کیا۔ فرخ آباد میں ایک بڑے بزرگ گزرے تھے، طالب حسین شاہ مجیب۔ بڑے عالم فاضل بھی تھے اور بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ اُن کے خلیفہ پھندن میاں بھی بہت بڑے بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ بڑی ماں ایک دن برقعہ اوڑھ نواسے کو ساتھ لیے اُن کے یہاں جا پہنچیں۔ اپنے کام کے لیے دعا کی درخواست کی۔ پھُندن میاں نے کہا۔ "بی بی توبہ کرو۔ اللہ سے لو لگاؤ۔ حرام کاموں کے لیے وظیفے اور دعائیں نہیں ہوتیں۔" بڑی ماں چپ چاپ چلی آئیں۔

فتح گڑھ سے پانچ چھ میل دور شیخ محمد براق کا آستانہ تھا۔ شیخ محمد براق بڑے پرانے بزرگ تھے۔ بڑا شان دار عرس ہوتا تھا۔ بڑا بھاری میلہ لگتا تھا۔ بڑی ماں وہاں بھی پہنچیں۔ چادر چڑھائی۔ نذر پیش کی۔ سجادے صاحب نے ساری بات سن کر کہا، ''حرام اور ناجائز کاموں کے لیے کوئی وظیفہ یا دعا نہیں ہوتی۔ مایا جال میں نہ پھنسو۔ اللہ کا نام لو۔'' مگر بڑی ماں نے ہار نہیں مانی۔

اب بڑی ماں کے دو ہی کام تھے۔ ہر کسی سے عمل پوچھنا اور پندرہ ہزار چھ سو کا حساب جوڑنا۔ ہفتے دس دن میں کالی مائی کو کوسنا پیٹنا بھی ہو جاتا تھا لیکن اب گھر والوں کی دل چسپی کم ہونے لگی تھی۔

ایک دن بڑی ماں من کی موج میں بیٹھی تھیں۔ احسن میاں کے بڑے لڑکے اسلم نے اُن سے پوچھا۔ ''بڑی ماں! کیا سچ مچ اتنی دولت تمھیں مل جائے گی؟'' بڑی ماں نے کہا، ''لو اور سنو۔ انھیں یقین ہی نہیں آتا۔ ارے بیٹا۔ ملے گی اور ضرور ملے گی۔'' جہاں کوئی ڈھنگ کا وظیفہ ملا تو یہ کلموہی اور اس کے ناگ پانی ہو کر بہہ جائیں گے۔ ذرا دیکھے جاؤ۔'' اسلم نے پھر پوچھا، ''بڑی ماں! تم اتنی دولت کا کیا کرو گی؟'' بڑی ماں نے کہا، ''بیٹا ذرا بیٹھ جاؤ۔ تمھیں تو ہر وقت بھگ بھگی لگی رہتی تھی۔ رسیاں تڑاتے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں حساب بتاتی ہوں۔ تم اسکول میں پڑھتے ہو۔ سارا حساب لگا لو گے۔ مجھے تو یہ سب آتا نہیں۔ ہاں تو بھائی سب سے پہلے یہ جو جمعہ مسجد ہے۔ کوتوالی سے ذرا آگے۔ تو اس کے گنبد پر سونا چڑھوائیں گے۔ کل کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کا وضو کا حوض ٹوٹ پھوٹ گیا ہے تو نیا حوض بنوا دیں گے۔ اور بھائی، اللہ تمھیں خوش رکھے۔ ہمارے جو دو مکان ہیں۔ ارے وہی جن میں سے ایک میں ہم پہلے رہتے تھے اُنھیں تڑوا کر ایک خوبصورت مسجد بنوا دیں گے۔ اُس محلے میں کوئی مسجد نہیں ہے۔ نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایک مسجد فرخ آباد میں اپنے میکے میں بنوائیں گے۔ تم نے فرخ آباد میں مفتی صاحب کا مدرسہ دیکھا ہے۔ اے وہی جس کا بڑا سا پھاٹک ہے۔ تو اُس کی مرمت کروا دیں گے۔ اور بیٹا! پانچ ہزار اشرفیاں منجھلے کو دیں گے۔ ان کا وقت بگڑ گیا ہے۔ خدا کرے ان اشرفیوں سے ان کا کام پھر چل نکلے۔ جوڑتے جاؤ۔ ہاں سنجھلی، سکینہ اور اُس کے میاں کو لے کر حج کر آئیں گے۔ تمھاری ماں راضی ہوئیں تو اُن کو بھی لے جائیں گے۔ ایک ہزار اشرفیاں سکینہ کو ملیں گی۔ ایک ہزار اشرفیاں احسن کے لیے

ہیں اور پانچ سو اشرفیاں اپنے "کتوال" کے لیے رکھوں گے۔ احسن میاں کے منجھلے بیٹے اکرم جو تین چار برس کے تھے بڑی ماں کے بڑے لاڈلے تھے ہر وقت انہیں ٹینگے پر چڑھائے سارے گھر میں پھرتی تھیں۔ پیار سے انہیں میرا "کتوال" کہتی تھیں۔ جب اکرم اپنا لال کوٹ پہنتے تو بڑی ماں خوش ہو کر کہتیں، "دیکھو میرے کتوال کو اللہ نظر بد سے بچائے۔ چہرے پر کیسا رعاب ہے۔ بڑا ہو گا تو سارے شہر پر حکومت کرے گا۔" احسن کی دلہن فوراً لقمہ دیتیں۔ "نابابانا، نوج جو میرا بیٹا کتوال بنے۔ پولیس کی نوکری دو کوڑی کی۔ یہ ڈاکٹر بنے گا۔ انجینئر بنے گا۔ پروفیسر بنے گا۔" اسلم کسی قدر چڑ کر پوچھتے "اور بڑی ماں۔ ہمارے لیے خاک دھول۔ بکائن کے پھول۔" بڑی ماں جواب میں کہتیں، "گھبراتے کیوں ہو۔ تمہیں، سکینہ کے بچوں کو، تمہارے بھائی بہنوں کو، جمیلہ، ہاجرہ، زہرا، اصغری، منی، حسنا سب کو اُن کا حصہ ملے گا۔ تھوڑی اشرفیاں اپنے خرچ اور کفن دفن کے لیے رکھوں گے۔ کیا سمجھے۔ بھائی سب کا خیال کروں گی اور اپنے آخری وقت کے لیے کچھ رکھ لوں گی۔"

ایک صبح منجھلے میاں جاگے اور اُٹھنا چاہا تو اُٹھ نہ سکے۔ حکیم کو بلوایا گیا۔ پڑوس ہی میں تھے۔ ان کے باپ منجھلے میاں کے دوست تھے۔ حکیم امین الدین نے کوٹھی ہی میں پرورش پائی تھی۔ دوڑے ہوئے آئے۔ دیکھا بھالا۔ بولے، "ایک ہاتھ اور پیر پر فالج گرا ہے۔" منجھلے میاں یہ سن کر ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے۔ بولے، "والد مرحوم مولوی حسین بخش رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی مرض میں گئے تھے۔ فالج ہمارا خاندانی مرض ہے۔ میں بھی اسی مرض میں جاؤں گا۔"

بڑی حویلی میں کہرام مچ گیا۔ علاج ہونے لگا۔ منجھلی نے تیمار داری میں دن رات ایک کر دیے۔ بڑی ماں، سنجھلی اور احسن کی دلہن سب منجھلی اور منجھلے میاں دونوں کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ احسن میاں نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ زمین کا گز بن گئے۔ نجانے کس کس ڈاکٹر کو دکھایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ حکیم امین الدین ہی دوائیں پلاتے رہے۔

ایک دن حکیم امین الدین منجھلے میاں کو دیکھنے آئے۔ بڑی ماں تاک میں لگی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "اے بیٹا امین الدین! کوئی اچھا سا وظیفہ نہیں بتاتے۔ تم تو حکیم ہو۔ ساری حکمت چاٹے بیٹھے ہو۔" امین الدین نے فوراً کہا، "بڑی ماں! ہر نماز کے بعد "یانور" گیارہ دفعہ پڑھا کرو۔ کام

ہو جائے گا۔" وہ تو چلے گئے۔ بڑی ماں "یانور" کے وظیفے پر ڈٹ گئیں۔ حکیم جی نے ہر نماز کے بعد گیارہ دفعہ کہا تھا وہ دن رات یہی پڑھنے لگیں۔ ایک بی بی منجھلے میاں کو دیکھنے آئیں۔ انہوں نے بڑی ماں کو "یانور" کا وظیفہ پڑھتے ہوئے سنا تو ٹوکا۔ "اے بہن امدی۔ یانور کا وظیفہ تو نظر تیز کرنے کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ تم کیوں پڑھ رہی ہو۔ تمہاری آنکھیں کٹورا سی چمک رہی ہیں بالکل ٹھیک ہیں۔" اگلے دن حکیم جی آئے تو بڑی ماں نے ٹوکا، "اے بیٹا امین الدین مجھے یہ یانور کا وظیفہ کیوں بتا دیا۔ یہ تو نظر تیز کرنے کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ حکیم جی بات بنانے کے ماہر تھے۔ بولے، "ٹھیک ہی تو بتایا ہے۔ جب تمہاری نظر میں قوت پیدا ہو جائے گی اور تم اُس چنڈالنی کو دیکھو گی تو وہ اور اس کے سارے ناگ پانی بن کر بہہ جائیں گے۔" بڑی ماں مطمئن ہو گئیں۔ وظیفہ جاری رہا۔

ایک دن بڑی ماں احسن میاں سے اُلجھ پڑیں، "اے بیٹا احسن! تم تو بڑے پڑھے لکھے ہو۔ خاندان بھر میں سب سے عقل مند سمجھے جاتے ہو۔ منجھلے بھی تم سے رائے مشورہ کرتے تھے۔ تم کوئی وظیفہ کیوں نہیں بتاتے۔" احسن میاں بُردبار، متین اور روشن خیال آدمی تھے۔ انہوں نے کہا، "بڑی ماں! یہ سب جو تمہیں دکھائی دیتا ہے، دماغی بیماری ہے۔ پہلے میراق ہوتا ہے۔ مراق بڑھتا ہے تو خبط ہو جاتا ہے۔ خبط بڑھتا ہے تو آدمی..." بڑی ماں نے زور سے کہا، "ہاں ہاں کہو۔ کہتے کیوں نہیں۔ میں تمہیں پاگل دکھائی دیتی ہوں۔" اس کے بعد وہ احسن میاں سے کچھ کھنچ گئیں۔ بہت دن تک اینٹھی رہیں۔

منجھلے میاں کو علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک دن انہوں بڑی حسرت سے منجھلی سے کہا، "اللہ تعالیٰ نے ساری خواہشیں پوری کر دیں۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے۔ ایک خواہش رہ گئی۔ وہ شاید اس منحوس بیماری کی وجہ سے پوری نہ ہو سکے۔ کاش ایک بار باہر کے کمرے میں سجے ہوئے نوادر دیکھ لیتا۔ آنکھیں ٹھنڈی کر لیتا مگر اب یہ ممکن نہیں رہا۔"

منجھلی بڑی ہوشیار اور معاملہ فہم بی بی تھیں۔ اُن کے لیے شوہر کی ہر خواہش حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ انہوں نے فوراً اللا اور خدا بخش کو بلوایا۔ یہ دونوں بھائی منجھلے میاں کے پروردے تھے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے۔ کوٹھی میں پلے بڑھے۔ پھر جب جوان ہو گئے تو منجھلے میاں نے ان کا بیاہ شادی کر دیا۔ رہنے کے لیے گھر بنوا دیا۔ دونوں فوراً آ گئے۔ منجھلی نے اُنہیں بتایا کہ "تمہارے

ابا میاں کو باہر لے جانا ہے۔" للا اور خدا بخش دونوں بڑے تگڑے اور تندرست تھے۔ انہوں نے ایک مضبوط کرسی چھانٹی۔ مسہری سے ملا کر رکھی۔ بڑی آہستگی اور نرمی سے منجھلے میاں کو اُٹھا کر کرسی بٹھایا اور آہستہ آہستہ کرسی باہر لے گئے۔ کمرے کے دروازے کے آگے رکھ دی۔ تالہ کھول دیا گیا۔ منجھلے میاں نے اندر دیکھا۔ بھونچکے رہ گئے۔ بیشتر نوادر پر لگا کر اُڑ چکے تھے۔ اک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری اور اندر چلے آئے۔ اس کے بعد وہ کبھی کرسی پر باہر نہیں گئے۔ باہر گئے تو گہوارے میں لیٹے عزیز پیاروں اور دوستوں کے کندھوں پر سہار اپنے آخری ٹھکانے کو روانہ ہو گئے۔

بڑی حویلی میں سناٹا ہو گیا۔ فضا اور ماحول سوگ میں ڈوب گئے۔ "ہوتا ہے ہر مکان کو مکیں سے شرف اسد۔" مکان کا شرف جاتا رہا۔ منجھلی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ نہ منہ سے بولنا نہ سر سے کھیلنا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ کسی سے بات کرنے کا جوش۔ سر منہ لپیٹے لیٹی رہتی تھیں۔ بڑی ماں، سنجھلی اور احسن کی دلہن نے بڑی خدمت کی۔ امدی نوالے بنا بنا کر کھلاتی تھیں۔ وقتوں پر دوا پلاتی تھیں۔ ہاتھ پیر دباتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کہانی چھیڑ دیتی تھیں۔ انہوں نے وظیفے پڑھنا اور پندرہ ہزار چھ سو اشرفیوں کا ذکر بھی وقتی طور پر کم کر دیا تھا۔ جب منجھلی کی عدت ختم ہو گئی اور اُن کی طبیعت سنبھل گئی تو بڑی ماں اپنے پرانے ڈھرے پر آ گئیں۔ وہی پندرہ ہزار چھ سو کی تسبیح پڑھنے لگیں۔

بڑی حویلی کی رونق بہت کم ہو گئی تھی۔ سنجھلی، منجھلی سب خاموش خاموش رہتی تھیں۔ احسن میاں کی طرف بھی چہل پہل کم ہی نظر آتی تھی۔

بڑی ماں میں بھی تبدیلی آ گئی۔ گھنٹوں اکیلی بیٹھی سوچتی رہتیں۔ کسی خیال میں ڈوبی رہتیں۔ شاید کسی نئی کہانی کا تانا بانا بُن رہی تھیں۔ مگر یہ نئی کہانی اُن کی اپنی رام کہانی تھی۔ سوچتی تھی، بچپن اور لڑکپن میں دادا کی ڈانٹ نے اکتنے نہیں دیا۔ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ احسن کی دلہن اور بیٹیاں کتابیں پڑھتی رہتی ہیں۔ کل ہی بھلّو نے کتاب سے "بچے کے کُرتے" کی کہانی پڑھ کر سنائی تھی۔ اخبار بھی پڑھ لیتی ہیں۔ یہاں کیا، وہی جنوں اور پریوں کی سنی سنائی باتیں۔ جوان ہوئی۔ بیاہ ہوا تو ساس ڈائن ہو گئی۔ پنپنے ہی نہیں دیا۔ ایسا برتاؤ کرتی تھیں کہ کوئی

اپنی زر خرید لونڈی سے بھی نہ کرتا ہوگا۔ حال سے بے حال کر دیا۔ صورت، شکل، پہننا اوڑھنا، ارمان سب پر پانی پھر گیا۔ خدا خدا کر کے اُن سے چھٹکارا ملا تو "رنگیلے پیا" نے آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔ جینا حرام کر دیا۔ دو دن غائب۔ تین دن غائب۔ چار دن غائب۔ یہاں پیسے پیسے کو ترس رہے ہیں۔ سودا سلف منگوانے کو حیران بیٹھے ہیں۔ کوٹھی سے شاہ میر یا انتظام علی روز پھیرا کرتے تھے۔ صبح ہی صبح آتے۔ سارا سودا لا دیتے۔ پاس پڑوس اچھا تھا۔ کیل کا کھٹکا نہیں ہوا۔ بیچاری سکینہ اکیلی بولائی بولائی پھرتی تھی۔ پھر منجھلے نے کوٹھی میں بلوایا۔ کیا آدمی تھے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ کنبہ پرور۔ سب کا خیال کرنے والے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ روز روز کی دعوتیں، جلسے، سیر و تفریح نے اُنہیں برباد کیا۔ بالکل غلط۔ انہیں برباد کیا اُن کے بھائیوں نے۔ ساری زندگی بوٹیاں نوچتے رہے۔ وہ چھاتی پھاڑ کر کماتے تھے۔ یہ لوگ اڑاتے تھے۔ مزے کرتے تھے۔ کھکھ کر دیا۔ تباہ کر دیا۔ یہ بھی ایک کہانی ہے۔ مگر سنانے والی نہیں۔

منجھلے کے یہاں وقت کیسا اچھا گزرا۔ کیسی رونق اور چہل پہل تھی۔ کیسی کیسی کہانیاں ہوتی تھیں۔ سارے بچے لپٹے رہتے تھے۔ اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔ عورتیں بھی کہانیوں پر دم دیتی تھیں۔ بیاہ ہو گیا مگر کسی نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا۔ پھر وہ منحوس رات۔ جب سکینہ کے ابا ہمیشہ کے رخصت ہو گئے۔ جلسوں میں سر پھٹول تو ہوا ہی کرتی ہے مگر وہ لاٹھی، لاٹھی نہیں تھی۔ قضا کا پیغام تھا۔ دنیا اندھیر ہو گئی۔ سب نے کیسی تسلی دی۔ کیسی دلداری کی۔ بچے بڑے سب "بڑی اماں یہ کھا لو۔ بڑی اماں شربت پی لو۔ بادام کا ہے۔" کہتے رہتے تھے۔ جانے والا چلا گیا اپنی کہانی چھوڑ گیا۔ یہ کہانی بھی کسی کے سننے کے لائق نہیں ہے۔

میاں سبحان غائب ہو گئے۔ سکینہ کیسا کیسا بین کرتی تھی۔ بچوں کے چہرے پر یتیمی برسنے لگی تھی۔ خیر کئی برس کے بعد وہ آ گئے۔ صحیح گئے۔ سلامت آئے... گھر آباد ہو گیا۔ بچوں کے چہرے کھل گئے۔

اب اس کالی چڑیل سے واسطہ پڑا ہے۔ اس نے سچ مچ پاگل بنا دیا ہے۔ کیسے کیسے وظیفے پڑھے۔ دعا کرائی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ دیگیں کھن کھناتی رہیں۔ اب بھی کھن کھناتی ہیں۔ اگر اشرفیاں مل جائیں تو کیا ہو؟ سب چمٹ جائیں گے۔ تکا بوٹی کر دیں گے۔ ہمیں دے دو۔ ہمیں دے دو۔

ہمارا حق ہے۔ اشرفیاں رکھنے کی بھی کوئی جگہ نہیں۔ سب دانت لگائیں گے۔ اچھے دل برے ہو جائیں گے۔ جس سے انکار کروں گی وہی دشمن ہو جائے گا۔ جان ''زبج'' میں آجائے گی۔ سب مل کر بوٹیاں نوچ لیں گے۔

بڑی ماں یہ نئی کہانی اکثر دل ہی دل میں دہراتی تھیں۔ اپنی بے قرار روح کو سکون پہنچاتی تھیں۔ دوسروں کی کہانیاں سناتے سناتے کوئی ٹکڑا اپنی کہانی کا بھی سنا دیتی تھیں۔

ایک دن بڑی ماں زور سے چیخیں۔ بڑی بھیانک چیخ تھی۔ سب دوڑے تو دیکھا بے ہوش ہیں۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو چکے ہیں۔ پندرہ ہزار چھ سو کا ارمان دل میں لیے رخصت ہو گئیں۔ اپنی اور دوسروں کی کہانیاں چھوڑ گئیں۔

سیر آخری درویش کی

مولوی صاحب

جب سارے درویش اپنی اپنی کہہ کر رُخصت ہو گئے اور محفل پر سنّاٹا سا چھا گیا تو ایک درویش جو باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا اہل محفل کے سامنے آیا اور بولا، اب اس آخری درویش کی کہانی بھی سُن لیں۔ کانوں سُنی بھی ہے اور آنکھوں دیکھی بھی۔ تو صاحبو ____

ضلع فرخ آباد کے صدر مقام فتح گڑھ میں نورانی شکل کے ایک بزرگ وارد ہوئے۔ بیسویں صدی کا دوسرا عشرہ آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ فتح گڑھ ہمیشہ کی طرح خاموش اور پُر سکون تھا۔ آنے والے بزرگ جوانی اور بڑھاپے کے درمیانی وقفے سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے فتح گڑھ پہنچتے ہی کسی سرائے کے بارے میں دریافت کیا۔ بتایا گیا کہ دو سرائیں ہیں، پکی سرائے اور کچی سرائے۔ انہوں نے کچی سرائے کا انتخاب کیا کہ غریب غربا کی قیام گاہ اور قریہ قریہ پھرنے والوں کی پناہ گاہ تھی۔ کچی سرائے کے بڑے بھٹیارے نے انہیں دیکھا، بزرگی کے آثار کا مشاہدہ کیا اور فوراً قدم لیے۔ سب سے بہتر کوٹھری میں کسا کسایا پلنگ بچھوایا، صاف ستھرا بستر لگوایا، عمدہ کھانے کا انتظام کیا۔ دو تین دن میں آنے والے بزرگ کا جنہیں سب لوگ مولوی صاحب کہنے لگے شہرا ہو گیا۔ فتح گڑھ چھوٹی سی جگہ تھی۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چھیلی کہ ایک بزرگ آئے ہیں۔ کراماتی بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ ان میں مسلمان بھی تھے۔ ہندو بھی تھے۔ مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں۔ کوئی دعا کے لیے دوڑا آیا کسی نے تعویذ کی فرمائش کی۔ کسی نے فال کھلوانے کے لیے اصرار کیا۔ مولوی صاحب نے سب کی فرمائش پوری کر دی۔

فتح گڑھ کے رئیس منجھلے میاں نے بھی مولوی صاحب کا شہرا سنا اور اپنے معتمد خاص

انتظام علی کو ان کا حال احوال معلوم کرنے اور اشتیاق ملاقات ظاہر کرنے کے لیے بھیجا۔ انتظام علی سچ مچ انتظام علی تھے۔ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب کو ساتھ لیے منجھلے میاں کی کوٹھی میں واپس آ گئے۔

منجھلے میاں نے مولوی صاحب کو دیکھا۔ نجانے انہیں ان بزرگ میں کیا روشنی نظر آئی۔ کیا کشش محسوس ہوئی کہ کوٹھی میں قیام کرنے کے لیے اصرار کیا۔ بڑی سادگی اور انکسار سے کہا یہاں تشریف لے آیئے۔ آپ جیسے بزرگ کے لیے سرائے میں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ انتظام علی دوڑائے گئے۔ وہ کچی سرا سے مولوی صاحب کا سامان لے آئے۔ سامان ہی کیا چند کتابیں، ایک تھیلی میں قلم دان اور دو ایک جوڑے تھے۔ مولوی صاحب نے بعد میں بتایا کہ انہیں فتح گڑھ میں قیام کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ فتح گڑھ آئے ہیں اور منجھلے میاں کے اصرار پر ان کے یہاں مقیم ہو گئے ہیں۔

منجھلے میاں کے چھوٹے بھائی علّی میاں کہلاتے تھے (تشدید کے ساتھ) جو بھائی ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر آگے بڑھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بڑے غور سے دیکھا۔ عرفان ذات و کائنات کی نجانے کتنی منزلیں ان نگاہوں میں طے ہو گئیں۔ علّی میاں کو اندازہ ہو گیا کہ مولوی صاحب بھی انہیں کی طرح چنیا بیگم کے عاشق ہیں۔ پھر کیا تھا۔ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" علّی میاں نے خوشی خوشی کوٹھی کے بڑے دالان میں بچھے ہوئے تخت کی صفائی کرائی۔ اُجلی چادر، گاؤ تکیہ، سیدھے ہاتھ پر مولوی صاحب کی کتابیں اور قلم دان۔ دالان سے ملحق کئی کمرے تھے۔ ایک کمرے میں چارپائی بچھا دی گئی۔ بستر لگا دیا لیکن مولوی صاحب دالان میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بھی کبھی نہیں لیٹے۔ تخت ہی پر آرام کرتے۔ دن بھر بیٹھتے اور رات کو اُسی پر آرام سے سو جاتے۔ کھانا اندر سے دونوں وقت آنے لگا۔ صبح کو انڈا پراٹھا اور چائے بھی آتی۔ مولوی صاحب اور علّی میاں آرام سے ناشتا کرتے اور کھانا کھاتے۔ صبح شام ساتھ ہی چنیا بیگم کا دیدار بھی کرتے تھے۔

چند ہی روز میں مولوی صاحب کے پاس دعا کرانے والوں، تعویذ لکھوانے والوں اور فال کھلوانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ دعا کے لیے آنے والوں پر مولوی صاحب کچھ پڑھ کر پھونکتے

تھے، پھر کہتے جاؤ۔ "اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔" تعویذ لکھوانے والوں میں مسلمان بھی ہوتے تھے۔ ہندو بھی ہوتے تھے۔ مرد بھی عورتیں بھی۔ یہ سب سرگوشی میں اپنا مدعا بیان کرتے۔ مولوی صاحب غور سے سُنتے اور پھر تعویذ کے لیے کٹے ہوئے کاغذوں کی ایک گڈّی سے جو علّی میاں اُن کے لیے تیار کرتے تھے، ایک کاغذ نکالتے کچھ دیر سوچتے۔ پھر قلم دان سے کلک کا قلم نکالتے اور کاغذ پر نقش تحریر کرکے کاغذ کو موڑتے اور کسی سے کہتے، "موم جامہ کرواکے گلے میں باندھ لینا۔" کسی کو ہدایت ہوتی کہ بازو پر باندھ لینا اور کسی کو حکم ہوتا کہ صاف اور تازہ پانی میں گھول کر پی لینا۔ فال کھلوانے والوں میں ہندو مرد اور ہندو عورتیں زیادہ ہوتی تھیں جو آہستہ آہستہ اپنا مسئلہ بیان کرتیں۔ مولوی صاحب بھوج پتر کی ایک قلمی کتاب اُٹھاتے۔ ورق اُلٹتے ۔ اوراق پر دائرے بنے ہوتے تھے۔ ہر دائرے کے ساتھ کچھ عبارت لکھی ہوتی تھی۔ مولوی صاحب ورق اُلٹتے اُلٹتے ایک جگہ ٹھہر جاتے اور پھر فال نکلوانے کو جواب دیتے۔ دُعا کرانے والوں سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔ یہ بزرگانہ کرم کا اظہار بے محابا تھا۔ تعویذ لکھوانے اور فال کھلوانے والے سوا پانچ آنے قلم دان میں رکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ہار پھول اور مٹھائی بھی لے کر آتا۔ ہار پھول اور کچھ مٹھائی زنان خانے میں بھجوادی جاتی تھی۔ باقی مٹھائی علی میاں ایک کٹور دان میں رکھ دیتے تھے۔ یہ کھانے کے بعد کھائی جاتی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے مولوی صاحب کا مکتب بھی قایم ہوگیا۔ محلے کے لڑکے، لڑکیاں قرآن شریف پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ اک سنٹی مولوی صاحب کے پاس رکھی رہتی تھی۔ ادھر کسی نے آموختہ سنانے میں غلطی کی اور ادھر مولوی صاحب نے ایک سنٹی جڑی۔ لیکن لڑکیاں اس سنٹی سے محفوظ رہتی تھیں۔

ٹوہ لینے والوں، سراغ لگانے والوں اور معلومات حاصل کرنے والوں نے بھی اپنا کام کیا۔ مولوی صاحب کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرلیا۔ سیّد محمد شفیع نام تھا۔ جون پور کے رہنے والے تھے۔ اگر کوئی ان کے سامنے جون پور کہتا تو بگڑ جاتے تھے۔ "جَون پور کہیے صاحب۔ جَون پور کہیے۔" نجیب الطرفین سیّد تھے۔ ماں باپ ان کی جوانی ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ ایک شادی شدہ بہن تھیں۔ سارا کنبہ یہی بہن تھیں۔ مولوی صاحب تعلیم سے فارغ ہوئے تو

کچہری میں ملازم ہو گئے۔ ترقی کرتے کرتے "گرداور قانون گو" ہو گئے جو ایک اچھا منصب تھا۔ لیکن ماں باپ کے اصرار کے باوجود شادی نہیں کی۔ دونوں ان کا سہرا دیکھنے کی حسرت میں گزر گئے۔ پھر ایک دن نجانے کیا ہوا۔ کیسی ترنگ آئی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا لیکن وہ اپنی سی کر کے رہے۔ تھوڑی بہت زمینداری تھی، مکان تھا وہ سب بہن کے نام لکھ دیا اور "قیس جنگل میں اکیلا ہے..." پڑھتے ہوئے صحرا صحرا پھرنے لگے۔ نجانے کہاں کہاں گئے، گھومتے پھرتے فتح گڑھ آ پہنچے اور منجھلے میاں کے اصرار پر اُن کے مہمان ہو گئے۔ دشت نوردی ختم ہوئی۔ شاید دل کو قرار آ گیا یا ڈھنگ کا ٹھکانا دیکھ کر یہیں قیام کر لیا۔

مکتب ختم ہوتا تو اندر سے کھانا آ جاتا۔ مولوی صاحب اور علی میاں کھانا کھاتے۔ پھر اخبار آوازِ بلند پڑھتے۔ کھانے کے بعد اُن کے ایک ہم مذاق اور ہم مشرب عبدالوحید خان آ جاتے۔ اُن کے آتے ہی مولوی صاحب اخبار اُن کے سپرد کر دیتے تھے۔ عبدالوحید خان با آواز بلند اخبار پڑھتے۔ مولوی صاحب اخباروں کے رسیا تھے۔ مولونا ظفر علی خاں کا اخبار "زمیندار" اور بجنور والے حافظ محمد حسن کا سہ روزہ اخبار "مدینہ" پڑھا جاتا تھا۔ مدینہ کی لوح پر عزیز لکھنوی کا یہ شعر درج ہوتا تھا:

معجزہ شق القمر کا ہے 'مدینہ' سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

مولوی صاحب اس شعر کو بے معنی قرار دیتے تھے۔ عبدالوحید خان بڑی دیر تک اخبار سناتے تھے۔ اُن میں ایک کمال یہ تھا کہ آپ اُن سے پوچھئے۔ سن ۱۶۲۰ء کی ۱۸ جنوری کو کیا دن تھا۔ وہ سوال سنتے ہی جیب سے پنسل نکالتے۔ کاغذ پر کچھ لکھتے اور پھر کہتے "فلاں دن تھا۔" اُن کا جواب کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔

اخبار پڑھے جانے کے دوران فقیر محمد خان آ جاتے۔ انہیں سب فقیرے کہتے تھے۔ یا قوت گنج کے زمیندار تھے جو فتح گڑھ سے تقریباً چار میل دور تھا۔ فقیرے آہستہ آہستہ سائیکل چلاتے آتے۔ کوٹھی کے صحن میں سائیکل کھڑی کرتے پھر دالان میں آتے۔ علیک سلیک کے بعد دالان میں بچھی ہوئی چارپائیوں میں سے اپنی ایک مخصوص چارپائی پر لیٹ جاتے۔ سانس

درست ہو جاتی تو اخبار سنتے رہتے۔ فقیرے بھی مولوی صاحب اور علّی میاں کے ہم مشرب تھے۔ دوپہر کا اجتماع انہیں کے نام تھا۔ شام کے چار بجے فقیرے اٹھتے۔ مولوی صاحب اور علّی میاں کو با آواز بلند سلام علیک کہتے اور مقصود چائے والے کی دکان پر بالائی والی چائے کی ایک پیالی پیتے اور پھر آہستہ آہستہ سائیکل چلاتے ہوئے یاقوت گنج واپس چلے جاتے۔ اُن کی یہ وضع داری زندگی بھر قائم رہی۔ مولوی صاحب اور علّی میاں کا انتقال ہو گیا لیکن فقیرے روزانہ دوپہر کو فتح گڑھ آتے۔ کوٹھی کے دالان میں اپنے مخصوص پلنگ پر آرام کرتے۔ شام کو مقصود کے یہاں چائے پیتے اور یاقوت گنج لوٹ جاتے۔ جب چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تو یہ وضع داری بھی ختم ہو گئی۔

شام کے سائے ڈھلتے ہی مولوی صاحب کی محفل سج جاتی تھی۔ فتح گڑھ کے جتنے قابل ذکر افیمی تھے آنا شروع کرتے۔ سب سے پہلے بجّن آتے۔ کندھے پر چھوٹی سی سیڑھی لٹکی ہوئی، ہاتھ میں مٹی کے تیل کا کنستر۔ وہ آتے ہی لالٹین کی جھاڑ پونچھ کرتے۔ یہ جرمنی کے مشہور کارخانے ڈیز کی بنی ہوئی عام لالٹینوں کے مقابلے میں خوبصورت اور شاندار تھی۔ لالٹین کی صفائی کے بعد بجّن چمنی چمکاتے۔ پھر صابن سے ہاتھ دھو کر انگیٹھی کی صفائی کرتے راکھ جھاڑ کر باہر پھینکتے۔ انگیٹھی میں کوئلے بھرتے۔ چائے کی کیتلی میں پانی بھرتے اور سیڑھی کندھے پر لٹکا کر، کنستر ہاتھ میں لیے چنگی کی لالٹینیں جلانے روانہ ہو جاتے۔ اچھے خاصے صحت مند آدمی تھے لیکن افیم کی لت نجانے کیسے لگ گئی تھی۔ واجد علی نام تھا لیکن سارے شہر میں بجّن کی عرفیت سے مشہور تھے۔ اصلی نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔

بجّن کے جاتے ہی 'رمضانی' لنگڑاتے لنگڑاتے آجاتے۔ انہیں باپ سے ورثے میں تین دکانیں ملی تھیں۔ دو کرائے پر اُٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آمدنی سے کام چلتا تھا تیسری دکان میں وہ خود رہتے تھے۔ مزاج میں ریاست کی خوبو تھی۔ چنگی میں لالٹین جلانے پر نوکر تھے مگر ایسا گندہ کام وہ کیسے کرتے۔ یہ اُن کی شان ریاست کے خلاف تھا۔ انہوں نے ''بجن'' کو اس کام کے لیے ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ رمضانی کو جو تنخواہ ملتی اُس کا بڑا حصہ بجن کو دیا جاتا تھا۔ بجن تیل بیچنے کا کام بھی خاموشی سے انجام دیتے تھے۔

مولوی صاحب کے فتح گڑھ آنے سے پہلے میاں رمضانی فتح گڑھ کے سارے افیمیوں کے سربراہ تھے۔ مولوی صاحب فتح گڑھ میں جم گئے تو سربراہی بھی انہیں کے حصے میں آگئی اور میاں رمضانی اُن کے متوسّلین میں شمار ہونے لگے۔

رمضانی بڑے دل چسپ آدمی تھے۔ ایک رات کہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ صاحب خانہ نے اُن سے کہا، "اس وقت کوئی اور نہیں ہے۔ بچّے بالائی کھانے کی ضد کر رہے ہیں۔ ذرا سامنے سے پمّا حلوائی کے یہاں سے پاؤ بھر بالائی تو لا دو۔" میاں رمضانی جھٹ روانہ ہوئے لیکن چُنیا بیگم کا روئے زیبا اپنا کام کر گیا۔ سرور گٹھ گیا۔ اب رمضانی ہیں کہ چلے جا رہے ہیں۔ چلے جا رہے ہیں۔ پمّا کی دکان نہ اب آتی ہے نہ جب آتی ہے۔ چلتے چلتے آندھ آگئی۔ آخر کار حلوائی کی دکان نظر آئی جو دکان بند کر رہا تھا۔ میاں رمضانی نے چلّا کر کہا، "دیکھ لیا، دیکھ لیا ہم نے دیکھ لیا۔ دودھ میں پانی ملا رہے ہو۔" حلوائی نے ناراض ہو کر کہا، "میاں! ہوش کے ناخون لو۔ دیوانے ہو گئے ہو۔" رمضانی نے پھر چلّا کر کہا، "ابھی سارے فتح گڑھ کو تمہارے کرتوت کی خبر ہو جائے گی۔" حلوائی اور زیادہ چڑ گیا۔ ڈانٹ کر کہنے لگا، "یہ فتح گڑھ نہیں یاقوت گنج ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" یاقوت گنج کا نام سن کر میاں رمضانی کے حواس جاتے رہے۔ یاقوت گنج فتح گڑھ سے کوئی چار میل دور تھا۔ اب پھر چلنا شروع کیا۔ لڑھکتے لڑھکتے رات کے بارہ بجے کے قریب بالائی منگوانے والے کے گھر کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ صاحب خانہ سوتے سے اُٹھے۔ ہڑ بڑا کر باہر نکلے تو میاں رمضانی دروازے پر کھڑے نظر آئے۔ رونی آواز میں بولے، "میاں بالائی نہیں ملی۔ پمّا اپنی دکان بڑھا گیا۔ یہ لو اپنے پیسے۔" اور انہیں حق حیران چھوڑ کر میاں رمضانی اپنی جگہ پہنچ گئے۔

ایک دن میاں رمضانی نے مولوی صاحب سے شکایت کی۔ "میاں نجانے کون مردود لا گو ہو گیا ہے۔ میں صبح صبح حُقہ بھر کر رکھتا ہوں ذرا دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی بھری ہوئی چلم اُتار لے گیا۔" مولوی صاحب بڑی دیر تک سوچتے رہے پھر بولے، "یہ کسی جن کا کام معلوم ہوتا ہے۔" رمضانی کہنے لگے، "اور میاں پھر وہ خالی چلم واپس بھی رکھ جاتا ہے۔" مولوی صاحب کہنے لگے، "کوئی بدمعاش جن معلوم ہوتا۔ بھلے آدمیوں کو ستاتا ہے۔" اصل بات یہ تھی کہ رمضانی حُقہ بھر کر رکھتے اور پینک میں چلے جاتے ایک پڑوسی ادھر سے گزرتے۔ بھری ہوئی چلم خاموشی

سے اُتار لے جاتے۔ پھر انہیں ایک دن خیال آیا کہ میاں رمضانی غریب آدمی ہیں روز روز نئی چلم کہاں سے خریدیں گے تو موقعہ محل دیکھ کر چلم واپس رکھ جاتے تھے۔

رمضانی کے بعد جناب علّی ٹہلتے ہوئے آتے۔ یہ قائم گنج کے پٹھان تھے مگر چھنیا بیگم کے عشق میں لپسی حریرا ہو گئے تھے۔ لکڑیوں کی ایک ٹال پر کام کرتے تھے۔ دن بھر مشقت کرتے، شام کو مولوی صاحب کی محفل میں آ بیٹھتے۔ ایک دن اُن میں اور بجّن میں کچھ تکرار ہو گئی۔ ہاتھا پائی پر نوبت آ گئی۔ اتنے میں احسن میاں جو منجھلے میاں کے بھتیجے تھے اور انہیں کے ساتھ رہتے تھے، شور سُن کر اندر سے نکلے اور ہاتھا پائی دیکھ کر دونوں کے درمیان آ گئے۔ احسن میاں کا دھکا جو لگا تو جناب علی تین لڑھکیاں کھا گئے۔ بجّن اپنی جگہ قائم رہے۔ احسن میاں نے کہا، "اگر یہاں یہ شُہدا پن ہوا تو میں تم دونوں کا آنا بند کر دوں گا۔ صلح کرو اور فوراً آ گلے ملو۔ دونوں فوراً گلے مل گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ رمضانی کے بعد کچہری کے کچھ پینشن یافتہ بوڑھے، بڑھاپے کی للکار اور گھر والوں کی پھٹکار کے مارے ہوئے، چھنیا بیگم کے عاشق زار ایک ایک کر کے آتے۔ ٹلّن سب سے آخر میں آتے تھے۔ یہ گرمیوں میں اسکول میں پنکھا کھینچتے تھے۔ جاڑوں میں کھیر کے پیالے بیچتے تھے۔ ان کی جُرواپلے میں گوشت رکھ کر گھر گھر بیچتی رہتی تھی۔ بڑی جیّد عورت تھی۔ ایک دن ٹلّن مولوی صاحب کے پاس پینک میں دنیا ومافیہا سے غافل بیٹھے تھے۔ اتنے میں ان کا چھوٹا لڑکا آیا۔ "ابا۔ ابا ایک پیسہ دے دے۔" ٹلّن پینک سے چونک پڑے۔ لڑکے پر خوب خوخیائے۔ ڈانٹ کر اُسے بھگا دیا۔ ذرا دیر میں ٹلّن کی جُرواچار خانے کا تہہ بند باندھے، دوپٹہ لپیٹے، ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لیے آن دھمکی۔ ڈونک کر بولی، "پیسہ کیوں نہیں دیا؟" ٹلّن نے گھبرا کر تہہ بند کی انٹی سے پیسہ نکال کر پھینک دیا۔ ماں بیٹا دفع ہو گئے۔ ٹلّن کی جُرواکے تیور دیکھ کر مولوی صاحب بھی تھرا گئے تھے۔ جب وہ دفعان ہو گئی تو بولے "بزرگوں نے اسی لیے عورتوں سے دور رہنے کو کہا ہے۔ جی کا جنجال ہوتی ہیں۔ جی کا جنجال۔"

ویسے ٹلّن بھی کچھ کم نہیں تھے۔ بڑے جھوٹے لپاٹیے تھے۔ اسکول میں پنکھا کھینچنے کی تنخواہ سترہ روپے ملتی تھی گھر والی کو گیارہ بتا رکھے تھے۔ ایک دن وہ کسی کام سے انہیں ڈھونڈتی ڈھانڈتی اسکول آ مری۔ باہر کھڑے تھے اسکول کے بابو جی۔ اُن سے کچھ بات ہوئی تو انہوں نے

کہا، "سترہ روپے تو ملتے ہیں اور کیا کسی کا گھر لے گا۔" وہ وہاں سے تو چپکی چلی آئی مگر شام کو جب ٹلّن گھر پہنچے تو اُس نے سنبھالا ڈنڈا اور میاں ٹلّن کی ساری شیخی کر کری کر دی۔

آنے والے آ گئے۔ بجّن نے انگیٹھی دہکائی۔ بالائی والی چائے تیار ہو گئی۔ ایک ایک پیالی سب کے سامنے رکھ دی گئی۔ اب مولوی صاحب نے عینک نکالی۔ لگائی پہلو سے 'طلسم ہوش ربا' کی جلد نکالی اور داستان شروع کی۔

نگارندہ داستان عجیب
رقم کرتے ہیں یہ حکایت غریب

دو کلمہ داستان حیرت بیان، طلب کرنا افراسیاب خانہ خراب کا اپنی وزیر اعظم ملکہ صعنت سحر ساز کو اور واصل بہ جہنم ہونا اُس کا صاحب بُغدہ گراں مہتر قرآن کے ہاتھوں۔ تو جب افراسیاب خانہ خراب حیران پریشان باغ سیب میں آیا اور افسوس کے لہجے میں کہنے لگا "کیا طلسم ہوش ربا میں کوئی وفادار نہیں رہا۔" یہ کہہ کر تالی بجائی۔ ایک ڈنّاٹا ہوا، ہَوا تیز چلنے لگی۔ آواز بلند ہوئی۔ "وزیر اعظم ملکہ صعنت سحر ساز باریابی کی اجازت چاہتی ہیں۔" بمجرد اس اعلان کے ملکہ نے افراسیاب کی قدم بوسی کی۔ بولی "شہنشاہ بلاوجہ کا تردد کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی فوج میں کیا رکھا ہے۔ ناچیز نے آتے ہی حصار بندی کر دی ہے۔ نہ کوئی حصار کے اندر آ سکتا ہے نہ باہر جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو بھاگتے بھی بن نہ پڑے گی۔" افراسیاب یہ مژدہ جاں فزا سن ملکہ حیرت جادو کو لے کر تخلیے میں چلا گیا۔ ملکہ صعنت نے بھی آرام کا ارادہ کیا۔ اتنے میں شور و غل ہوا۔ نعروں کی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں۔ ملکہ گھبرا کر باہر نکلی۔ دیکھا تو ہاتھیوں پر سوار ایک برات رُکی کھڑی ہے۔ ایک ہاتھی پر میاں نوشہ اور دوسرے پر ان کے والد سوار ہیں۔ شہنائی بج رہی ہے اور ملکہ کے ملازموں اور براتیوں میں ہاتھاپائی ہو رہی ہے۔ کسی نے کہا، "فرتوت جادو کے فرزند ارجمند عنکبوت جادو کی برات جا رہی ہے لیکن حصار سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اس پر ہنگامہ ہو رہا ہے۔" ملکہ نے کہا، "ہاں! یاد آیا۔ بلاوا تو آیا تھا۔" ملکہ کو بڑھتے دیکھ کر دولھا کے والد نے اشارہ کیا۔ ہاتھی ملکہ کے سامنے آئے۔ دولھا کے باپ نے کہا، "بیٹا۔ یہ ملکہ صنعت سحر ساز ہیں۔ وزیر اعظم ہیں۔

حقیقت میں یہی سب کچھ ہیں۔ جواہرات کی تختیاں انہیں پیش کردو۔" دولھا نے تختیاں نکالیں۔ ملکہ قریب آئی عطر کی تیز لپٹ نے شامّہ کو شل کر دیا۔ بیہوش ہونے لگی۔ دولھا نے یہ رنگ دیکھ کر بغدہ گراں گھمایا۔ صنعت ساز کا سر زمین پر لڑھکنے لگا۔ بڑے زور کی آندھی آئی۔ بڑا شور ہوا پھر آواز گونجی، "منم کہ نام مرا ملکہ سحر ساز بود۔ بمر دم وجان دادیم وبمطلب خویش نرسیدیم۔" ملکہ کا مرنا اور حصار سحر کا ختم ہونا دیکھ کر افراسیاب والے سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہوگئے۔"

مولوی صاحب پڑھتے رہے۔ بیچ بیچ میں کبھی افسوس اور کبھی خوشی کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ ملکہ کے مرنے کے بیان پر حاضرین نے ایک زبان بن کر نعرہ لگایا، "وہ مارا مردود کو۔" اگر داستان میں کوئی ایسا مقام آجاتا جہاں لشکرِ اسلام کسی مشکل میں مبتلا ہو جاتا تو یا آوازیں بلند ہوئیں، "بس مدد آیا ہی چاہتی ہے۔ وہ آئی مدد۔" ڈیڑھ دو گھنٹے یہ محفل جمی رہتی۔ پھر آنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے۔

مولوی صاحب کی محفل تو جمی رہی لیکن منجھلے میاں کی محفل اکھڑ گئی۔ کاروبار میں بڑا نقصان ہوا۔ کوٹھی بک گئی۔ گھر والے حکیم جی والے مکان میں اُٹھ گئے۔ وہ بھی فروخت ہو گیا تو بڑی حویلی آباد کی۔ دونوں جگہ مولوی صاحب، علّی میاں اور اُن کی محفل حسب دستور جمتی رہی۔ جب منجھلے میاں کا انتقال ہو گیا تو منجھلی نے (ان کی بیگم کو سب منجھلی کہتے تھے) بڑی حویلی بیچ دی اور اپنی منہ بولی بیٹی کے یہاں چلی گئیں تو احسن میاں نے جو منجھلے میاں کے بھتیجے تھے کوٹھی کا بڑا حصہ کرائے پر لے لیا۔ کوٹھی ان دنوں کورٹ آف وارڈس کے قبضے میں تھی۔ بڑا دالان بھی قبضے میں آگیا۔ مولوی صاحب اپنے پُرانے ٹھکانے پر واپس آگئے۔ جانے والے چلے گئے محفل جمی رہی۔ اس زمانے میں شوکت نامی ایک سُرمہ بیچنے والا بھی مولوی صاحب کے خدمت گاروں میں شامل ہو کر کوٹھی میں رہ پڑا۔

یہاں پہنچ کر آخری درویش نے محفل پر نظر ڈالی اور کہا، "صاحبو! کانوں سُنی ختم ہو گئی اب جو آنکھوں دیکھی۔"

آخری درویش نے کہ بڑا بیٹا احسن میاں کا تھا، ٹھہر ٹھہر کر اپنا بیان شروع کیا۔

"صاحبو! جب یہ عاجز چار برس چار مہینے چار دن کا ہوا تو اس کے نانا نے بڑی دھوم سے اس کی تسمیہ خوانی کی تقریب کی۔ وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لیے نواسے کو بیٹا بنالیا تھا۔ میں نے کچھ دن لکھنؤ میں پڑھا پھر والد مجھے فتح گڑھ واپس لے آئے اور مولوی صاحب کے سپرد کردیا۔ میں صبح کو قرآن شریف لے کر دالان میں حاضر ہوتا۔ مکتب کے سب لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ جاتا۔ مولوی صاحب عالم سرور میں ہوتے تو میں بھی دوسرے بچوں کے ساتھ شرارتیں کرتا۔ مولوی صاحب کو اونگھتے دیکھ کر سب بچے آہستہ آہستہ گاتے تھے "تختی پر تختی۔ مولوی صاحب کی آئی کم بختی۔" ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مولوی صاحب نے یہ نغمہ ہوش ربا سن لیا۔ اُس دن سارے لڑکوں پر بڑی مار پڑی۔ میں بچ گیا لیکن مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے ایک دن موقعہ پاکر مولوی صاحب کی تلے دانی کنویں میں پھینک دی۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ یہ کسی ایسے جن کا کام ہے جسے مولوی صاحب سے دشمنی ہے۔ میں چپ چاپ بیٹھا یہ سب سنتا اور سوچتا کہ جن تو سامنے موجود ہے۔ اُس کا گلا کیوں نہیں دباتے۔"

ایک بات اس حقیر کی سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔ کبھی کبھی کوئی جن مولوی صاحب کے قلم دان سے اٹھنّی چونی اُٹھا کر محمود کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔ مولوی صاحب کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ خبر ہم لوگوں کو بھی نہیں ہوتی تھی لیکن جب صبح صبح محمود گرم گرم جلیبیاں لاکر مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیتا تو ہم سمجھ جاتے کہ کسی جن نے محمود کی جیب میں پیسے ڈال دیے ہیں۔ مولوی صاحب ایک آدھی جلیبی بڑی رغبت سے کھاتے۔ علّی میاں بھی کھاتے تھے۔ ایک جلیبی شوکت کو بھی ملتی تھی۔ باقی ہم سب میں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ محمود سے لاکھ پوچھا، "یہ کون سا جن ہے۔ ہمیں بھی اُس کا پتا بتاؤ۔" مگر وہ ہمیشہ ٹال گیا۔ ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

مولوی صاحب کی عادت تھی کہ وہ سب لڑکے لڑکیوں کو "کم بخت" کہا کرتے تھے۔ سنٹی جڑی اور کہا، "کم بخت اتنا بھی نہیں جانتا۔" میری والدہ نے ایک دن اُن سے کہلا بھیجا کہ بچوں کو کم بخت نہ کہا کیجئے یہ تو بد دعا ہے۔" تو مولوی صاحب نے "کم بخت" کی گردان ختم کردی۔

قرآن مجید ختم ہوا تو میری آمین بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مولوی صاحب کو جوڑا

پیش کیا گیا۔ مکتب کے لڑکوں میں مٹھائی بٹی میں سمجھا کہ اب مولوی صاحب سے چھٹکارا حاصل ہو گیا لیکن قرآن مجید کے بعد میں نے مولوی صاحب سے فارسی پڑھی۔ کریما، مامقیماں، گلستاں بوستاں سکندر نامے اور شاہ نامے کا کچھ حصہ مولوی صاحب نے مجھے پڑھایا۔ بڑے فاضل آدمی تھے۔ بڑی محبت اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ ان کی پڑھائی ہوئی گلستاں، بوستاں کی بعض حکایتیں مجھے اب تک یاد ہیں۔

فارسی کی تعلیم میں مولوی صاحب ترنگ میں ہوتے تو اپنے سیر و سفر کے بعض قصّے سناتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے، جوانی کا زمانہ تھا۔ میں گھومتا پھرتا کامروپ پہنچ گیا۔ وہاں یہ دیکھا کہ مکھیوں کی بہت کثرت ہے۔ ہر شخص کے سرپر بھن بھن کرتی رہتی ہیں عورتیں جھاڑ پہاڑ مرد مرگھلے کم قدے پلپلے۔ میں نے حیران ہو کر ایک آدمی سے پوچھا، "یہاں مکھیوں کی اتنی یورش کیوں ہے؟" اُس آدمی نے مجھے ڈانٹا اور کہا، "اے اجنبی۔ ہر بات پوچھنے کی نہیں ہوتی۔ یہاں سے چپ چاپ واپس چلا جا۔" جوانی کا زور تھا۔ سر میں علم کا غرور تھا۔ دل میں ہر بات کی ٹوہ لینے کا وفور تھا۔ آخر ایک پیر مرد نے بتایا کہ "یہ مکھیاں نہیں۔ مرد ہیں۔ یہاں کی ساری عورتیں جادوگرنیاں ہیں۔ جادو کے زور سے تمام آنے والوں کو مکھیاں بنا دیتی ہیں۔ دن بھر یہ غریب بھن بھن کرتے اُڑتے رہتے ہیں۔ جادوگرنیاں شام کو انہیں پھر مرد بنا دیتی ہیں۔ رات بھر یہ اُن کے ساتھ رہتے ہیں۔ صبح سویرے پھر مکھی بن جاتے ہیں۔ تو اپنی جان کی خیر اور مکھی بننے سے بچنا چاہتا ہے تو فوراً یہاں سے چلا جا۔" میں نے کہا، "بڑے میاں! میں اسم اعظم جانتا ہوں۔ ایک لمحے میں سب کو بھسم کر دوں گا۔" اُس نے کہا، "تیرے حق میں بہتر یہی ہے کہ لوٹ جا۔ اس دیس سے چلا جا تو میں پھر وہاں نہیں ٹھہرا۔"

محمود ایک لمبا لڑکا تھا۔ ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ اُس نے کہا، "مولوی صاحب۔ اسم اعظم مجھے بھی سکھا دیجئے۔" مولوی صاحب نے بگڑ کر کہا، "چُپ۔ مردود۔ تو اسم اعظم سیکھے گا۔"

ایک دن مولوی صاحب نے کوہ قاف اور پرستان کا قصّہ سنایا۔ کہنے لگے، "جب میں کوہ قاف گیا تو وہاں کیا دیکھا کہ سی مُرغ پنجے میں چالیس آدمی دبائے اُڑا چلا جا رہا ہے۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چالیس ہاتھی ایک پنجے میں۔" محمود نے فوراً پوچھا، "مولوی صاحب آپ نے

چالیس ہاتھی گنے کیسے؟" مولوی صاحب بڑے ناراض ہوئے۔ کہنے لگے، "تو منکرین میں سے ہے۔ ہر بات پر انکار کرتا ہے۔" محمود نے پھر پوچھا، "مولوی صاحب۔ سی مُرغ کے معنی تو تیس پرندے ہوئے۔" مولوی صاحب اور زیادہ بگڑے۔ کہنے لگے، "اتنا نہیں سمجھتا کہ سی مُرغ اُس پرند کا نام ہے۔" پھر مولوی صاحب نے کہا، "میں کوہ قاف سے پرستان گیا۔ وہاں کے باشادہ نے مجھے بُلوایا۔ چار دیو ایک تخت لے کر آئے میں اُس پر بیٹھا پھر وہ دیو اُڑنے لگے اور آناً فاناً میں مجھے پرستان کے بادشاہ کے پاس پہنچا دیا۔ بادشاہ بڑی تعظیم سے پیش آیا۔ مجھے اپنے تخت کے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پریوں کا ناچ ہو رہا تھا۔ ایک پری سبز جوڑا پہنے ناچ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ سبز پری ہے۔ جو پیالے میرے سامنے لا کر رکھے گئے تھے، ان میں ہیرے جواہرات تھے۔ جگ مگ کر رہے تھے۔ بادشاہ نے کہا، "یہ سب آپ کے لیے ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ "میں تو فقیر ہوں۔ میرے لیے تو یہ کنکر پتھر ہیں۔ میں ان کا کیا کروں گا۔" پھر بادشاہ نے کہا، "اب آپ یہاں آگئے ہیں تو یہیں قیام فرمائیے۔ کچھ پریاں اور کچھ دیو آپ کی خدمت کے لیے مقرر کیے دیتا ہوں۔ سکون اور آرام سے رہیے۔" میں نے کہا، "اے شاہ ذی جاہ! اس ناچیز کو کسی ایک جگہ قیام کرنے کا حکم نہیں ہے۔" اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ میں چند دن وہاں رہا پھر بادشاہ کے حکم سے چار دیووں نے مجھے تخت پر بٹھایا اور ذرا سی دیر میں مجھے پرستان سے اس دنیا میں پہنچا دیا۔"

محمود نے یہ ساری داستان سُن کر کہا، "مولوی صاحب! اگر آپ جواہرات کے وہ پیالے رکھ لیتے تو ہم لوگوں کے کام آتے۔" مولوی صاحب نے ایک سنٹی جڑی اور بولے، "ابے لالچی، لالچ کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔"

ایک دفعہ اور مولوی صاحب نے مکتب میں بیان کیا کہ "میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا لپکتے جھپکتے چلے جا رہے ہیں۔ نہ منھ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ بس دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے دوڑ رہے ہیں جیسے اُڑ رہے ہوں۔ میں نے انہیں روکنا چاہا تو بڑے ناراض ہوئے۔ کہنے لگے ہمیں ٹھہرنے کی فرصت نہیں۔ کیوں ہمارا راستہ کھوٹا کرتا ہے۔ ایک بوڑھا پیچھے پیچھے آرہا تھا وہ ٹھہر گیا۔ بولا۔ ہم لوگ سنگل دیپ جا رہے ہیں۔ وہاں پدمنی رہتی ہے۔ سنا ہے کہ اُس کے شہر میں رات کو چراغ نہیں جلتا۔ سارا شہر اُس کے نور جمال سے جگ مگ کرتا رہتا ہے۔ اُسے دیکھنے

جارہے ہیں۔ تیرا جی چاہے تو تو بھی ہمارے ساتھ چل۔ میں نے کہا۔ مجھے پدمنی کے نور جمال سے کیا کام، میں نور الوہیت کا مشاہدہ کرتا رہتا ہوں۔ اس پر وہ پیر مرد بولا، جا اپنا راستہ لے۔ پدمنی کا روپ سروپ دیکھنا تیری قسمت میں نہیں۔ جا راستہ ناپ۔ "میں ان لوگوں کے حال پر افسوس کرتا ہوا اپنی راہ چلتا رہا۔"

مولوی صاحب نماز روزے سے فارغ تھے۔ سارا شہر انہیں بزرگ سمجھتا تھا لیکن نہ تو وہ کسی کو بیعت کرتے تھے نہ مسجد جاتے تھے۔ حد ہے کہ عید بقرعید کو بھی عید گاہ نہیں جاتے تھے۔ رمضان میں ان کا ناشتا کھانا کپڑے سے ڈھک کر بھیجا جاتا تھا۔ وہ اور علّی میاں خاموشی سے کھانا کھا لیتے تھے۔ ایک دن اس عاجز نے اپنی والدہ سے دریافت کیا کہ "مولوی صاحب نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ روزہ بھی نہیں رکھتے۔" والدہ نے کہا؟ "انہیں معاف ہے۔" میں نے پوچھا، "جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو کیا نماز روزہ مجھے بھی معاف ہو جائے گا؟" والدہ نے کہا، "خدا نہ کرے کیوں معاف ہو جائے گا۔ اللہ تمہیں ہمّت دے روزے بھی رکھتے رہنا اور نماز بھی پڑھتے رہنا۔"

مولوی صاحب نے اس عاجز کی ایک چھوٹی بہن خورشید اور چھوٹے بھائی انور کو گود لے لیا تھا۔ دونوں دن بھر مولوی صاحب کے پاس کھیلتے رہتے۔ انور تعویذوں کے کاغذوں کی گڈّی سے کاغذ نکالتا۔ قلم دان سے قلم لیتا اور کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا۔ مولوی صاحب منع نہیں کرتے تھے۔ صرف یہ کہتے، "جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو میں تمہیں تعویذ لکھنا سکھا دوں گا۔ ابھی تم مٹّی کے کھلونے بناتے رہو۔ علی میاں بھی دونوں بچوں کا بڑا لاڈ کرتے تھے۔ باقی بچوں کو گاہے گاہے گھڑکتے رہتے تھے۔

مولوی صاحب نہانے کے بڑے چور تھے یا نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی والا معاملہ تھا۔ کپڑے تو باقاعدہ بدلتے تھے۔ عطر بھی لگاتے تھے لیکن نہانے کا نام آیا اور اُن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ کوئی کہتا، "مولوی صاحب بہت دن ہو گئے آپ نے غسل نہیں فرمایا۔" مولوی صاحب کہتے، "تھوڑے دن ہی تو ہوئے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی۔ بار بار نہانے سے بدن کی چکنائی ضائع ہو جاتی ہے۔ خارش کا مرض ہو جاتا ہے۔" علّی میاں کا بھی یہی حال تھا۔ جب لوگوں کا اصرار بہت بڑھ جاتا تو مولوی صاحب للّا یا خدا بخش سے جو ہمارے پروردے تھے کہتے، "کل صبح گیارہ بجے پانی

گرم کر کے پتیلا صحن میں رکھ دینا۔"

ٹھیک گیارہ بجے اندر سے گرم پانی کا پتیلا آتا اور صحن میں رکھ دیا جاتا۔ مولوی صاحب کو بہ آواز بلند اطلاع دے دی جاتی تھی۔ "پانی تیار ہے" مولوی صاحب ہیں کہ سنی ان سنی کر رہے ہیں خوخیار ہے ہیں پانی پانی ہو رہے ہیں۔ وحید خان سے مسلسل اخبار سنے جا رہے ہیں۔ مکتب کے لڑکے لڑکیوں میں سے کسی نے گرم پانی کی یاد دلائی تو مولوی صاحب گرم ہو کر بولے، "پانی کا دف تو مرنے دو۔" پوچھنے والے نے پوچھا، "پانی میں دف...؟ کیا پانی میں بھی دف ہوتا ہے؟" مولوی صاحب نے کہا، "اتنی بات نہیں جانتے کہ کھولتے پانی میں بڑا دف ہوتا ہے، کچھ ٹھنڈا ہو جائے تو نہانا چاہیے۔" اس بحث و تکرار میں ایک بج گیا۔ مولوی صاحب اور علی میاں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ فقیرے آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ پانی ٹھنڈا پالا ہو گیا، مولوی صاحب نے کہا، "آج تو خیر دیر ہو گئی کل انشاء اللہ ضرور نہاؤں گا۔" مگر یہ کل مہینوں نہیں آتی تھی۔ گرم پانی کا پتیلا آتا اور واپس اندر چلا جاتا۔ مہینوں بعد نہانے کی نوبت آتی۔ شوکت پانی ڈالتا جاتا۔ بدن ملتا رہتا۔ مولوی صاحب کانپتے رہتے۔ جب غسل ختم ہوتا تو کپڑے بدلتے اور عطر ملتے۔ عطر وہ روزانہ ملتے تھے۔ اُن کے پاس سے خوشبو آتی رہتی تھی۔ علّی میاں بھی مولوی صاحب کے سچے پیرو تھے اور شوکت، تو غسل اُس کے نصیب میں نہیں تھا۔ اس عاجز نے شوکت کو کبھی پنڈے پر پانی ڈالتے نہیں دیکھا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ یہ عاجز مولوی صاحب کے مکتب سے نکل کر ایم اے کی منزل میں پہنچ گیا۔ ممبئی جانے کا پروگرام بنایا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت مولوی صاحب اور علّی میاں کو سلام کرنے گیا۔ عرض کیا، "ممبئی جا رہا ہوں دعا فرمایئے۔ سفر خوش گوار گزرے۔" مولوی صاحب نے حیرت سے کہا، "ایں ممبئی۔ وہ تو بہت دور ہے۔" علی میاں بولے، "مارے مارے پھرنے کا شوق ہو گیا ہے۔ ٹِک کر گھر پر نہیں بیٹھتے۔" اس موقعے پر اس عاجز نے دونوں کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے ہوئے دیکھے اور خاموش پھاٹک پر چلا گیا۔

یہاں تک بیان کرنے کے بعد پانچویں درویش نے اہل محفل پر نظر ڈالی اور بولا، "صاحبو ___ یہاں پہنچ کر آنکھوں دیکھی بھی ختم ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ چپ چاپ محفل سے اُٹھ کر باہر چلا

گیا۔

ممبئی سے کراچی۔ پاکستان۔ ایک دن والد ماجد کا نامہ گرامی موصول ہوا "مولوی صاحب اور علّی میاں دونوں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوگیا۔ کوٹھی کی رونق ختم ہوگئی۔ سونی سونی نظر آتی ہے۔۔۔

۱۷ دسمبر ۲۰۱۳ء

انور احسن صدیقی __ میرا بھائی

"آپا! آپا۔ پردہ کر لو۔ شندل آئے ہیں۔" آپا نے محبت بھری نظروں سے چھوٹے انور کو دیکھا اور کہا، "بیٹھ کر کہانیوں کی وہ کتاب پڑھو جو اسلم تمہارے لیے لائے ہیں۔" انور نے جواب میں کہا، "وہ تو میں چار پانچ دفعہ پڑھ چکا ہوں۔" آپا نے بڑی نرمی سے کہا، "تو پھر باہر جا کر مٹّی کے کھلونے بناؤ۔" مٹّی کے کھلونے بنانا انور کا خاص شوق تھا۔ باجی آپا جو تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ بھلا کیسے چپ رہتیں۔ بولیں، "شُندل۔ اگر چچا ہوں گے تو پردے کی کیا ضرورت ہے۔" انور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ مٹی کے کھلونے بنانے لگے۔ اور اس کے بعد الفاظ کے طوطے مینا بنانے لگے۔

انور ہم بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ درمیان میں تین بہنیں اقبال، خورشید اور اختر تھیں۔ پھر اکرم۔ ان کے بعد انور، جو عرف عام میں انّو کہلاتے تھے ان کے بعد ازہر عرف اجّن اور سب سے چھوٹے ارشد عرف تنّن۔ انو کو مولوی صاحب اور علی دادا نے پالا تھا۔ وہ ان دونوں کا لاڈلا تھا۔ مولوی صاحب ایک بزرگ تھے جو برسوں سے ہمارے یہاں رہتے تھے اور علی دادا ہمارے دادا کے چھوٹے بھائی تھے۔ ہم سب بھائی بہنوں نے ابتدائی تعلیم مولوی صاحب ہی سے حاصل کی تھی۔

پاکستان قائم ہوا تو میں کراچی چلا آیا۔ بھائی جان (میرے والد)، آپا (میری والدہ) اور سارے بھائی بہن فتح گڑھ ہی میں رہے۔ یہاں آکر میں نے شمس زبیری کے ساتھ مل کر بچوں کا ایک رسالہ، "میرا رسالہ" کے نام سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ پہلا پرچہ شائع ہوا تو بھائی جان کو بھی یہ رسالہ بھیجا گیا۔ کچھ دن کے بعد مجھے ایک لفافہ موصول ہوا۔ لفافے پر فتح گڑھ کی مہر تھی۔ پتا بچکانے انداز میں لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا اور میرے لیے اجنبی تھا۔ خط کھولا تو اندر سے ایک تحریر برآمد ہوئی۔ "جناب بھائی صاحب __ رسالہ مل گیا۔ بہت اچھا ہے، ایک نظم اور ایک کہانی بھیج

رہا ہوں۔ رسالے میں شامل کر لیجیے گا۔ بھائی جان اور آپا آپ کو دُعا کہتے ہیں۔ سب بھائی بہنوں کا سلام۔" یہ میرے نام انور کا پہلا اور آخری خط تھا۔ اس کے بعد روبرو اور دوبدو ہوتی رہی۔ میں نے نظم اور کہانی پر حیرت سے نظر ڈالی۔ دونوں مناسب تھیں۔ انور نے اپنا نام "انور پاکستانی" لکھا تھا۔

نظم اور کہانی چھپ گئی۔ ایک پرچہ فتح گڑھ بھی بھیج دیا گیا۔ کہانی پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ غربت اور امارت کا فرق کہانی میں بہت واضح ہے۔

یہاں سے ایک اور کہانی شروع ہوتی ہے۔ فتح گڑھ چھوٹی سی جگہ ہے سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں۔ سی آئی ڈی کا ایک کارکن جو اسکول میں بھائی جان کا شاگرد رہ چکا تھا، کبھی کبھی ان کے پاس آیا کرتا تھا۔ پرچہ فتح گڑھ پہنچنے کے بعد وہ ایک دن آیا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا، "ماسٹر صاحب! ذرا اپنے بیٹے انور پاکستانی کو تو بلا لیجیے۔" بھائی جان نے اس کا مقصد بھانپ لیا اور فرخ آبادی روکھے پن سے کہا۔ "انور پاکستانی تو یہاں کوئی نہیں ہے۔ ہاں میرا ایک بیٹا انور احسن صدیقی ضرور ہے۔ تم بھی اسے بہت دفعہ دیکھ چکے ہو۔" وہ آدمی چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگا، "ماسٹر صاحب! زمانہ بہت خراب ہے۔ احتیاط کرنا ضروری ہے۔" یہ انور پر سی آئی ڈی کی پہلی یلغار تھی جو ساری عمر جاری رہی۔

انور بچپن میں دوسرے بچوں کی طرح نہ شرارت کرتے تھے نہ آفت ڈھاتے تھے، پڑھنے لکھنے میں لگے ہیں۔ مولوی صاحب سے قصّے سن رہے ہیں۔ ایک دفعہ کے سوا بچپن میں ان پر کوئی ڈانٹ بھی نہیں پڑی۔ ہوا یہ کہ بھائی جان سنہرے پاؤڈر کا ایک ڈبا لائے۔ پاؤڈر کسی تحریر پر چھیرنا تھا۔ سب بچوں کو تاکید کی گئی کہ اسے نہ چھونا۔ انور نے نجانے کس ترنگ میں وہ ڈبا کھول لیا۔ تھوڑا سا پاؤڈر نیچے گر گیا۔ بڑی صفائی کی گئی لیکن وہ صاف نہیں ہوا۔ اب آئے بھائی جان۔ انھوں نے ڈبا جو دیکھا تو بڑے ناراض ہوئے۔ "یہ ڈبا کس نے کھولا، کس نے کھولا؟" کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب چپکے رہے۔ بھائی جان نے سب بچوں کے ہاتھ دیکھے اور انور پکڑے گئے مگر ان کی کمزور صحت کی وجہ سے انھیں ڈانٹا نہیں۔ صرف یہ کہا، "جب تمھیں کسی بات سے منع کیا جائے تو وہ کام مت کرو۔" معاملہ بخیر و خوبی رفع دفع ہو گیا۔ اگر کوئی اور بچہ یہ شرارت کرتا تو وہ ضرور مار کھاتا۔

کچھ عرصے بعد بھائی جان سب بچوں کے ساتھ کراچی آ گئے۔ انور نے چھوٹا سا فلیٹ دیکھا تو بھونچکے رہ گئے۔ انھوں نے اپنے سونے کے لیے بالکنی میں جگہ بنائی۔ لکھنے پڑھنے کے لیے باورچی خانے میں رات کو بیٹھے پڑھتے رہتے۔ بددل نہیں ہوئے۔ بچوں کی نظمیں اور کہانیاں زور وشور سے لکھتے رہے۔ بچوں کے ہر رسالے میں ان کی نظم یا کہانی نظر آنے لگی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی غیر معمولی تیز تھے۔ میٹرک کا امتحان دیا تو فرسٹ ڈویژن آئی۔

میں نے ان سے پوچھا، "اب؟" کہنے لگے، "بھیا! میں پڑھنا چاہتا ہوں" میں نے کہا، "بالکل ٹھیک ہے۔ سائنس پڑھو۔ ڈی جے کالج گھر کے بالکل پاس ہے۔ فرسٹ ڈویژن ہے سائنس میں بڑی آسانی سے داخلہ مل جائے گا۔" انور نے بڑے ادب اور انکسار سے کہا، "بھیا میں آرٹس پڑھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا، "یہ بھی ٹھیک ہے۔ ایس ایم کالج بھی گھر کے قریب ہے۔ چلو! وہاں داخلہ کرائے دیتے ہیں۔" چنانچہ وہاں داخلہ مل گیا۔ اور انور کالج اسٹوڈنٹ ہو گئے۔ کالج میں انور کا شمار بہت ہوشیار اور ذہین طالب علموں میں ہونے لگا۔

انور کالج میں داخل ہو گئے مجھے سرکاری ملازمت میں مستقبل ہو جانے کی وجہ سے "میرا رسالہ" سے اپنا نام ہٹانا پڑا۔ اب کام کون کرے؟ شمس سے مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ یہ کام انور کے سپرد کیا جائے۔ انور بچوں کے ادب کی ایک مقبول شخصیت بن چکے تھے۔ شمس رسالے کے انتظامی امور دیکھتے تھے۔ انور نے رسالہ مرتّب کرنے کا کام بڑی خوبی سے سنبھال لیا۔ بچوں کے لیے لمبی لمبی قسط وار کہانیاں لکھیں۔ نظمیں لکھیں۔ بعض اوقات وہ خود ہی پورا رسالہ مرتب کر دیتے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ انور کا ذہن پختہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ماحول، فضا ملنے جلنے اور جاننے والوں کے کرداروں کو کہانیوں میں بڑی خوبی سے بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی قدرت کے نتیجے میں انھوں نے ایک کہانی نما مضمون "ہماری گلی" لکھا اور "میرا رسالہ" میں شائع کر دیا۔

"ہماری گلی" گلی کے افراد، فضا اور ماحول کا آئینہ تھی۔ گلی میں ہر طرح کے لوگ آباد تھے۔ مختلف خاندان تھے۔ کم آمیز بھی تھے اور ملنسار بھی تھے۔ ایک خاندان ایسا تھا جو بوڑھے والدین اور شادی شدہ جوان لڑکوں پر مشتمل تھا۔ رات کے بعد اس کنبے میں تھکا فضیحتی شروع

ہو جاتی تھی۔ بوڑھے باپ ایک طرف باقی کنبہ دوسری طرف۔ سعادت مند اولاد کبھی کبھی باپ کے دو چار ہاتھ بھی رسید کر دیتی تھی اور اگر کسی دن چیخ پکار نہ ہوتی تو بڑی تیز آواز میں گرامو فون بجنا شروع ہو جاتا۔ "جمعے سے جمعرات اچھی رہے گی۔ تمہاری مرے ساتھ اچھی رہے گی۔" سارے محلے والے اس صدائے بے ہنگام سے نالاں تھے مگر دم مارنے کی ہمّت کسی میں نہیں تھی۔

ایک بوڑھا بیمار گلی میں دن بھر پڑا رہتا، بلغم تھوکتا رہتا، کھانستا رہتا۔ مغرب کے بعد گلی کے کسی طرف سے آواز آتی "کرے لا__ کرے لا۔" اور اس آواز کے ساتھ ہی بوڑھے کے منھ سے تھوک اور بلغم کے ساتھ گالیوں کا فوارہ بھی جاری ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر "کرے لا" کی آواز اور بوڑھے کی گالیاں شروع ہو جاتیں۔

انور نے ان تمام لوگوں کو "ہماری گلی" میں بڑی خوبی سے پیش کیا لیکن سخن ناشناسی نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ گلی والے ناراض ہوئے اور سب سے زیادہ گرمی کا اظہار "کرے لا" نے کیا۔ خفیہ طور پر یہ تجویز بھی ہوئی کہ موقعہ محل دیکھ کر انور کے دو چار ہاتھ مار دیے جائیں۔ ایک شریف پڑوسی سے مجھے یہ اطلاع ملی تو میں خاصا پریشان ہوا۔ پہلا کام تو یہ کیا کہ انور سے کہا، "اپنی کتابیں اور کچھ کپڑے ساتھ لو اور میرے ہمراہ چلو۔" میں انھیں ناظم آباد میں اپنی چھوٹی بہن کے یہاں لے گیا۔ نصیحت کی کہ "صرف کالج آؤ جاؤ۔ گھر کا رخ نہ کرنا۔" سوچتا رہا، کیا کروں، خاصی تشویش رہی۔ صبح حسب معمول ریڈیو گیا۔ ارمؔ لکھنوی سے ملاقات ہوئی۔ ارمؔ صاحب اپنے آپ میں گم طرزِ لکھنؤ کے آخری نمائندہ شاعر تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے، "آج آپ کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا، "جی ہاں" اور انھیں پورا واقعہ سنایا بولے، "بس اتنی سی بات ہے۔ چلیں میرے ساتھ چلیں۔" ہم دونوں بس میں بیٹھے۔ گارڈن روڈ پر پولیس لائن پر اتر گئے، اندر گئے۔ ارمؔ صاحب نے قمر رضا صاحب کا کمرا دریافت کیا اور ہم دونوں بے دھڑک اندر پہنچ گئے۔ قمر رضا صاحب سید آل رضا کے صاحبزادے تھے۔ نفیس اور شائستہ انسان تھے۔ افسوس جواں مرگ ہوئے۔ وہ ارم صاحب کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ "ارے ارم صاحب۔ آپ نے کیسے تکلیف کی؟ مجھے بلوا لیا ہوتا۔" ہم دونوں آرام سے بیٹھ گئے تو ارم صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انھیں کچھ پریشانی ہے اس لیے میں انہیں آپ کے پاس لے آیا ہوں۔"

قمر رضا صاحب نے کہا، ''آپ کی وساطت کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اپنے گھر کے مشاعروں میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ ہاں فرمائیے۔ کیا بات ہے؟''میں نے پورا واقعہ انھیں سنایا۔ انھوں نے مضمون بھی پڑھا۔ مسکرائے۔ پوچھا، ''یہ آپ کا بھائی کس کلاس میں ہے؟'' میں نے کہا، ''انٹر میں ہے'' کہنے لگے، ''یہ انشا اللہ بہت بڑا لکھنے والا ہو گا۔ بس احتیاط شرط ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے راجہ مینشن کے تھانے سے فون ملوایا اور کسی سے تحکمانہ انداز میں کہا، ''اطلاع ملی ہے کہ پاکستان چوک پر دکنی مسجد کے سامنے والی گلی میں نقص امن کا اندیشہ ہے۔ دو جوانوں کو فوراً وہاں بھیجو اور لوگوں کو متنبہ کرو کہ اگر کوئی مار پیٹ یا ہنگامہ ہوا تو قرار واقعی سزا ملے گی۔'' یہ کہہ کر انھوں نے ہم سے کہا، ''اطمینان رکھیے۔ انشا اللہ کچھ نہیں ہو گا۔ ہاں ذرا برخوردار کو بھی سمجھا دیجیے۔'' اس کے بعد ہم لوگوں نے چائے پی اور چلے آئے۔ ارم صاحب حسبِ معمول اپنے خیالات میں گم ہو گئے لیکن میں مطمئن ہو گیا۔

شام کو میں گھر واپس آیا تو محلے کے بعض بڑے بوڑھے غیر معمولی تپاک سے پیش آئے۔ سب نے کہا، ''بات کا بتنگڑ بن گیا۔ انور تو ہمارا اپنا بچّہ ہے۔'' ان لوگوں میں ''کرے لا'' بھی شامل تھے۔ خیر، رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ میں فوراً ناظم آباد گیا اور انور کو ساتھ لے آیا۔ محلے والوں نے ان کا خیر مقدم بھی کیا۔ گھر میں بھائی جان تو کچھ بولے نہیں۔ آپا نے انور کے لتّے لے ڈالے۔ ''اس دن کے لیے پڑھ رہے ہو کہ سارے گھر کو بے چین کر دو۔ کیا ضرورت تھی تمہیں ایسا مضمون لکھنے کی۔'' انور نے کہا، ''آپا! معاشرے کی اصلاح ضروری ہے۔'' آپا نے بگڑ کر کہا، ''زمین سے تو اُگے نہیں۔ چلے ہو معاشرے کی اصلاح کرنے۔'' اس وقت کسے معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب انور پر بعض دوسرے طالب علموں کے ساتھ مارشل لا کے تحت مقدمہ چلے گا۔

کالج میں انور کا شمار مقبول طلبہ میں ہونے لگا۔ مصروفیت بڑھی تو انھوں نے 'میر ارسالہ'' کو خیر باد کہا۔ طالب علموں کی سیاست میں سرگرم ہو گئے۔ انٹر کر لیا۔ بی اے میں آ گئے۔ قاعدہ یہ ہے کہ بی اے فائنل کا کوئی طالب علم کالج میگزین کا ایڈیٹر بنایا جاتا ہے۔ انور کے سلسلے میں اس قاعدے کو نظر انداز کیا گیا اور ان کی ادبی لیاقت کے پیش نظر انہیں کالج میگزین کے اردو سیکشن

کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ مگر انور تو سدا کی بے چین بوٹی تھے۔ کوئی نہ کوئی سرگرمی ضروری تھی۔

آخر کار انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل جل کر یہ فیصلہ کیا کہ ملک میں طالب علموں کا کوئی رسالہ نہیں ہے۔ طالب علموں کے ایک رسالے کی اشاعت ہونا چاہیے۔ کام شروع ہو گیا۔ 'لوح و قلم' نام تجویز ہوا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے رسالے کی سرپرستی منظور کر لی۔ فیض صاحب بھی سرپرست بننے پر تیار ہو گئے۔ قلاش اور مفلس طلبہ نے سر گاڑی پیر پہیہ ایک کر دیا۔ نجانے کیا کیا جتن کیے۔ ڈیکلریشن حاصل ہو گیا۔ لڑکے اور لڑکیاں مضمون، افسانے ، غزلیں اور نظمیں لکھنے لگے۔ شہر بھر میں غلغلہ ہو گیا__ پہلا شمارہ شائع ہو گیا اور نئے لکھنے والوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہونے لگی جس نے طلبہ تحریک کی رہ نمائی کا فریضہ انجام دیا۔ مجھے اب بھی بعض لکھنے والوں کے نام یاد ہیں۔ محفوظ الہ آبادی تھے۔ جواں مرگ ہوئے، اگر زندہ رہتے تو دوسرے احتشام حسین ہوتے۔ افسانہ نگار یاسین معصوم تھے جو بعد میں سفر نامہ نگار ہو گئے۔ مسعود جعفری تھے، امراؤ طارق، زاہدہ تقی تھیں، سعیدہ گزدر اور ملکہ حسین تھیں۔ طالب علم ادیبوں اور شاعروں کا ایک پورا گروہ بن گیا تھا۔

انور کی سرگرمیاں تیز ہو رہی تھیں کہ سب لوگ پاپوش نگر منتقل ہو گئے۔ یہاں ہر وقت انور کے دوستوں کی آر جار رہتی تھی۔ بار بار چائے بنتی رہتی لیکن آپا اور خورشید چائے بناتے بناتے تھکتی نہیں تھیں۔ یہاں آنے والوں میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے طلبہ میں سبھی تھے حسن ناصر شہید بھی تھے جو ایک دفعہ رات کو آئے اور ساری رات باتیں کرتے رہے۔ اور بہت سے آتے جاتے رہے لیکن حکومت نے مارشل لا کے تحت انور اور بہت سے دوسرے طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ کراچی جیل میں نظر بند کر دیا۔ گرفتار شدہ طلبہ سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی گیر و دار میں "لوح و قلم" پر بھی پابندی لگ گئی۔ "جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی۔"

انور رہا ہوئے تو پھر تعلیم اور سیاسی سرگرمیاں__ ایم اے میں داخلہ لیا۔ حسبِ معمول مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے کہا، "انگریزی میں ایم اے کرو۔ بہت اچھے رہو گے۔" انھوں نے بڑے ادب سے کہا، "بھیا! مجھے فارسی زبان بہت پسند ہے۔ میں فارسی میں ایم اے کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا، "تم جس مضمون میں ایم اے کرو گے نمایاں رہو گے۔" چنانچہ انور نے

فارسی میں ایم اے اوّل بدرجہ اوّل کر لیا۔

ایک دن شعبہ فارسی کے صدر ڈاکٹر غلام سرور نے جو میرے بزرگ کرم فرما تھے، یونیورسٹی میں مجھ سے کہا، "ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کا بھائی تو کچھ سر پھرا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم نے فارسی میں ایم اے اوّل بدرجہ اوّل کر لیا ہے۔ میں تمھیں تعلیمی وظیفہ دلائے دیتا ہوں۔ تم تہران چلے جاؤ اور پی ایچ ڈی کر آؤ۔ آپ جانتے ہیں انھوں نے کیا جواب دیا۔ کہنے لگے، سر، میں ایسے ملک میں جانے کے لیے ہر گز تیار نہیں جہاں شہنشاہی اپنی بدترین شکل میں عوام کا استحصال کر رہی ہو۔ (یہ رضاشاہ کا دور تھا)۔ "اب آپ ہی بتایئے۔ میں کیا کہتا۔ چپ ہو گیا۔ میں نے کہا، "یہی جواب وہ مجھے بھی دے چکے ہیں۔"

پاپوش نگر سے ہمارا خاندان 'دست گیر' منتقل ہو گیا۔ یہ بہتر مکان تھا لیکن یہاں انور کی دوسری گرفتاری عمل میں آئی۔ اس دفعہ معاملہ سخت تھا۔ دس طالب علموں پر ہنگامہ آرائی اور حکومت کے خلاف نعرے بازی کا سنگین الزام تھا۔ کلفٹن میں ایک فوجی عدالت قائم کی گئی۔ عدالت کا اجلاس ہوتا رہا۔ طلبہ اور عوام عدالت کے باہر جمع رہتے تھے۔ عدالت کے کمرے میں جانے کی اجازت کسی کو نہیں تھی۔ عدالت کی کارروائی دیکھنے والے باہر لان پر بیٹھے رہتے تھے۔

طلبہ نے ایک دن یہ غضب کیا کہ آپا کو بہلا پھسلا کر عدالت لے گئے۔ آپا نے انور کی ایک جھلک دیکھی۔ بالکل خاموش رہیں۔ صرف یہ کہا، "میرے بیٹے ظلم کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔" انور نے بھی آپا کو دیکھ کر نظریں نیچی کر لیں۔ بھائی جان کسی سے کچھ کہے سنے بغیر عدالت گئے اور وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر خاموشی سے واپس آ گئے۔ انھوں نے ہم میں سے کسی کے سامنے اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بہت صابر انسان تھے۔

انور اور ان کے ساتھیوں کو سزا ہو گئی۔ کچھ طالب علم بہاولپور جیل بھیجے گئے۔ کچھ ملتان جیل میں رکھے گئے۔ انور ملتان بھیجے گئے۔ جیل میں قیدیوں اور جیل کے افسروں نے اسیر طلبہ کے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کیا۔ انور نے اپنی خود نوشت "دل پُر خوں کی اک گلابی سے" میں سارے واقعات بڑے دل چسپ انداز میں قلم بند کیے ہیں۔ یہ اسیری انور کے صبر و ضبط، سیاسی بصیرت اور عزم و استقلال کی پختگی میں بہت کام آئی۔

انور کی یہ قید سردیوں کے موسم میں ہوئی تھی۔ آپا کو یہ پریشانی تھی کہ ملتان میں سردی بہت ہوتی ہے۔ بچہ سردی میں ٹھٹھرتا ہوگا۔ کیا کیا جائے۔ آخر کار اکرم ایک عدد لحاف لے کر کراچی سے ملتان گئے۔ جیل والوں نے لحاف واپس کر دیا اور کہا" یہاں سردی کا انتظام ہے۔"

انور قید میں تھے کہ ہمارے خاندان والے پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکان بڑا اور بہتر تھا۔ انور کو اطلاع دے دی گئی کہ سب لوگ پیر کالونی کے مکان نمبر ۱۸۷۰ میں منتقل ہو گئے ہیں لیکن انور کو اس مکان کی جائے وقوع معلوم نہیں تھی۔

آخر کار سزا ختم ہوئی، انور رہا ہو کر رات کے وقت کراچی پہنچے۔ مکان کی جائے وقوع کا اندازہ نہیں تھا۔ رات کا وقت۔ اس مشکل کو ان کے جیل کے ایک ساتھی علی مختار رضوی نے حل کیا۔ انھوں نے کہا تم اور جوہر حسین دونوں میرے ساتھ میرے گھر چلو، رات وہاں گزارو، صبح چلے جانا۔ جوہر حسین کو مکان نمبر ۱۸۷۰ کی جائے وقوع معلوم تھی۔ انھوں نے کہا، "میں صبح تمہیں پہنچا دوں گا۔" رات کو یہ دونوں علی مختار رضوی کے یہاں رہے۔ یہاں ان لوگوں کے آنے سے جشن کا سماں ہو گیا۔ صبح انور اور جوہر حسین دونوں بس میں بیٹھے اور پیر کالونی پہنچے۔ جوہر حسین انور کو مکان دکھا کر چلے گئے۔ انور نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ فجر کا وقت تھا۔ اکرم آنکھیں ملتے ہوئے دروازے پر آئے تو ہکا بکا رہ گئے۔ سامنے انور کھڑے تھے۔ سارے گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آپا نے فوراً شکرانے کے نفل ادا کیے۔ ذرا سی دیر میں گھر میں عید کا سماں ہو گیا۔ عزیز، پیارے، ملنے جلنے والے ہار پھول، گُل دستے، مٹھائی لیے چلے آ رہے ہیں اور انور ہیں کہ دولہا بنے سب کو جیل کے قصے سنا رہے ہیں۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ یہ تھا کہ اب کریں کیا؟ ہر دروازہ بند۔ ایک مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ پھر ایک کالج میں پڑھانے لگے۔ دونوں جگہ مالکوں کی منافع خوری اور چاپلوسی کے ماحول سے گھبرا کر انور نے کہیں بھی اپنی گزر نہیں دیکھی۔ خاموشی سے علیحدہ ہو گئے۔

سیاست میں زیادہ زور و شور سے حصہ لینے لگے۔ نیشنل عوامی پارٹی کے سرگرم کارکن بن گئے۔ مولانا بھاشانی، ولی خان، محمود الحق عثمانی سب کے ساتھ ساتھ اور کالم نگاری، ترجمے کا کام اور

شعر و شاعری جاری

یہ سارے کام جاری تھے کہ روسی سفارت خانے نے ایک اردو رسالے کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ انور مدیر منتخب ہوئے۔ رسالے کا نام "طلوع" رکھا گیا۔ انور نے طلوع کو مطلع انوار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بڑی محنت کی۔ دانش عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ یہ رسالہ بہت مقبول ہوا۔ انور کے حالات بھی سدھر گئے۔ حالات سدھرے تو انھوں نے دو کام کیے۔ ایک تو یہ کہ الہلال سوسائٹی میں مکان بنوالیا۔ سبزی منڈی کے سامنے یہ مکان پیر کالونی سے بھی قریب تھا اور یونیورسٹی سے بھی جہاں میرا قیام تھا بہت دور نہیں تھا۔ اکثر راتوں کو سارا خاندان یہیں جمع ہوتا تھا اور وی سی آر پر فلمیں دیکھی جاتی تھیں۔

دوسرا کام انھوں نے یہ کیا کہ شادی کر لی۔ ریحانہ صرف اُنھی کی پسند نہیں تھیں، سب کی پسند تھیں۔ متین بردبار، سلیقہ مند اور مرنے بھرنے میں انور کی ساتھی۔ شادی کالونی کے مکان سے ہوئی تھی۔ بڑا بھا گوان گھر تھا۔ اکرم کی شادی بھی وہیں سے ہوئی۔ انور کی شادی بھی وہیں سے ہوئی، ارشد کی شادی بھی وہیں سے ہوئی۔ دو ایک عزیزوں اور انور کے دو ایک دوستوں کی شادی بھی وہیں سے ہوئی۔ نئے مکان پہنچ کر انور نے موٹر بھی خرید لی تھی۔ موٹر چلانے میں ان کا ایک خاص انداز تھا۔ پیچھے کی طرف ٹکے ہوئے، گنگناتے اور گاتے، ٹکے گز کی چال سے گاڑی چلاتے تھے۔ ایک دن جب سب گھر والے جمع تھے۔ کسی نے اکرم سے پوچھا، "اکرم! تم اپنی گاڑی میں انور کے گھر سے کالونی کتنی دیر میں پہنچ جاتے ہو؟" اکرم نے کہا، "زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں۔" سوال کرنے والے نے پوچھا، "اور انور؟" اکرم نے کہا، آدھے گھنٹے میں۔ "وہ کیوں؟" "گاڑی تھوڑی چلاتے ہیں، چہل قدمی کرتے ہیں۔"

یہ ساری باتیں بڑی سکون بخش اور پُر آسائش تھیں لیکن وہ جو مومن خان مومن نے کہا ہے کہ "آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا۔" تو آسمان نے اپنا رنگ بدل دیا۔ "طلوع" بند ہو گیا۔ عملہ فارغ کر دیا گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ روسی سفارت خانے نے عملے کا سارا پراویڈنٹ فنڈ ادا کر دیا۔ انور کے حصے میں خاصی رقم آئی۔ اب کیا کریں؟ لوگوں سے مشورہ کرتے رہے۔ کسی نے سمجھایا کہ کورنگی میں کرگھے لگالو___ کرگھوں کا ریشمی کپڑا دساور جاتا ہے۔ بڑے منافعے سے فروخت ہوتا

ہے۔ یہ کام کرو گے تو بڑے فائدے میں رہو گے۔

انور کی عادت تھی کہ اس قسم کے کام کرنے سے پہلے وہ ایک جائزہ رپورٹ مرتب کرتے تھے۔ ہر پہلو پر غور کرتے تھے۔ ہر شق پر مہارت حاصل کرتے تھے۔ پھر دل جمعی سے کام کرتے تھے۔ مکان بنوانے کے سلسلے میں انھوں نے فن تعمیر میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ رشتے دار اور عزیز پیارے ان سے مشورہ کرتے تھے۔ کرگھوں کا کام شروع ہو گیا۔ کچھ دن خیر و عافیت رہی۔ پھر نجانے کیا افتاد پڑی کہ کرگھوں کے کپڑے کی برآمد پر پابندی لگ گئی، سارا کیا دھرا اور سرمایہ خاک میں مل گیا۔

انور نے ہمّت نہیں ہاری، دوستوں اور عزیزوں نے مشورہ دیا کہ موٹر رکشا خرید لو۔ چلانے والے خود تمہارے پاس آئیں گے، اچھا کاروبار ہے۔ انور نے فوراً جائزہ رپورٹ تیار کی اور دو چار رکشے ان کے دروازے پر کھڑے نظر آنے لگے۔ مگر کہاں لکھنا پڑھنا، کالم نگاری، تراجم کرنا، شعر کہنا، نظمیں لکھنا اور کہاں رکشا ڈرائیوروں سے نپٹنا۔ آج یہ ٹوٹ گیا، کل یہ پہیہ خراب ہو گیا، کبھی کوئی حادثہ ہو گیا، کبھی پولیس والے پکڑ لے گئے۔ ہم لوگوں نے سمجھایا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تم لکھنے پڑھنے والے آدمی کس چکر میں پھنس گئے۔ ایک دن انور نے سارے رکشے اونے پونے بیچ دیے اور لکھنے پڑھنے کے کام میں لگ گئے۔ ایک روزنامے کی ادارت کرتے رہے، کالم لکھتے رہے۔ ترجمے کرتے رہے۔ افسانے لکھتے رہے۔ ناول لکھتے رہے۔ 'اخبار جہاں' میں ان کی کئی طویل کہانیاں شائع ہوئیں۔ 'ایک خبر ایک کہانی' کے عنوان سے افسانوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو کتابی صورت میں شائع بھی ہوا۔ آٹھ مقبول ناول لکھے، جو لاہور سے شائع ہوئے۔ جب وہ کوئی ناول لکھتے تو اشاعت کے بعد میرے بڑے بیٹے آصف کو دے دیتے تھے کہ مجھے پہنچ جائے گا۔ میں ان کا ناول پڑھ لیتا اور پھر ان سے بات کرتا۔ دو ناول خاص طور پر قابل توجہ تھے۔ ایک اغوا کے موضوع پر تھا۔ ہمارے معاشرے میں جاری انسانیت سوز ظلم کا پردہ چاک کرنے کی بڑی کامیاب کوشش تھی۔ دوسرا ناول اعضائے انسانی کی غیر قانونی منتقلی کے حوالے سے لکھا گیا تھا اور ان درندہ صفت انسانوں کے کرتوتوں کو واضح کیا گیا تھا جو گروہ در گروہ بڑے منظم طریقے پر یہ کام کرتے ہیں اور ان کی کوئی پکڑ دھکڑ نہیں ہوتی۔

HaSnain Sialvi

ایک اور ناول کراچی کی معاشرتی ترقی اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے معاشرتی رویّوں کے حوالے سے تھا۔ میں نے جب یہ ناول پڑھا تو مجھے ایک فرانسیسی ناول نگار جارجز سیمنون کا ناول LITTLE SAINT یاد آیا۔ سیمی نون نے اس ناول میں پیرس کے بدلتے ہوئے معاشرتی حالات اور رویّوں کی بڑی خوب صورت عکّاسی کی ہے۔ میں نے جب انور کو یہ بات بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

انور کے مزاج میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جذبہ تھا۔ الہلال سوسائٹی میں رہتے رہتے انھوں نے دوسرا بڑا مکان بنوانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مکان سبزی منڈی کے بالکل سامنے ہے۔ منڈی میں رات دو بجے سے کام شروع ہو جاتا ہے اور صبح تک غل غپاڑا رہتا ہے۔ یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے حسب عادت ایک جائزہ رپورٹ مرتب کی۔ 'الہلال' والے مکان میں اوپری دل سے ایک عارضی اوپری منزل تعمیر کرائی۔ نیچے کی منزل کرائے پر دے دی۔ پلاٹ ڈھونڈنے لگے۔ خدا خدا کر کے ایک پلاٹ تلاش کر لیا۔ اللہ میاں کے پچھواڑے۔ صفورا گوٹھ سے آگے۔ سب نے منع کیا سمجھایا، اتنی دور مکان مت بنواؤ۔ میں نے بھی منع کیا۔ انھوں نے حسبِ معمول بڑے انکسار اور ادب سے کہا، ''بھیا، وہاں کی فضا بڑی صاف ستھری ہے۔ ہوا اور ماحول میں آلودگی نہیں ہے۔ جا کر دل خوش ہو جاتا ہے۔'' میں خاموش ہو گیا۔ انھوں نے الہلال والا مکان فروخت کر دیا۔ عارضی قیام کے لیے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور پوری تندہی سے تعمیری کام میں جُٹ گئے۔ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے رہے۔ مکان بھی بنتا رہا۔ چاہتے تھے کہ مکان بڑا ہو، خوش نما ہو، مضبوط ہو، ہر چیز نکھ سے سکھ درست ہو، مکان بن گیا۔ واقعی شاندار تھا، خوش نما تھا، دہرے دہرے دروازے تھے۔ ٹائل بڑے خوش نما تھے۔ پلاسٹر بہت عمدہ تھا۔ اس مکان کی مناسبت سے انھوں نے ایک بڑی گاڑی بھی خرید لی تھی اور حسبِ معمول صبح دس بجے سے شام کے چار بجے تک لکھنے کے کام میں مصروف رہتے تھے۔

انور نے ترجمہ و تالیف کا خاصا کام کیا ہے۔ ''فرہنگ اصلاحات بینکاری'' کی ترتیب میں وہ محمد احمد سبزواری اور میرے ساتھ تھے۔ خوب کام کیا۔ مختلف کتابوں کے ترجمے کئے۔ ڈاکٹر عشرت حسین کی انگریزی کتاب جو پاکستانی معیشت سے متعلق ہے ترجمہ کی، انجمن ترقی اردو نے

اسے شائع کیا۔ دوستوں کے خاکے لکھے اور بعض بعض کے بہت اچھے لکھے۔ کوئٹہ سے شائع ہونے والے ڈاکٹر شاہ محمد مری کے رسالے "سنگت" میں برسوں "ارسلان کے نام" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ آخر میں روزنامہ "ایکسپریس" میں کالم لکھتے تھے۔ اپنی خودنوشت مرتب کی۔ یہ خودنوشت کراچی کے طلبہ کی سیاسی تحریک اور بعض دوسرے اہم واقعات کی بڑی اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے لیے آصف انھیں مسلسل اکساتے رہے، زور دیتے رہے۔ انور اس زمانے میں ایک بڑی موذی بیماری کا شکار ہو چکے تھے لیکن انھوں نے ہمّت کر کے کتاب مرتب کر دی۔ اپنی اس کاوش کے بارے میں انھوں نے بڑے عزم کے ساتھ لکھا تھا! "میں بہر حال آج بھی اپنے اس منصب کو اسی طرح پورا کرنے میں لگا ہوا ہوں جس کا آغاز میں نے سن ۵۰ء میں کیا تھا۔ آج بھی میرے ہاتھوں میں قلم متحرک ہے اور جب تک انگلیوں میں جان باقی ہے تب تک یہ قلم اسی طرح متحرک رہے گا۔ اور میرے خونِ دل کی بوندیں اس سے ٹپک ٹپک کر صفحۂ قرطاس پر بکھرتی رہیں گی۔" آخری وقت تک لکھنے کی ہمت کا اظہار کرنے والا اپنی خودنوشت خود نہ دیکھ سکا۔ بڑی کوشش ہوئی۔ آصف نے بڑی بھاگ دوڑ کی لیکن کتاب انور کی وفات کے بعد ہی شائع ہو سکی۔

انور بہت محنتی اور ہر کام وقت پر کرنے کے قائل تھے۔ جاڑے، گرمی، برسات، صبح سویرے ٹہلنے جاتے تھے۔ سخت سردی ہے مگر انور اونی ٹوپی پہنے، مفلر لپیٹے، ٹہلتے چلے جا رہے ہیں۔ صبح دس بجے لکھنے کے لیے بیٹھ گئے اور شام کے چار بجے تک مسلسل کام میں لگے رہے۔ دوپہر کا کھانا وہ چار بجے شام کو کھاتے تھے۔ اس باقاعدگی کی وجہ سے انھوں نے بہت کام کیا۔ انھیں بڑی اور اعلیٰ چیزوں کا شوق تھا۔ مکان بنوایا تو سنگین اور خوش نما، موٹر خریدی تو ڈھپّو ڈھکیل۔ سب نے منع بھی کیا مگر انھوں نے وہ بڑی گاڑی خرید لی جو آج بھی ان کے گیرج میں خاموش کھڑی ہوئی ہے۔ لباس بہت اچھا پہنتے تھے۔ مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید یہ بچپن اور لڑکپن کی محرومی کا ردِ عمل تھا۔

لباس کے معاملے میں اکرم ان کے مشیر خاص تھے۔ کوئی کپڑا سلوانا ہو یا خریدنا ہو تو اکرم کو ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک دن انور ایک قمیص خریدنا چاہتے تھے۔ اکرم کو کوئی کام تھا۔ انھوں

نے ساتھ جانے سے منع کر دیا اور کہا، ''اب تم ماشاءاللہ سمجھ دار ہو۔ اپنے کام خود کیا کرو۔'' یہ سن کو انور فوراً صدر دوڑ گئے۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آئے تو بڑے خوش کہنے لگے، ''بڑی عمدہ قمیص لایا ہوں۔'' تھیلی میں سے نکال کر دکھائی۔ آپا نے کہا، ''اے ہے، یہ کیا اُٹھالائے اس میں تو تم جیسے دو آدمی سما جائیں گے۔'' سب ہنسنے لگے۔ انور نے کہا دکاندار نے کہا تھا، ''چھوٹی بڑی ہو تو بدل لینا۔'' میں ابھی بدل کر لاتا ہوں۔'' کوئی ایک گھنٹے کے بعد منھ لٹکائے واپس آئے۔ بولے، ''اس ناہنجار نے قمیص بدلنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا، ''میاں چیز دیکھ بھال کر خریدا کرو۔'' سب ہنسنے لگے۔ انور بہت کھسیائے۔ ان کی یہ سادہ لوحی ہمیشہ قائم رہی۔ لیکن معاملات ومسائل حاضرہ اور دانش عصر کے حوالے سے خاندان بھر میں ان کی رائے بہت اہم سمجھی جاتی تھی۔ بے لاگ رائے دیتے تھے اور بڑے اعتماد سے بات کرتے تھے۔ ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنی جاتی تھیں۔

انور پر بڑے بڑے سخت وقت آئے، جیل میں رہے، لڑکپن میں بیماری جھیلی، مالی اعتبار سے خاندانی تنگی ترشی کا شکار رہے لیکن ان کے عزم وہمت اور طبیعت کی جولانی میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت، اپنی دنیا میں مگن اور اپنے کام میں محو۔ بیکاری میں بھی گنگناتے اور ہنستے رہے۔ نامساعد حالات کا گلہ نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار کی جگہ نکلی۔ اشتہار شائع ہوا۔ انور نے بھی درخواست دی۔ وہ فارسی اور اردو دونوں میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھے۔ وائس چانسلر اپنا آدمی لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے انور سے دریافت کیا کہ خواجہ میر دردؔ کے دیوان میں کتنے اشعار ہیں؟ انور نے کہا، ''میں نے اردو شاعری کا مطالعہ شعرا کے اشعار کی تعداد سے نہیں کیا۔ ان کے کمالات فکر وفن کی روشنی میں کیا ہے۔ شعرا کے اشعار کی تعداد کا شمار نہیں کیا جاتا۔ غالب اور اقبال کے اشعار بھی گنے نہیں گئے۔'' انٹرویو اس سوال جواب پر ختم ہو گیا۔ انور نے انٹرویو سے آکر مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی۔ صرف یہ کہا، ''میں نہیں لیا گیا۔'' پھر انھوں نے سارا واقعہ سنایا لیکن کسی تاسف اور ملال کے بغیر ہنس ہنس کر سب کو یہ واقعہ سناتے رہے۔

انور معاملات ومسائل اور لین دین میں صاف ستھرے آدمی تھے۔ ''نہ کسی کو کڑی کہی

ہم نے + نہ کسی کی کڑی اٹھائی بات" کرگھوں اور رکشوں میں بڑا نقصان اُٹھایا لیکن ہنستے رہے۔ کسی گھر والے کو نقصان کی تفصیل نہیں بتائی۔ یہ ان کا مزاج تھا۔ اپنے دکھ اپنے ساتھ، نہ کبھی کسی کا احسان گوارا کیا۔

میرا اصرار تھا کہ وہ اپنا شعری مجموعہ مرتب کرکے شائع کردیں۔ ان کی ساری شاعری کاغذوں اور رسالوں میں الجھی ہوئی ہے۔ بچوں کی نظمیں زیادہ تر غارت ہو گئیں کیونکہ انور نے انھیں سنبھال کر نہیں رکھا۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی تو میں تقاضا کرتا "وہ تمہارا مجموعہ؟" انور کہتے، "ہاں بس تیار ہے۔ چند دن کی دیر ہے۔" یہ دیر طولانی ہوتی گئی۔ ایک آدھ دفعہ میں نے دبی زبان سے کہا، "اگر کوئی مالی دشواری ہے تو بتاؤ میں بڑی خوشی سے تمہارا مجموعہ شائع کر دوں گا۔" انھوں نے بڑی لجاجت سے کہا، "نہیں بھیا! کوئی مالی دشواری نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی فرصت درکار ہے۔" وہ تھوڑی سی فرصت ان کی زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ شاید یہ ہماری خاندانی روایت ہے۔ میرے والد نے اپنا مجموعہ نہ مکمل کیا نہ شائع کیا۔ یہی صورت حال میرے ساتھ بھی ہے۔ نثر کی کتابیں شائع ہوئیں لیکن نظم کا نمبر نہیں آیا۔ نہ غزلیں اور نظمیں یکجا ہوئیں۔ مرحوم دوست یعقوب لطیف نے کیا کیا اصرار کیا پر طبیعت ادھر نہیں آئی۔

جب ہم سب کسی کے یہاں جمع ہوتے، زیادہ تر کالونی کے مکان میں یا انور کے یہاں، کبھی کبھی میرے یہاں تو بڑا اُدھم مچتا، کھانے وانے سے فارغ ہو کر بھائی جان اٹھ کر چلے جاتے اور میدان صاف ہو جاتا تو ہنسی دل لگی شروع ہو جاتی، انور اس میں پیش پیش رہتے۔ بھائی جان کے پیٹھ موڑتے ہی مسکراکر سب کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھتے۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے۔ ایک کاغذ نکالتے اور نمکین غزل شروع ہو جاتی "دل فرید آباد میں ___ دلبر فرید آباد میں" سب لڑکیاں مل کر "دل فرید آباد میں ___ دلبر فرید آباد میں" گانے لگتیں۔ اشعار میں خاندان والوں کی طرف ہلکے پھلکے اشارے ہوتے۔ غزل ختم ہوتے ہی اکرم پینترا بدلتے۔ اجّن کی طرف دیکھتے۔ مسکراتے (اجن کا ہم بھائیوں میں چوتھا نمبر ہے، ذہنی حالت کسی قدر کمزور ہے)۔ اجن اشارہ سمجھ لیتے اور پوچھتے۔ انّو! یہ انور حیدری جو تمہارے پاس ہر وقت ڈٹے رہتے ہیں۔ ارے وہی جنھیں سب جنوری فروری کہتے ہیں۔ (انور حیدری کی ایک ٹانگ دوسری سے ذرا چھوٹی تھی)، ہاں تو وہ

تمہارے کون لگتے ہیں؟" انور گھر ک کر کہتے، "چپ رہو۔" مگر اکرم ان کی مدد کرتے۔ ریحانہ کی طرف دیکھتے جاتے اور کہتے، "ہیں کون؟" ارے ان کے ساڑھو ہیں۔" بڑے زور کے قہقہے لگتے۔ ایک دن قہقہے ختم ہوئے تو آپا نے مجھ سے کہا، "اسلم! یہ اجّن، ہمیں "حاجی جی" کہتا ہے۔" میں مصنوعی ہنسی ہنستا اور پھر اجن کو ڈانٹتا، "کیوں بھئی اجن یہ کیابات ہے؟" اجن چپکے رہتے تو آپا کہتیں، "اس نے سب کے نام رکھ چھوڑے ہیں۔" میں پوچھتا، "کیوں بھائی، انور کا کیا نام ہے؟ نہیں نہیں کوئی نہیں۔ ذرا سے اصرار کے بعد قبولتے، ان کا نام "لو کھڑا" ہے۔ اور اکرم کا؟ من مالی دھیّاں دھیّاں۔ اور میرا کیانام رکھا ہے؟ نہیں۔ نہیں۔ تمہارا کوئی نام نہیں رکھا۔" ارے بتاؤ تو سہی" کچھ شرماتے کچھ مسکراتے اجن کہتے۔ تمہارا نام جمّن ہے۔ پھر قہقہہ لگتا۔ انور کہتے "چپ رہو۔ بک بک نہ کرو۔" کوئی بچہ آواز لگاتا۔ "انو چچا، پٹھانی لودھ" سارے بچے مل کر صدا لگاتے۔ انو چچا پٹھانی لودھ۔" انو، یہ نعرہ سن کر نہال ہو جاتے کیونکہ یہ نعرہ تو خود انھوں نے بچوں کو سکھایا تھا۔ آپا چلاتیں، "اے ہے یہ کیا، فضول باتیں کرتے ہو؟ بچے کہتے، انو چچا نے سکھایا ہے۔ انو مسکراتے رہتے۔ وقفے وقفے سے پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے۔

اکرم، انور، اجن، ارشد سب مل کر صدا لگاتے

یتیموں کی فریاد سن لیجیے
یہ غم کی ہے روداد سن لیجیے
ہوئے جب سے ماں باپ ہم سے جُدا
ہمارا وہ سب عیش جاتا رہا

آپا بگڑ کر کہتیں، "کیوں ہمیں کوس رہے ہو، شرم نہیں آتی۔" اس پر رنگ بدل جاتا، آواز لگتی، "آٹا روپے کا چار سیر، آٹا روپے کا چار سیر" (آج یہ فقرہ لکھتے ہوئے میرا قلم کانپ جاتا ہے) اور پھر اس کے بعد دوسری آواز "آگیا، آگیا، صبح کا تازہ اخبار،" یہ صدائیں بہت دیر تک چلتی رہتیں، کچھ اور نقلیں ہوتیں۔ پھر ڈرامے کا دوسرا سین شروع ہوتا۔ تنّن ٹہلتے ہوئے باجی آپا کے پاس جاتے۔ انھیں گود میں اٹھاکر کسی دوسری جگہ رکھ دیتے۔ سب لوگ "اللہ خیر۔ اللہ خیر" کی آوازیں لگاتے رہتے۔ اب تنّن اور اجن خورشید کی طرف متوجہ ہوتے۔ خورشید ان کا ارادہ بھانپتے

ہوئے اجن سے کہتیں، "یہ سب لوگ چلے جائیں تو تمھیں "اللہ خیر" سکھائیں گے۔" اجن تھوڑی دیر کو چپ ہو جاتے۔ پھر انور اشارہ کرتے۔ اجّن اٹھتے۔ خورشید کے پاس جاکر زور سے کہتے، "بُدھا۔ بُدّھا۔" بڑے قہقہے لگتے۔ اب یہ سب باتیں ایک سہانا خواب معلوم ہوتی ہیں۔

ہمارے ایک دور پرے کے عزیز شکل صورت، وضع قطع اور حلیے سے قوال معلوم ہوتے تھے۔ انو اور اکرم نے مل جل کر ان کا نام 'منّے آزاد'، قوال رکھا۔ ان کی نقل ہوتی۔ جب کبھی وہ آتے تو انور قوالی کا ذکر چھیڑتے۔ آج کل کہیں قوالی نہیں ہو رہی۔ وہ کہتے، "میاں۔ وہ وقت گزر گیا۔ اب سیاسی جلسے ہوتے ہیں۔" انور بڑی معصومیت سے کہتے، "فرخاباد میں تو خوب قوالیاں ہوتی تھیں۔ منّے آزاد محفل لوٹ لیتا تھا۔" وہ عزیز کچھ دیر سوچتے، پھر کہتے، "فرخاباد" میں منّے آزاد تو کوئی نہیں تھا۔" "واہ تھا کیوں نہیں۔ کوٹھی میں اس کی قوالی ہوئی تھی۔ میں نے بچپن میں سنی تھی۔ منّے آزاد کی نقل بڑی زور دار ہوتی تھی۔ انور نے ان کے بارے میں کئی نظمیں لکھی تھیں۔ لڑکیاں مل کر گاتی تھیں۔

آخر آخر میں انور ریحانہ کی طرف دیکھتے۔ مسکراتے اور سب سے پوچھتے، "یہ جو لوہے کا ایک بڑا سا برتن ہوتا ہے جس میں کنڈا لگا ہوتا ہے، پانی بھرنے کے کام آتا ہے، اسے کیا کہتے ہیں؟" کوئی کہتا، "اتنی سی بات نہیں جانتے؟ بالٹی کہتے ہیں۔" انور ریحانہ کی طرف دیکھتے جاتے، مسکراتے جاتے۔ "ہمارے یہاں اسے بالٹے کہتے ہیں۔" ریحانہ ہنستی رہتیں۔ انور انھیں ادبدا کے چھیڑتے رہتے مگر وہ اللہ کی بندی ہنستی ہی رہتی، مجال ہے جو چہرے پر کوئی شکن آجائے۔

انور کسی بھائی بہن سے کبھی ناراض نہیں ہوتے۔ بھائی بہنوں میں بحث تکرار ہوتی رہتی ہے۔ بول چال بند ہو جاتی ہے۔ لیکن انور کسی سے نہیں لڑے۔ بھائیوں میں مَیں اور اکرم ان سے بڑے تھے۔ اجن اور تنن ان سے چھوٹے تھے۔ تینوں بہنیں ان سے بڑی تھیں۔ انھوں نے بڑوں کی بڑائی کا بھرم رکھا۔ چھوٹوں سے بے تکلف رہے۔ انھوں نے مجھے یا آپا بھائی جان کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیا۔ خاندان کے سارے بچے ان سے بہت مانوس تھے۔ "ہاں بھئی آصف! ذرا جلدی جلدی کہو "تو تپلی بتّی بٹ لا۔ تو بٹ لا تپلی بتّی۔" اور آصف یہ فقرہ جلدی جلدی کہنے میں لڑکھڑاتے تو انور خوب ہنستے۔ ادھر کسی کو سوتے دیکھا اور فوراً انگلی پر کاجل لگا کر اس کی

ڈاڑھی مونچھیں بنادیں۔ وہ سو کر اٹھا تو سب اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ کسی نے کہا، "ذرا آئینہ تو دیکھو۔" پھر اور زیادہ ہنسی ہوتی۔ گھریلو محفلوں میں انور کا چہکنا سب کو اچھا لگتا تھا، سب انھیں بلبل ہزار داستاں سمجھتے تھے۔ جب تک وہ محفل میں نہیں آتے تھے۔ محفل سونی سونی رہتی تھی۔

ہمارے پردادا نے ۱۸۵۷ء کے بعد ایک پریس قائم کیا تھا۔ یہ ہمارا خاندانی کام بن گیا، سب لڑکوں کو خوش نویسی سکھائی جاتی تھی۔ میرے دادا اور ان کے سب بھائیوں نے خوش نویسی سیکھی۔ پھر میرے والد اور ان کے چچازاد بھائیوں کو خوش نویسی کی مشق کرائی گئی۔ میں نے بھی خوش نویسی سیکھی۔ انور کو بھی مولوی صاحب نے خوش نویسی کے فن سے آگاہ کیا مگر انور نے اپنا راستہ سب سے الگ نکالا۔ وہ باریک نگار تھے۔ بہت باریک لکھتے تھے، کاتب اور کمپوز کرنے والے ان کی اس باریک نویسی سے عاجز رہتے تھے مگر انور اپنی دھن کے پکّے تھے۔ کسی کی نہیں سنتے تھے، یہ باریک بینی ان کے مزاج اور کردار کا جزو تھی۔ ہر چیز کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ جانچتے اور پرکھتے تھے۔ شاید باریک نویسی بھی اسی مزاج کا اظہار تھی۔ آپا کے بقول ایک بار انھوں نے چاول کے دانے پر "قل ہو اللہ" لکھنے کی کوشش بھی کی اور اپنی فن کاری سارے گھر والوں کو دکھائی تھی۔

باریک بینی کے ساتھ ساتھ ان کے اندازِ تحریر میں ایک حسن تھا، یہ محسوس ہوتا تھا کہ الفاظ کاغذ پر جگمگا رہے ہیں۔ لکھنے کے ساتھ انھیں قلموں کا بھی شوق تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی ساٹھ ستّر قلم ہوں گے۔ یہ کالم لکھنے کے لیے ہے۔ یہ ناول لکھنے کے لیے ہے۔ یہ ترجمے کے لیے ہے، طرح طرح کے قلم تھے۔ کوئی قلم خراب ہو جاتا تو خود ہی اس کی مرمّت بھی کر لیتے۔ میرا کوئی قلم خراب ہو جاتا تو ان کے سپرد کر دیتا وہ اسے ٹھیک کر کے میرے حوالے کر دیتے تھے۔ قلموں کا شوق مجھے بھی ہے لیکن یہ شوق دس بارہ قلموں تک محدود ہے۔ انور کا ذخیرہ بہت بڑا اور منفرد تھا۔ جب میں کوئی نیا قلم خریدتا تو سب سے پہلے انھیں دکھاتا۔ وہ بڑے شوق سے قلم کو دیکھتے۔ اس وقت ان کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر رقص کرتی نظر آتی۔ بہت دیر تک ہر پہلو سے دیکھتے رہتے اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ پرورش لوح و قلم کرنے والے ادیب اور شاعر

کی حیثیت سے انھوں نے ہمیشہ قلم کی حرمت کا پاس کیا اور قلم کی حفاظت کی۔ میرا خیال ہے کہ ان کا قلم کبھی کسی کی دل آزاری اور مذمت میں استعمال نہیں ہوا۔

انور کے دوست احباب بہت تھے۔ طالب علمی کے دور میں ان کی بڑی عزت اور شہرت تھی۔ گھر پر آنے جانے والے طالب علم ساتھیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی بیٹھا ہے۔ ایک آرہا ہے ایک جارہا ہے۔ وہ اپنے دوستوں میں بہت مقبول تھے۔ عملی سیاست کے دور میں بھی ان کے دوست اور رفقائے کار بے شمار تھے لیکن جیسے جیسے زندگی کی مصروفیات بڑھتی گئیں دوستوں کے زور و شور میں کمی آتی گئی۔ پھر بھی بہتوں سے تعلقات قائم رہے۔ ادبی تقریبوں میں وہ عموماً صبا اکرام صاحب کے ساتھ جاتے تھے۔ میں نے بعض ادبی تقریبوں اور شاعروں میں دونوں کو ساتھ بیٹھے دیکھا۔ انور مشاعروں میں خوش دلی سے شریک ہوتے تھے لیکن عام مشاعروں سے گریز کرتے تھے۔ مشاعروں میں وہ اپنا کلام دلکش انداز سے سناتے تھے۔ شعر سنانے میں خود بھی محظوظ ہوتے اور سننے والوں کو بھی محظوظ کرتے تھے۔ لیکن انھیں شاعروں اور مشاعروں کی سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ آپ بھلے جگ بھلا والی بات تھی۔ وہ جو مشاعروں میں شرکت کو شاعری کی معراج سمجھتے ہیں ان سے دور رہتے تھے، نہ کسی گروہ بندی اور نہ کسی کی پاسداری کے قائل تھے__ ان کا کلام پاکستان اور ہندوستان کے بے شمار رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوا لیکن وہ اس کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ ان کا شعری اسلوب بڑا رچا ہوا، فکر انگیز اور دل موہ لینے والا تھا۔ چونکہ انھوں نے فارسی ادبیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا لہٰذا فارسی کے اثرات ان کے کلام میں بہت نمایاں تھے۔

انور برجستہ گو اور بدیہہ گو تھے۔ ایک دفعہ ریڈیو کے کسی پروگرام میں بچوں کی ایک نظم کی فوری ضرورت محسوس کی گئی، پروگرام کے مہتمم نے مجھ سے کہا، "انور سے نظم لکھوا دو، وہ تو بچوں کی نظمیں لکھنے کے ماہر ہیں۔ کل تم دفتر آؤ تو نظم لیتے آنا۔" میں نے گھر آکر انور سے کہا، "ریڈیو والوں کی فرمائش ہے کہ بچوں کے لیے ایک نظم لکھ دو۔" انور کا شمار اس وقت بچوں ہی میں ہوتا تھا۔ وہ گھر کی بالکنی میں گئے اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے ایک نظم لاکر مجھے دے دی۔ میں حیرت سے انھیں دیکھتا رہا۔ سویرے افضل صدیقی نے جو بچوں کے پروگرام سے وابستہ تھے نظم

دیکھی تو بڑے خوش ہوئے۔ بڑی تعریف کی لیکن انور ریڈیو سے دور دور ہی رہے۔

بچپن ہی سے انور کو کھیل کود سے کوئی دل چسپی نہیں تھی، مٹی کے کھلونے بنانے کی کوشش کرتے یا کاغذوں پر لکیریں کھینچتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کو تعویذ لکھتے دیکھتے تو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر نقش بناتے۔ کراچی آگئے تو حالات اور بیماری نے کسی کھیل میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا۔ ان کے لڑکپن کے زمانے میں ریڈیو سے کمنٹری کا بڑا زور تھا۔ کرکٹ کی کمنٹری ہوتی تو لوگ کام چھوڑ کر ریڈیو کی طرف محو ہو جاتے۔ حد یہ ہے کہ ہماری آپا بھی انگریزی سے ناواقف ہونے کے باوجود کرکٹ کی کمنٹری ضرور سنتی تھیں۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا، "تمھیں اس کمنٹری میں کیا مزہ آتا ہے۔" کہنے لگیں، "جب چوکا اور چھکا لگتا ہے اور کمنٹری کرنے والا چیختا ہے تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اور پھر اس سے گھر میں رونق بھی رہتی ہے۔" انور کمنٹری سننے کے قائل نہیں تھے۔ جہاں کمنٹری شروع ہوئی اور انھوں نے کہا، "وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل۔" کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال تو کیا، انور نے تاش کو بھی کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ ان کا کھیلنا ان کا پڑھنا تھا۔ اسی میں غرق رہتے تھے کمنٹری سننے والوں کا مذاق بھی اڑاتے رہتے تھے۔

دراصل انور نے اپنے آپ کو شعر و ادب اور سیاسی آگہی کے فروغ کے لیے وقف کر رکھا تھا، کالج اور یونیورسٹی میں ان کا وقت انہی مشغلوں میں صرف ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے بہت سے ہم جماعتوں کو اپنے مسلک و مذاق کا پیرو بنالیا تھا۔ ان کے ساتھی طلبہ کا گروہ بہت بڑا تھا۔ سب ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ انھوں نے بہت سے طالب علموں کو لکھنے کے ہنر سے آگاہ کیا اور ان کی ہمّت افزائی کی۔ دن رات لکھنے لکھانے کی وجہ سے وہ بہت مصروف رہتے تھے۔ ان کے ایک ہم جماعت سہیل لاری نے ایک دفعہ مجھ سے کہا، "انور احسن تو لکھنے کی مشین بن گئے ہیں۔ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں۔"

انور نے عملی سیاست سے اپنی دکان چمکانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مخلص کارکن تھے اور اپنے اصولوں پر سختی سے قائم رہتے تھے۔ بُرائی اور مذمت کسی کی نہیں کرتے تھے۔ اندرون خانہ اور بیرون خانہ دونوں ایک ہی سا حال تھا۔ باہر بھی شگفتگی کا اظہار کرتے رہتے تھے اور گھر میں بھی سب کو ہنساتے رہتے تھے۔

ایک دن میں بیٹھا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی کی دوپہر۔ انور نجانے کہاں سے مارے کھدیڑے گرمی کے ستائے، پسینے میں شرابور گھر آئے۔ آپا نے فوراً ہی ان کے لیے کھانا میز پر رکھ دیا، منھ ہاتھ دھونے کے بعد انور کھانا کھانے بیٹھے۔ آپا سے تو کچھ نہیں بولے خورشید سے کہنے لگے، "اچھی آپا، یہ ہمارے گھر میں بسکٹوں سے سالن کھانے کا رواج کب سے ہو گیا؟" خورشید کے کچھ کہنے سے پہلے آپا نے انور کو ڈانٹا۔ "واہی تواہی پھرتے رہتے ہو، روٹی رکھے رکھے سوکھ جاتی ہے۔ بسکٹ نہیں بنے گی تو کیا پراٹھا بنے گی۔" سب ہنسنے لگے۔ انور کو جو کہنا تھا وہ انھوں نے بڑی شگفتگی سے کہہ دیا۔ آپا نے جواب بھی تُرکی بتر کی دے دیا۔

نیا مکان مکمل ہو گیا۔ انور اور ریحانہ وہاں منتقل ہو گئے۔ منتقل ہونے کے بعد انھوں نے سارے بہن بھائیوں کو وہاں جمع کیا۔ سب کو بڑے فخر سے مکان دکھایا۔ سب نے تعریف کی۔ سب کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انور نے اس مکان کی تعمیر میں اپنی تعمیراتی مہارت کا پورا زور صرف کیا ہے۔ بڑی چہلیں ہوئیں، نقلیں اُتاری گئیں۔ اجن نے سب کو ہنسایا۔ انور اور ریحانہ پر فقرے کسے گئے۔ دبی زبان سے یہ بھی کہا گیا کہ تم نے اتنی دور اتنا بڑا مکان بنوالیا ہے۔ خدانخواستہ رات برات تمھاری یا ریحانہ کی طبیعت خراب ہو گئی یا کوئی کام آپڑا تو کیا ہو گا۔ انور نے کہا، "اسی لیے تو اتنی بڑی گاڑی خریدی ہے۔ یہ اسی وقت کام آئے گی۔"

یہ انور کے نئے مکان پر منعقد ہونے والی پہلی اور آخری خاندانی محفل تھی۔ بیمار تو وہ بہت عرصے سے تھے کوئی نہ کوئی بیماری چلی آرہی تھی لیکن اب جان لیوا بیماری کا دور شروع ہوا۔ بچپن میں بہت بیمار ہوئے، جان کے لالے پڑ گئے۔ لکھنؤ میں تھے، ہمارے نانا نے بڑی دوڑ دھوپ کی خدا خدا کر کے ٹھیک ہو گئے، اس وقت سے آپا اور بھائی جان نے انھیں پھول پان کی طرح رکھا، پھر کراچی میں بیمار ہوئے، بہت دن بیمار رہے لیکن اللہ کے فضل و کرم سے تندرست ہو گئے پھر بھی۔۔۔ آصف، طارق، سلمان، کاشف سب ان کے علاج کے لیے دوڑنے لگے۔ آصف نے جو خود ڈاکٹر ہیں انھیں شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ آغا خان ہسپتال کے مشہور ڈاکٹر سرور نے جو آصف کے ہم جماعت اور دوست تھے، بڑی توجہ سے علاج کیا۔ SUIT میں بھی علاج ہوا۔ سرطان کے ایک اور ماہر نے آصف کو بتایا کہ تمھارے چچا کو ایک نہیں دو طرح کے سرطان

کا سامنا کرنا ہے۔ ایک تو عام سرطان ہے لیکن دوسرا ایسا خاص سرطان ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ سب دوڑتے رہے، اکرم اور ارشد اپنی بیماری کے باوجود دوڑے۔ آصف ڈاکٹروں کے یہاں پھیرے کرتے رہے۔ سلمان انور کو اسپتال لے جاتے رہے۔ سارا خاندان دوڑ بھاگ میں مصروف تھا۔ سب بڑے رنجیدہ اور مضمحل تھے۔ ریحانہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

وقت گزرتا گیا، دوڑ بھاگ ہوتی رہی۔ کبھی ایک اسپتال، کبھی دوسرا اسپتال، لیکن انور مایوس نہیں تھے۔ ان کو بیمار دیکھ کر کسی نے کہا، "یہ جو اتنی بڑی گاڑی کھڑی ہے اسے بیچ دو کھڑے کھڑے زنگ لگ رہا ہے۔" انور باوجودیکہ بڑی تکلیف میں تھے۔ کہنے لگے، "ہمارے پیروں میں ذرا سی طاقت آجائے تو پھر ہم خود اسے چلائیں گے۔" کیا ہمّت تھی، کیا حوصلہ تھا۔

حالت روز بروز بگڑتی گئی مایوسی کی گھٹائیں سارے خاندان پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان کے انتقال سے دو دن پہلے میں صبح صبح ان کے یہاں گیا تو انھیں ناشتا کرایا جارہا تھا۔ لیکن وہ کوئی چیز کھانے کے قابل نہیں تھے۔ بول بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "انّو! انّو۔۔۔" آواز سن کر انور کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی لیکن کچھ کہہ نہیں سکے۔ میں نے بلند آواز میں ان کا ایک شعر پڑھا جو مجھے بہت پسند تھا اور ہر ملاقات میں یہ غزل ان سے ضرور سنتا تھا۔

کیا حال ہو پیاسوں کا جب عالم وحشت میں
دریا کے بیاباں سے اک موجِ سراب آئے

میں نے دو تین دفعہ یہ شعر پڑھا۔ شعر سن کر ان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک نمودار ہوتی تھی۔ یہ محسوس ہوتا کہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے۔ میں بیٹھا سوچتا رہا۔ یہ وہی انور ہیں جو بلبل ہزار داستاں کی طرح چہکتے تھے۔ انور کی زندگی کے مختلف ادوار، ان کی محبت، خلوص، عزم اور ہمّت، بڑوں کا ادب۔ یاد آیا کہ ایک دفعہ انھیں ایک عزیز کے رویّے سے شکایت پیدا ہوگئی کسی سے کہا تو کچھ نہیں لیکن ان کے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ آپا نے مجھ سے کہا، "انّو ان صاحب کے یہاں نہیں جاتا، کچھ ناراض ہو گیا ہے، میں نے پوچھا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ آج کل وہ بیمار ہیں، دیکھ آتا تو رنجش دور ہو جاتی۔" میں نے آپا سے تو کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن

انور سے کہا، "کچھ سنا تم نے، فلاں صاحب ان دنوں بیمار ہیں، چلو انھیں دیکھ آئیں۔" انور خاموش سے میرے ساتھ ہو لیے۔ ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ نہیں، میں ان کے یہاں نہیں جاؤں گا۔ ہم دونوں ان عزیز کے یہاں گئے۔ انھیں انور کی ناراضی کا اندازہ تھا۔ ہم دونوں کو دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور پھر انھوں نے کبھی انور سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کی۔

خیالات آتے رہے، انور نے کبھی مجھ سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ اپنا سارا بوجھ خود ہی اٹھایا۔ انھیں پورا احساس تھا کہ مالی حالات اچھے نہیں ہیں، بھیا پر مزید بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔ لڑکپن ہی سے ایسی سمجھ داری، ایسی بُردباری، بہن بھائیوں میں تیزم تیزی ہوتی رہتی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے مگر انور سارے بہن بھائیوں پر فدا تھے۔ خاندان کے سارے بچوں پر فدا تھے۔ آصف نے جب لکھنا شروع کیا تو بڑے خوش ہوئے، بڑی حوصلہ افزائی کی۔ آصف نے ان سے متعدد مضامین لکھوائے۔ ترجمے کروائے۔ ان کی خودنوشت شائع کی۔ ہم تینوں میں اکثر ادبی مکالمے بھی ہوتے تھے__ میں کبھی کبھی ان کی کسی تحریر پر کوئی اعتراض کرتا تو بڑے غور سے سنتے اور پھر اپنا موقف بیان کرتے۔ میری تنقید کو وہ خوشی سے گوارا کرتے تھے۔ سب یاد آتا رہا۔ ریحانہ سے ان کی چُہلیں۔ ریحانہ کی ہلکی ہلکی ہنسی۔ اجن کے فقرے۔ تنّن کی چٹکیاں، سب کچھ ذہن میں ابھرتا رہا۔

میں یہ سب سوچتا رہا، بار بار انور کو دیکھتا رہا۔ ہمّت نہیں ہوئی کہ ان سے کچھ اور کہوں، بھاری دل کے ساتھ واپس آگیا، اس اندیشے کے ساتھ کہ چراغ کی لو بہت مدھم ہوگئی ہے، نجانے کب بُجھ جائے۔

دوسری رات کو دو بجے فون کی گھنٹی بجی۔ تاج نے گھبرا کر فون اُٹھایا، اندازہ ہوا کہ ریحانہ کا فون ہے۔ تاج نے کہا، "میں فوراً پہنچ رہی ہوں۔" انھوں نے طارق کو جگایا، اتنے میں سلمان نے گیٹ کی گھنٹی بجائی۔ تاج نے طارق سے کہا، "تم پیچھے پیچھے آؤ، میں سلمان کے ساتھ جارہی ہوں۔" اور وہ مجھے کچھ بتائے بغیر چلی گئیں۔ انھوں نے میری علالت کی وجہ سے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ چپکی چلی گئیں تاہم مجھے اندازہ ہوگیا۔ جاگتا رہا۔ تہجّد کے لیے وضو کرنے اٹھا تو طارق کچھ سامان لینے آئے، میں نے کہا، "تم لوگوں نے مجھے جگانا اور بتانا مناسب نہیں سمجھا لیکن خون کا

رشتہ خون کا رشتہ ہوتا ہے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ رشتہ ٹوٹ رہا ہے، پنچھی "اڑنے والا ہے۔"
صبح جا کر دیکھا، "اک خون چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ تھے۔" سب کو ہنسانے والے کے لیے سب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

انور ہمارا سب سے ذہین، دلیر، غیرت مند اور سمجھ دار بھائی تھا۔ خوب صورت نثر لکھنے والا اور اپنے عہد کے ذہنی اور روحانی کرب کو نمایاں کرنے والا شاعر تھا۔ اُس نے بہت لکھا اور خوب خوب لکھا۔ اس کا کلام برِّصغیر کے اکثر رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ ادب کی دنیا میں وہ ایک معروف اور قابل احترام شخصیت کا حامل تھا۔ میں آج بھی چشم تصور وا کرتا ہوں تو وہ مجھے کسی تقریب میں اپنے خاص دوست صبا اکرام کے ساتھ باوقار انداز میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ دوستوں کا دوست تھا۔ دشمنوں کا بھی دشمن نہیں تھا۔ اس کے جانے سے خاندانی محفلوں کی روایت ختم ہو گئی۔ مجھے بڑے دُکھ کے ساتھ ساتھ اس کی یادوں کے روشن دریچوں میں اپنا ایک شعر اکثر یاد آتا ہے۔

کون آواز تمنّا پر کہے گا لبیک
کون جائے گا سرِ کوہ ندا میرے بعد

۳ دسمبر ۲۰۱۳ء

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے
(مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں
تبدیل کیا جاتا ہے، ہمارے کتابی سلسلے
کا حصہ بننے کیلئے **وٹس ایپ** پر رابطہ
کریں

حسنین سیالوی

0305-6406067

اختر صاحب

روایت ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کے چہیتے مرید اور نابغۂ روزگار۔ حضرت امیر خسروؒ نے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ ہر دور میں صاحبِ اعتبار، پُروقار اور رونقِ خانقاہ و دربار رہے تھے۔ بڑوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں اور ہمیشہ یاد رکھی جاتی ہیں۔ میں ایک متوسّط طبقے کے دفتری اہلکار کا تذکرہ لکھتا ہوں جس نے سات وائس چانسلروں کے ساتھ معاون ذاتی کی حیثیت سے کام کیا۔ صاحب عزووقار رہا، صاحب اعتبار رہا، سیاہ و سفید کا مالک و مختار رہا لیکن کبھی سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ نہیں کیا۔ اپنی جفاکشی، راست بازی، معاملہ فہمی اور بُردباری سے اپنے ممدوحوں کے دل جیت لیے اور فردِ خاندان کی سی حیثیت حاصل کرلی۔ اختر حسین علی گڑھ میں پروفیسر احمد ابوبکر حلیم کے یہاں ذاتی معاون کی حیثیت سے وابستہ ہوئے تھے اور پھر کراچی آئے جہاں وائس چانسلر آتے رہے، جاتے رہے۔ اختر صاحب کام کرتے رہے سب کے کام کرنے کا طریقہ اور سلیقہ ایک دوسرے سے الگ تھا۔ اختر صاحب سب کے ساتھ اُن کی مرضی اور مزاج کے مطابق، اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ سرگرمِ عمل رہے لیکن اُن کے بعض ممدوح بھی بُھلا دیئے گئے اور بیچارے اختر صاحب کس شمار قطار میں تھے......

O

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ریڈیو پاکستان کراچی سات سمندر پار کر کے بندر روڈ کے خوش نما اور آراستہ 'اسٹوڈیوز' میں منتقل ہوچکا تھا اور میں بھی ایک کارکن کی حیثیت سے بندر روڈ کی عمارت میں آگیا تھا۔ ایک دن شاہد بھائی (شاہد احمد دہلوی) نے ایک بڑے میاں کو مجھ سے ملوایا

اور کہا "ان کی بیٹی کا داخلہ ہونا ہے۔ بی اے کا داخلہ ہے لیکن کراچی یونیورسٹی کے کارکن اجازت نہیں دیتے۔ تمہارے تعلقات یونیورسٹی والوں سے ہیں تو ذرا ان کی مدد کرو۔" میں نے مسئلہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کلرکوں نے تنگ کر رکھا ہے۔ اگرچہ یونیورسٹی میں میرے کسی سے تعلقات نہیں تھے لیکن یونیورسٹی کے عارضی دفاتر ریڈیو اسٹیشن کے بالکل سامنے این جے وی اسکول کی عمارت میں تھے لہٰذا میں اگلے دن وہاں چلا گیا۔ کلرکوں کے رویّے نے خاصا پریشان کیا۔ مجھے بھی تاؤ آگیا۔ سوچا کہ وائس چانسلر سے ملنا چاہیے اُن کی طرف گیا تو معلوم ہوا کہ پہلے اُن کے سیکریٹری سے بات کیجیے۔ میں سیکریٹری صاحب کے پاس گیا بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ درخواست پڑھی تو کہنے لگے، "شعبۂ امتحانات کے کارکن آپ کو بلاوجہ پریشان کر رہے ہیں۔ آپ حلیم صاحب سے مل لیجیے۔" یہ کہہ کر وہ ملحقہ دروازے سے اندر گئے اور ذرا دیر بعد مجھ سے کہا، "جائیے مل لیجیے۔"

میں اندر گیا تو بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ میں ان میں سے بعض اربابِ علم کو جانتا تھا۔ حلیم صاحب نے درخواست پڑھی۔ ہنسے اور کہنے لگے، "خواہ مخواہ آپ کو پریشان کیا جا رہا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے درخواست پر کچھ لکھا۔ دستخط کیے اور مجھ سے کہا، "یہ اختر صاحب کو دے دیجیے۔" میں باہر آیا اختر صاحب کو کاغذ دے دیا اور اجازت چاہی۔ انہوں نے کہا، "آرڈر تو لیتے جائیے اور ابھی تو آپ سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی، چائے پی کر جائیے۔"

میں بیٹھ گیا۔ اختر صاحب کو غور سے دیکھا۔ لمبا قد، مضبوط ہاتھ پیر، چہرہ قد کی مناسبت سے چھوٹا۔ سر پر جناح کیپ، شارک اسکن کی نفیس شیروانی۔ پیروں میں پھول دار موزے۔ یہ تھے اختر صاحب جن کے سامنے کاغذات کا گڈّار کھا ہوا تھا اور منٹ منٹ پر ٹیلیفون آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں آرڈر مجھے مل گیا اور پھر چائے اور بسکٹ کی ٹرے بھی آگئی۔ چائے نفیس اور بسکٹ اعلیٰ درجے کے تھے۔ ان سے اختر صاحب کے ذوق کی نفاست کا اندازہ ہوتا تھا۔ میں نے چائے پی، بسکٹ کھائے۔ اُس وقت یہ اندازہ نہیں ہوا کہ یہ چائے اور بسکٹ ایک یادگار روایت کا نقطۂ آغاز ہیں۔ میں نے پھر اجازت چاہی تو اختر صاحب نے کہا، "آپ تو سامنے ہی ہیں۔ کبھی کبھی آیا کیجیے، ساتھ چائے پئیں گے اور باتیں کریں گے۔" میں خوش خوش واپس آگیا اور گاہے گاہے اختر صاحب کے پاس آنے جانے لگا۔

اختر صاحب خاموش طبع تھے۔ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن مجھ سے خوب باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں بھی کُرید کُرید کر پوچھتا رہتا۔ معلوم ہوا کہ بجنور کے رہنے والے ہیں، بجنور سے تعلیم حاصل کرنے علی گڑھ آئے۔ تعلیم ہی کے زمانے میں پروفیسر حلیم سے جو علی گڑھ میں پرو وائس چانسلر تھے اُن پر مہربان ہوگئے اور بعض چھوٹے چھوٹے کام اُن کے سپرد کرنے لگے۔ جب اختر صاحب نے بی ایس کر لیا تو حلیم صاحب نے پوچھا، "اب کیا ارادے ہیں؟" اختر صاحب نے کہا، "ملازمت کا ارادہ ہے۔" حلیم صاحب نے کہا، "میرے ذاتی معاون کی جگہ خالی ہے۔ تمہارا تقرّر کیے دیتا ہوں۔" اختر صاحب حلیم صاحب کے پی اے ہوگئے اور کام کرنے لگے۔ اُن کی محنت اور دیانت کی وجہ سے حلیم صاحب اُن پر پورا بھروسا کرنے لگے۔ کام بہت تھا حلیم صاحب کی دوسری مصروفیتیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ یونیورسٹی کی طرف سے یوپی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ اب اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ آگئی، کام ہے کہ سمٹتا ہی نہیں ہے۔ اختر صاحب کاغذوں کے پلندے لیے منتظر ہیں، گاڑی کا وقت ہو گیا۔ حلیم صاحب نے کہا، "چلو گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ امید ہے کہ ہاتھرس پہنچنے تک کام ختم ہو جائے گا۔ ہاتھرس آگیا کام ختم نہیں ہوا۔ حلیم صاحب نے کہا "ٹونڈلے تک چلو۔" ٹونڈلہ بھی گزر گیا شکوہ آباد قریب آگیا، کام بھی ختم ہو گیا۔ اختر صاحب شکوہ آباد پر اتر گئے۔ حلیم صاحب لکھنؤ چلے گئے۔

حلیم صاحب بڑے معاملہ فہم، دفتری امور اور نظم و ضبط میں بہت سخت، خوش اخلاق اور قومی خدمات میں پیش پیش رہنے والے بزرگ تھے۔ ماہر تعلیم تھے۔ ان کی سیاسی بصیرت پر قائد اعظم بھی بہت اعتماد کرتے تھے۔ اختر صاحب ان کے ساتھ کام کرتے رہے اکثر حلیم صاحب کے ساتھ باہر بھی جاتے رہتے تھے۔ اس طرح اُنہیں اُس دور کے بہت سے مسلمان رہنماؤں سے ملنے کا موقعہ ملا۔ ان کے بقول " قائد اعظم شملہ کانفرنس میں گئے۔ حلیم صاحب مشیر کی حیثیت سے ساتھ تھے اور میں حلیم صاحب کے ذاتی معاون کی حیثیت سے ہمراہ تھا۔ قائد اعظم جب گھر پر ہوتے تو سیاسیات کی ایک کتاب کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ جب وہ کانفرنس میں چلے جاتے تو حلیم صاحب اُس کتاب کا مطالعہ کرتے (اختر صاحب کو کتاب کا نام یاد نہیں رہا۔) اس طرح زندگی بڑی تیز رفتاری سے گزر رہی تھی۔

جب سندھ اسمبلی میں سندھ یونیورسٹی کے قیام کا بل منظور ہو گیا تو سندھ کے مسلم زعمانے قائد اعظم سے درخواست کی کہ "یونیورسٹی کے قیام کا بل منظور ہو گیا ہے۔ اب آپ ہمیں ہدایت کیجئے کہ وائس چانسلر کس کو بنایا جائے۔" قائد اعظم نے سوچنے کے بعد فرمایا کہ "اگرچہ مجھے ذاتی طور پر تکلیف ہوگی تاہم قومی کام اہم ہے۔ پروفیسر حلیم صاحب کو بلوا لیجئے۔"

حلیم صاحب سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے۔ علی گڑھ سے کراچی پہنچے تو وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش اُن کی پذیرائی کے منتظر تھے، اصرار کر کے اپنے یہاں لے گئے۔ وہ حلیم صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ اختر صاحب حلیم صاحب کے ساتھ تھے۔ دونوں چھ مہینے تک پیر صاحب کے مہمان رہے۔ حلیم صاحب جب بھی مکان کے لیے کہتے تو پیر صاحب کہتے، "جلدی کیا ہے۔ فیملی آجائے گی تو مکان کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" آخر کار حلیم صاحب کی فیملی آگئی اور وہ دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اختر صاحب کچھ دن ساتھ رہے پھر اُنہیں بھی مکان مل گیا۔

کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو حلیم صاحب اس کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے۔ اختر صاحب ساتھ تھے۔ کام بہت تھا بڑا صبر آزما اور مستقبل کی مناسب منصوبہ بندی کا تھا۔ زمین حاصل کی جارہی ہے۔ نقشے بن رہے ہیں۔ کون سا شعبہ کہاں ہو گا، تعلیم کس قدر جلد شروع ہو سکتی ہے۔ این جے وی اسکول کی عمارت میں حلیم صاحب کا دفتر قائم ہوا، کچھ شعبے چاند بی بی روڈ پر قائم ہوئے۔ بڑی جاں فشانی اور دور اندیشی کا دور تھا۔ اختر صاحب حلیم صاحب کے ساتھ دن رات محنت کرتے رہتے تھے۔ دن بھر ملاقاتیوں کا ہجوم رہتا، آنے جانے والوں کی وجہ سے دم مارنے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ اختر صاحب ضروری کاغذوں پر فوری احکام حاصل کر لیتے۔ باقی کاغذوں کو اُن کی اہمیت کے مطابق مختلف فائلوں میں جمع کرتے جاتے تھے۔ پھر یہ ہوتا کہ مہینے کے آخری دنوں میں حلیم صاحب کراچی کے قریب دملوٹی ریسٹ ہاؤس چلے جاتے۔ صبح سے رات تک کام ہوتا۔ دو تین دن میں کام ختم ہو جاتا تو دونوں کراچی واپس آجاتے اور 'پرانا' ڈھرّا شروع ہو جاتا۔

اختر صاحب نے حلیم صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ عدل، غیر جانب داری، دیانت، قاعدے قانون کا احترام، امانت کی پاسداری۔ اختر صاحب واقعہ سناتے تھے کہ "حلیم صاحب

کے ایک صاحب زادے، ضرورت سے زیادہ کھلنڈرے تھے۔ کالج میں پڑھتے تھے امتحان کا فارم داخل کرنے کی تاریخ آئی اور گزر گئی، اُنہیں ہوش ہی نہیں آیا۔ ہوش آیا تو فارم جمع کرانے گئے۔ کلرک نے کہا تاریخ کب کی گزر گئی، اپنے والد سے کہہ کر تاریخ بڑھوا لیجیے۔ اوروں کا بھی بھلا ہوجائے گا۔ وہ صاحب زادے باپ سے کچھ کہنے کی ہمّت نہ کر سکے ماں سے کہا۔ ماں بیچاری ان باتوں کو کیا جانیں۔ انہوں نے بھی ہمّت نہیں کی۔ اختر صاحب سے کہا۔ اختر صاحب نے ڈرتے ڈرتے حلیم صاحب سے کہا۔ حلیم صاحب نے ناراض ہو کر کہا، میں اپنے بیٹے کی خاطر قانون شکنی کروں، یہ نہیں ہوسکتا۔ اب وہ اگلے سال امتحان دے گا۔" اختر صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر حلیم صاحب کی اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی کام خلافِ قانون نہیں کیا۔ جب بھی کسی شخص نے مجھ سے کسی خلاف قانون کام کرنے کے لیے کہا تو مجھے، حلیم صاحب اور اُن کے الفاظ یاد آتے تھے اور میں غلط کام سے بچ جاتا تھا۔

حلیم صاحب ہی کے دور میں وائس چانسلر کا دفتر بھی چاند بی بی روڈ کی ایک عمارت میں منتقل ہو گیا۔ اختر صاحب بھی وہاں چلے گئے۔ یہ دفتر ریڈیو اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اردو کالج اور انجمن ترقی اردو کے دفاتر بھی چاند بی بی روڈ پر تھے۔ دونوں جگہ آنا جانا رہتا تھا اس لیے اختر صاحب سے ہفتے میں ایک آدھ ملاقات ضرور ہو جاتی تھی۔

حلیم صاحب کا دور ختم ہوا، اُن کی جگہ پروفیسر بشیر احمد ہاشمی کا تقرر ہوا۔ ہاشمی صاحب خوش گفتار، انگریزی ادبیات کے عالم، ہوشیار اور تجربہ کار اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت سخت اور مستعد بہ کار۔ اختر صاحب سے خار کھانے اور اُن کے عروج سے حسد کرنے والے بڑے خوش ہوئے کہ سارا کرّوفر ختم ہو جائے گا۔ سیاہ سفید کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ واقعی ہاشمی صاحب نہایت سخت تھے۔ اگر اُن کا چپراسی یونیورسٹی کے کسی پروفیسر کو بُلانے جاتا تو وہ گھبرا کر پوچھتا، "مجھ ہی کو بُلایا ہے کسی اور کو تو نہیں بُلایا۔" اور مستعد بہ کار ہونے کا یہ واقعہ بھی یونیورسٹی کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ اُس زمانے میں انگریزی، اردو، فارسی اور عربی کے شعبے نانک واڑہ میں پان منڈی کے ایک چھوٹے سے اسکول میں کام کر رہے تھے۔ گرمی کا زمانہ، کمرے چھوٹے چھوٹے۔ طلبہ اساتذہ سب پسینے میں نہائے رہتے تھے۔ ایک

دن ہاشمی صاحب معائنے کے لیے آئے دیکھا بھالا جائزہ لیا۔ شعبہ اردو کے ایک کلاس میں گئے، طلبہ گرمی سے بلبلا رہے تھے۔ ایک طالب علم جس کا نام بقاء الدین تھا، کھڑا ہوا۔ بڑے ادب اور انکسار سے کہا، "جناب والا یہاں گرمی بہت ہے پنکھے لگوا دیجئے بڑا کرم ہو گا۔" ہاشمی صاحب چپکے سے چلے گئے۔ بقا کو طلبہ اور اساتذہ نے جھاڑا کہ "بے سوچے سمجھے بات کہہ دیتے ہو۔ یہ بات ایسے جابر آدمی کے سامنے کہنا چاہیے تھی؟" دوسرے دن جب اساتذہ اور طلبہ اپنے اپنے شعبوں میں پہنچے تو سارے کمروں میں پنکھے فر فر چل رہے تھے، یہ ایک شفیق اُستاد کی جانب سے اپنے طلبہ کی تکلیف کا بر وقت ازالہ تھا۔

اختر صاحب کے حاسد اور مخالف نجانے کیا کیا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے مگر ہوا یہ کہ اُن سب کے خواب ہوا میں تحلیل ہو گئے اور اختر صاحب لالوں کے لال بنے پہلے سے زیادہ کرّو فر کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اُن کا جو دبدبہ حلیم صاحب کے دور میں تھا وہی دبدبہ ہاشمی صاحب کے دور میں بھی قائم رہا۔

ہاشمی صاحب کے دور کا ایک اہم کارنامہ کراچی یونیورسٹی کا اپنی نئی عمارتوں میں منتقل ہونا تھا۔ "جاں نثاروں نے ترے کر دیے جنگل آباد۔" جنگل میں منگل ہو گیا، اختر صاحب سے ملاقاتیں کم ہو گئیں لیکن ہوتی رہیں۔ میں اُن سے ملنے کے لیے بالقصد اور بلا ارادہ شہر سے چھ میل دور اُس جنگل میں جاتا اور اختر صاحب سے مل کر شاد کام واپس آتا۔

ہاشمی صاحب کا دور ختم ہوا تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تشریف لائے۔ تاریخ کے بڑے عالم۔ ساری زندگی علم کے فروغ اور ترویج و اشاعت میں گزاری تھی۔ تحریک پاکستان کے سرگرم مجاہد۔ بین الاقوامی علمی شہرت کے حامل، مرنجاں مرنج، نرم مزاج اور معاملہ فہم۔ اختر صاحب کی کارکردگی سے وہ بھی ایسے متاثر ہوئے کہ انہیں فرد خاندان سمجھنے لگے۔ اختر صاحب کا وقار اور اعتبار بدستور قائم رہا۔

قریشی صاحب مسائل لے کر آنے والے لوگوں سے ملنے ملانے میں انکار نہیں کرتے تھے۔ جس کا جی چاہے آ جائے اور اپنا مسئلہ بیان کرے۔ وہ ہر آنے والے کا مسئلہ بڑی دل سوزی سے سنتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا مدد کرتے تھے۔ اس صلائے عام کی وجہ سے دفتری

کاموں کا وقت کم ہو جاتا تھا لیکن قریشی صاحب نے وقت کم نہیں ہونے دیا۔ حلیم صاحب مہینے میں تین چار دن سب سے الگ تھلگ رہ کر سارے کاغذات نبٹاتے تھے۔ قریشی صاحب مغرب کے بعد گھر پر بیٹھتے۔ اختر صاحب کاغذوں سمیت موجود رہتے۔ دن کے دن سارا کام ختم کر دیا جاتا۔ بعض اوقات رات کے نو دس بج جاتے مگر قریشی صاحب کام ختم کیے بغیر نہیں اُٹھتے تھے۔ اگرچہ اس محنت شاقہ سے اختر صاحب کی گھریلو زندگی پر اثر پڑا لیکن وہ دل جمعی اور استقامت سے کام کرتے تھے۔ مخالفوں کے تیر و نشتر بھی چلتے رہتے تھے کہ "جادو کر دیا ہے، کوئی تعویذ گھول کر پلا دیا ہے۔" یہ کوئی نہیں سوچتا کہ سب سے بڑا جادو محنت، خلوص اور وفاداری ہے۔ یہی چڑھتا جادو اور تیر بہ ہدف تعویذ ہے۔

قریشی صاحب اپنی خدمات کی خوش گوار یادیں چھوڑ کر رخصت ہوئے تو ڈاکٹر محمود حسین خان نے شیخ الجامعہ کا منصب سنبھالا۔ قائم گنج کے کھرے پٹھان۔ قومی، علمی اور تعلیمی تحریکوں کو تقویت دینے والے خانوادے کے ممتاز فرد۔ اساتذہ اور طلبہ میں یکساں مقبول۔ محمود حسین خاں نے بھی اختر صاحب کی حد درجہ قدر کی۔ یونیورسٹی کے لوگوں کو وہ صبحیں یاد آتی تھیں کہ نو بجنے والے ہیں۔ دو گاڑیاں آگے پیچھے آئی ہیں۔ کالی مرسی ڈیز میں سے شیخ الجامعہ ڈاکٹر قریشی اور رئیس کلیہ فنون ڈاکٹر محمود حسین خاں برآمد ہوئے۔ دونوں اپنے اپنے دفتروں کی طرف چل دیے۔ دوسری گاڑی سے مستقبل کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر احسان رشید، شعبہ صحافت کے صدر ڈاکٹر انعام الرحمن اور اختر صاحب ایک بڑا پورٹ فولیو لیے اُترے اور کام کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ یہ باہمی میل جول، رواداری اور اخوّت کا مظاہرہ تھا۔ اس مظاہرے سے اختر صاحب کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا تھا۔

محمود حسین خان کا دور بھی دو چار واقعات کے علاوہ بڑا خوش گوار رہا۔ یونیورسٹی نے ترقی کی۔ اصل بات یہ ہے کہ سربراہ مخلص، طاقت ور اور کارگزار ہو تو ادارہ بھی آگے بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین خان دوران ملازمت بیمار پڑے اور ایسے پڑے کہ جاں بر نہ ہو سکے۔ اسپتال میں دن رات، طلبہ، اساتذہ اور دفتری عملے کے علاوہ شہر کے بے شمار لوگ جمع رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب خود چلے گئے۔ نیک نامی چھوڑ گئے۔ یونیورسٹی کی "محمود حسین خان لائبریری" آج

بھی اُن کی یادوں کا تابندہ نشان ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دور میں بھی اختر صاحب اپنی کارکردگی، سوجھ بوجھ اور خدمت کی وجہ سے اُن کی آنکھوں کا تارا بنے رہے۔

حکومت نے ڈاکٹر صاحب کا جانشین منتخب کرنے میں خاصا وقت لیا۔ پورے دس مہینے لگ گئے۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو جو حسین ابراہیم جمال ادارہ کیمیا کے سربراہ تھے عارضی چارج دے دیا گیا۔ ڈاکٹر صدیقی بین الاقوامی شہرت کے سائنس داں، شعر و ادب کے دلدادہ اور بہت اچھے مصور تھے۔ فنونِ لطیفہ سے بڑا شغف رکھتے تھے۔

ڈاکٹر صدیقی بلا کے محنتی انسان تھے۔ چوراسی برس کی عمر میں بھی وہ صبح نو بجے اپنے ادارے میں آتے اور شام کے پانچ بجے تک مصروف رہتے تھے۔ کیمپس میں ان کا مکان بڑا سادہ اور سب کے لیے کھلا ہوا تھا۔ غالب کے عاشقِ زار تھے۔ ملاقات ہوتی تو فوراً کہتے، "اسلم میاں وہ غالبؔ والا شعر توسناؤ۔ میں شعر سناتا۔

ہاں غالبؔ خلوت نشیں ہیم چناں عیشِ چنیں
جاسوسِ سلطاں در کمیں معشوقِ سلطاں در بغل

ڈاکٹر صاحب قائم مقام وائس چانسلر مقرر ہوئے تو انہوں نے اختر صاحب کو بلوایا اور کہا، "میں وائس چانسلری کا دلدادہ نہیں۔ نہ اس منصب سے میری عزّت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ میں وائس چانسلر کے دفتر بھی نہیں آؤں گا اور نہ اُن کی کرسی پر بیٹھوں گا۔ آپ دن کے ایک بجے سارے کاغذات لے کر میرے ادارے میں آجایئے اور کام ختم کرلیجئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے وائس چانسلر کے دفتر میں جھانکا بھی نہیں۔ اختر صاحب کاغذات لے جاتے۔ فیصلے ہو جاتے، دستخط ہو جاتے۔ یہ اختر صاحب کی دیانت، محنت اور خلوص کی تحسین کا بھرپور اظہار تھا۔ ہم تم پر اعتبار کریں۔ تم ہم پر اعتبار کرو۔ کام چلتا رہے اور واقعی کام چلتا رہا، کبھی کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا۔

یہ دور بھی اختر صاحب کے اعتبار و وقار میں اضافہ کرتا ہوا گزر گیا۔ نئے آنے والے وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید علم و ادب کے دودمانِ عالیہ کا بہترین مظہر تھے۔ وجیہہ، خوش گفتار، بُردبار، خوش پوش اور علمی روایتوں کے امین۔ طلبہ اور اساتذہ میں یکساں مقبول۔ اُن کی

شخصیت میں ایک خاص انداز کا وقار تھا ایسا وقار جو بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی کو بڑے سلیقے سے چلایا۔ یونیورسٹی میں داخل ہونے والی سڑک پر ایک بلند بالا پتھر نصب کروایا۔ اس پتھر پر اقبال کے اشعار درج تھے۔ جو بھی یونیورسٹی آتا اس بلند و بالا پتھر کو دیکھ کر یونیورسٹی کی عظمت و شوکت کا قائل ہو جاتا۔ آج بھی یہ پتھر اُن کے حسن ذوق اور رفعت خیال کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر احسان رشید اور اختر صاحب علی گڑھ میں ہم عصر تھے۔ اختر صاحب اُن سے ادب و احترام سے پیش آتے تھے اور ڈاکٹر صاحب دوسرے تمام وائس چانسلروں کی طرح اُن پر پورا پورا بھروسا کرتے تھے اور ان کی کارکردگی کی قدر کرتے تھے۔

ڈاکٹر احسان رشید کے دور کا ایک واقعہ جو بہت مشہور ہوا راقم الحروف کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ ہُوا یہ کہ اساتذہ کے تقرر کے لیے سلیکشن بورڈ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اردو کے تین ایسوسی ایٹ پروفیسر مقرر ہونا تھے۔ امیدوار بھی تین ہی تھے۔ تینوں شعبے ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ انتخاب محض ضابطے کی کارروائی تھی۔ جب مجھے طلب کیا گیا تو سلام دعا کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا، ''آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ اِرتجالاً شعر کہتے ہیں۔ فی البدیہہ کہتے ہیں اور بہت خوب کہتے ہیں تو اس وقت کی صورت حال پر کوئی شعر سنائیے۔''

میں ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد پر سناٹے میں آگیا۔ خیال تھا کہ وہ دریافت کریں گے کہ آپ کیا پڑھاتے ہیں۔ اختصاص کس موضوع میں حاصل ہے مگر یہاں تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ میں اُستاد اردو کے انٹرویو میں آیا ہوں، ''استاد سخن'' کے انٹرویو میں نہیں آیا ہوں۔ ''ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد پر رئیس کلیۂ فنون ڈاکٹر مظفر حسین نے جو ڈاکٹر احسان رشید کے برابر بیٹھے ہوئے تھے، رڈا چڑھایا۔ ''سُنا کیا ہے۔ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ہاں ڈاکٹر صاحب پڑھیے۔'' مرے پر سو دُرّے۔ ذہن میں بجلی کوندی اور میں نے بڑے ادب سے کہا، ''فوق الادب'' والی بات ہے۔ کوئی گستاخی مقصود نہیں۔ عرض کرتا ہوں اور بے دھڑک پڑھا

نہ کرو خیال ''وی سی'' نہ فریب ''ڈین'' کھاؤ
وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَاءُ

شعر کیا پڑھا، پانچ کلو گرام کا دھماکا ہو گیا۔ ہائی کورٹ کے جج صاحب نے جو اس بورڈ کے رکن تھے مجھ سے کہا، ”ڈاکٹر صاحب، آپ کا انٹرویو ختم۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔“ میں واپس آ گیا۔ ڈاکٹر مظفر حسین جب باہر آئے تو انہوں نے یہ شعر ہر ملنے، آنے جانے والے، دوست، احباب سب کو سنا دیا۔ سارے کیمپس میں شہرا ہو گیا اور پھر سارے شہر میں چرچا ہو گیا۔

اگلے دن گیارہ بجے کی چائے پر اختر صاحب نے مجھ سے کہا، ”بھائی! کل آپ نے کیا شعر پڑھ دیا۔“ اختر صاحب شعر و شاعری سے دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا یہ پوچھنا تعجب خیز تھا۔ بولے ”جج صاحب بہت ہنس رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بزرگوں سے سُنا ہے اور کتابوں میں پڑھا ہے کہ پُرانے زمانے میں برجستہ شعر کہتے تھے۔ آج ایسے ایک برجستہ گو کو آنکھ سے دیکھ لیا۔ مُسکرائے ڈاکٹر احسان رشید صاحب بھی تھے مگر اُن کی ہنسی میں عالمانہ متانت تھی۔“

ڈاکٹر احسان رشید اختر صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اُن پر پورا پورا اعتماد کرتے تھے۔ دونوں علی گڑھ کی روایت کے حامل تھے۔ وقت تیزی سے گزر تا رہا۔ ڈاکٹر احسان رشید کو حکومت پاکستان نے اُردن میں سفیر مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اردن چلے گئے۔ اس کے بعد کا زمانہ بڑا مشکل تھا اور میرے تعلقات کی وجہ سے اختر صاحب کی بھی آزمائش سخت تھی۔

پھر وائس چانسلر ڈاکٹر جمیل جالبی ریٹائرڈ انکم ٹیکس کمشنر نے چارج لیا۔ شریف، نیک نام، معاملات و مسائل پر گہری نظر رکھنے والے۔ دفتری پیچیدگیوں کو بخوبی سمجھنے والے۔ جالبی صاحب نے آتے ہی اختر صاحب سے مشورہ کیا اور کہا، ”مجھے احساس ہو رہا ہے کہ جانے والے اپنے حلقے کو تاکید کر گئے ہیں کہ مجھے ہر طرح تنگ کیا جائے اور ناکام بنایا جائے۔“ اختر صاحب نے رائے دی کہ آپ فوراً آرٹس، سائنس اور تجارت کے روسائے کلیہ جات کی ایک میٹنگ کیجیے۔ سینئر اساتذہ کو بھی مدعو کیجیے اور دریافت کیجیے کہ جو صورت حال ہے اُس میں کیا پالیسی اختیار کرنا چاہیے۔ میٹنگ ہوئی اور بڑی کامیاب رہی سب نے کھل کر بات کی۔ تعاون کا یقین دلایا اور کہا کہ پچھلے لوگ جو خرابیاں چھوڑ گئے ہیں اُنہیں فوری دور کیا جائے۔ داخلے کے سلسلے میں لڑکوں کی ایک بھوک ہڑتال چل رہی تھی سب امور پر غور کیا گیا۔ آزادانہ گفتگو ہوئی، فیصلے ہوئے۔ مختلف ذمہ داریوں سے مستعفی ہونے والوں کی جگہ دوسرے اساتذہ نامزد ہوئے۔ گاڑی چل پڑی اور خوب

چلی۔ جالبی صاحب نے اختر صاحب کے مشورے کو بہت سراہا۔

جالبی صاحب کے چارج لینے کے دو تین دن بعد صبح نو بجے اختر صاحب کا خاص نائب قاصد میرے پاس آیا اور کہا، "اختر صاحب نے بلایا ہے۔" میں نے کہا، "میں حسب معمول گیارہ بجے آؤں گا۔" اُس نے کہا، "سر نے یہ کہا ہے کہ ساتھ لے کر آنا۔" مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی اہم بات ہے، لہٰذا ساتھ ہو لیا۔ اختر صاحب کے یہاں پہنچا تو انہوں نے کچھ کہے بغیر وائس چانسلر کے کمرے کا ملحقہ دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا، "اندر چلے جایئے۔" میں اندر چلا گیا۔ جالبی صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا، "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں کام کروں تو فوراً رجسٹرار کے کمرے میں جا کر کرسی سنبھال لیجئے۔" میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ برسوں کی رفاقت، دن رات کے ملنے جُلنے کا خیال آیا اور خاموشی سے رجسٹرار کے کمرے میں جا کر رجسٹرار کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جالبی صاحب کمرے میں آئے۔ کہنے لگے، "کمرا بھی اچھا ہے اور بیٹھنے والا اُس سے بھی اچھا۔" یہ کہہ کر چلے گئے۔ رُکا ہوا دفتری کام شروع ہو گیا۔

جالبی صاحب بڑے کامیاب وائس چانسلر ثابت ہوئے، انہوں نے اختر صاحب کے مشورے سے جن لوگوں کا انتخاب کیا وہ سب بہت مخلص، کار گزار اور سوجھ بوجھ والے لوگ تھے۔ تھوڑے ہی دن میں ساری غلاظت صاف ہو گئی۔ یونیورسٹی میں قاعدے قانون کے مطابق کام ہونے لگا۔

اختر صاحب کے یہاں گیارہ بجے کی جو چائے ہوتی تھی اُس میں بھی جانے والے وائس چانسلر نے رخنہ اندازی کی کوشش کی تھی۔ وہ گیارہ اور ساڑھے گیارہ کے درمیان ملحقہ دروازہ کھولتے، جھانکتے اور دیکھتے کہ ہم دونوں چائے پی رہے ہیں اور کچھ کہے بغیر واپس چلے جاتے۔ گیارہ بجے کی چائے کا سلسلہ جالبی صاحب کے دور میں بھی جاری رہا۔ انہیں معلوم تھا کہ ہم دونوں خاموشی سے کہیں چائے پیتے ہیں مگر انہوں نے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔

جالبی صاحب کے دور میں اختر صاحب کی سبک دوشی کا وقت آگیا۔ انہیں ایک توسیع دی گئی جب توسیع ختم ہو گئی تو اختر صاحب شیوخ الجامعہ کے اعتماد اور رفاقت کا ست لڑا گلے میں ڈالے، بازو پر ایک قائم مقام شیخ کا بازو بند باندھے اہتمام سے رخصت ہو گئے۔ وہ یونیورسٹی کی زندہ تاریخ تھے۔

اختر صاحب کے سبک دوش ہونے سے مجھے بڑا رنج ہوا۔ اُن کے جانے کے بعد میں پھر اُن کے کمرے میں کبھی نہیں گیا۔ وائس چانسلر سے بات کرنے کے لیے بڑے دروازے سے جاتا تھا اور اختر صاحب کو یاد کرتا جاتا تھا۔ فون پر گیارہ بجے اُن سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ پھر میں بھی سبک دوش ہو گیا۔ اختر صاحب سے گفتگو جاری رہی۔

میں یونیورسٹی سے سبک دوش ہوتے ہی انجمن ترقی اردو میں 'مشیر علمی و ادبی' مقرر ہو گیا۔ انجمن کا دفتر اختر صاحب کے گھر کے قریب تھا لہٰذا وہ گیارہ بجے انجمن آجاتے۔ چائے پیتے، بسکٹ کھاتے اور تھوڑی بہت بات چیت ہو جاتی۔

اختر صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد گھر میں خاموش بیٹھ گئے تھے لیکن کام کرنے والے اور مخلص آدمی بیکار نہیں رہ سکتے۔ موتمر عالم اسلامی کے سیکریٹری ڈاکٹر انعام اللہ خان نے انہیں موتمر میں بلا لیا۔ موتمر کا دفتر گلشن اقبال میں تھا یہاں آکر اختر صاحب کی وضع میں تبدیلی ہو گئی۔ یونیورسٹی وہ گاڑی میں آتے تھے یہاں بس میں آنا پڑتا تھا اس لیے شیروانی پہننا ترک کیا اور صدری پہننے لگے۔ انہیں شیروانی کے بغیر دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ ان کی شیروانی علی گڑھ یونیورسٹی کی روایت اور کراچی یونیورسٹی کے دبدبے کا نشان تھی۔ اختر صاحب وہ اختر صاحب ہی نہیں رہے۔ ہنستے بولتے تھے۔ حسب معمول کام میں مشغول رہتے تھے۔ موتمر میں ان کا بڑا دبدبہ تھا لیکن یونیورسٹی والے شیروانی پوش اور موتمر میں صدری پہننے والے اختر صاحب میں بڑا فرق تھا۔ لیکن وہ اس فرق سے ملول نہیں ہوئے، ہنس بول کر گزارتے رہے اور زمانے کی نیرنگی پر دیکھتے رہے۔ تاہم اس دور میں مجھے وہ "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع" کے مانند نظر آتے تھے۔

انجمن کے دفتر اور موتمر کے دفتر میں خاصا فاصلہ تھا۔ اس لیے کچھ دن اختر صاحب سے روزانہ دن کے گیارہ بجے فون پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ انجمن نے اپنے دفاتر کے لیے موتمر کے بالکل قریب ایک عمارت خرید لی۔ دفاتر وہاں منتقل ہو گئے اور میں اختر صاحب کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ کیسی خوشی ہوئی "باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رفیق۔" اب دستور یہ ہو گیا کہ ایک دن گیارہ بجے میں موتمر کے دفتر جاتا چائے پیتا، بسکٹ کھاتا تھوڑی دیر باتیں کرتا۔

واپس آجاتا، دوسرے دن گیارہ بجے اختر صاحب انجمن آتے۔ چائے پیتے، بسکٹ کھاتے تھوڑی دیر باتیں کرتے اور چلے آتے۔

ڈاکٹر انعام اللہ خان کا انتقال ہو گیا۔ راجہ ظفر الحق موتمر کے سیکریٹری جنرل ہو گئے۔ وہ موتمر کا صدر دفتر اسلام آباد لے گئے لیکن ایک ذیلی دفتر کراچی میں بھی رہا اور اختر صاحب اُس دفتر کے نگراں ہو گئے۔ ایک دن راجہ صاحب آئے ہوئے تھے۔ اختر صاحب نے کہا، "چلیے راجہ صاحب سے مل لیجئے بڑے نفیس آدمی ہیں۔" میں اُن کے ساتھ راجہ صاحب کے پاس گیا۔ ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ "برسوں پرانی بات ہے پاکستانی زائرین کا قافلہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے عرس میں شرکت کرنے دلّی گیا تھا۔ میں اس قافلے کا سربراہ تھا اور آپ اور شیخ رشید دونوں قافلے میں شامل تھے سیاہ شیروانیاں پہنے دلّی کے تاریخی آثار دیکھتے رہتے تھے۔ اکثر گفتگو رہتی تھی۔" راجہ صاحب فوراً پہچان گئے۔ بڑے خوش ہوئے، حال احوال دریافت کرتے رہے۔ ملاقات کے بعد اختر صاحب نے کہا، "آپ نے بہت یاد رکھا۔" اس ملاقات کے بعد راجہ صاحب سے کوئی اور ملاقات نہیں ہوئی۔

گیارہ بجے کی چائے کا سلسلہ بہت دن جاری رہا۔ پھر یہ ہوا کہ میں بیمار ہو گیا اور انجمن سے تعلق منقطع ہو گیا۔ اب پھر وہی گیارہ بجے فون پر گفتگو، خیریت اور احوال پُرسی۔ میں نے اس دوران گزرے ہوئے لمحوں کو جوڑ کر اختر صاحب کی شخصیت اور ان کی زندگی کا تجزیہ کیا۔ وہ بڑے مخلص، جفاکش، ہمدرد اور ہر شخص کی مدد کرنے والے انسان تھے۔ شعبہ صحافت کے ڈاکٹر انعام الرحمن بڑے گم سُم سے آدمی تھے۔ اختر صاحب سے دوستانہ تھا۔ انعام الرحمن کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ اُن کا انتقال ہو گیا تو انعام الرحمن دن رات اُن کی قبر پر بیٹھے رہتے تھے۔ سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ صرف اختر صاحب جاتے تھے اور یہی نہیں اُن کی پنشن کا چیک باقاعدہ پہنچاتے تھے۔ مومن صدیقی اسسٹنٹ رجسٹرار تھے اچانک انتقال ہو گیا تو اُن کی بیوی کی پنشن کا چیک اختر صاحب خود لے کر جاتے تھے اور اُن کے حوالے کرتے تھے۔

اختر صاحب ہر شخص کی مدد کرتے تھے، بہت سے لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں آتے تھے۔ دفتر والے اختر صاحب کا نام بتا دیتے۔ جان نہ پہچان۔ وہ لوگ اختر صاحب سے ملتے اور اختر

صاحب بڑی خوش دلی سے ان کی مدد کرتے، کام کروا دیتے۔

اختر صاحب سے فائدہ اٹھانے والے بہت تھے۔ بیش تر ایسے تھے جو اختر صاحب کی ملازمت کے دوران اپنا اُلو سیدھا کرتے رہے۔ ایک صاحب تھے ادھر اُن کے خاندان میں کسی لڑکے نے میٹرک پاس کیا اور وہ اختر صاحب کے قدموں میں لوٹنے لگے۔ اُس وقت تک لوٹتے رہے جب تک کہ لڑکا کام سے لگ نہیں گیا۔ اس طرح انہوں نے اپنے خاندان کے بہت سے لڑکوں کو یونیورسٹی سے نتّھی کر دیا۔ مگر جب اختر صاحب ریٹائر ہو گئے تو انہوں نے طوطا چشمی کا واضح ثبوت دیا۔ "کون اختر صاحب۔ اچھا۔ وہ جو وائس چانسلر کے سیکریٹری تھے۔ ہوں گے میں انہیں نہیں جانتا۔" ایک برخوردار کو اختر صاحب نے ہونہار دیکھ کر تعلیم کی راہ پر لگا دیا۔ بی اے کرا دیا، ایم اے کرا دیا۔ ایم اے ہو گئے تو انہیں ایک شعبے میں لیکچرر لگوا دیا۔ کہاں تو وہ اختر صاحب کا کلمہ پڑھتے، کہاں یہ کور چشمی کہ انہیں پہچاننے سے بھی منکر ہو گئے۔ دنیا کا تماشا اور زمانے کا نیرنگ عجب ہے۔ ادھر کام نکلا اور اُدھر صاحب سلامت ختم۔ اختر صاحب کا یہ حال کہ جس سے صاحب سلامت ہو گئی زندگی بھر جاری رہی۔

ایک بنگالی لڑکا میرے یہاں ملازم تھا۔ ہوشیار، پھرتیلا اور اچھا کام کرنے والا تھا۔ ایک دن اختر صاحب نے دیکھا تو مجھ سے کہا "اسے یونیورسٹی میں کیوں نہیں رکھوا دیتے۔ یونیورسٹی کو ایک اچھا کارکن مل جائے گا۔" میں نے کہا، "کس حیثیت سے۔" کہنے لگے "آپ رجسٹرار ہیں ایک گھریلو اردلی رکھنے کے حق دار ہیں، رکھ لیجئے۔" وہ لڑکا ملازم ہو گیا۔ اٹھائیس برس میرے یہاں رہا۔ میں نے اُس کی شادی کرا دی۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ پھر اُس نے اپنا مکان بنا لیا اور میری اجازت سے وہاں منتقل ہو گیا۔ اختر صاحب جب مجھ سے ملتے اُس کی خیریت دریافت کرتے اور جب میرے یہاں آتے تو اُسے بُلوا کر بات چیت کرتے۔ آج بھی وہ اختر صاحب کو بڑی محبت سے یاد کرتا ہے۔

اختر صاحب بڑے وضع دار آدمی تھے۔ دوستوں کے پکے دوست۔ دشمن شاید کسی کے بھی نہیں تھے۔ میں نے اُن کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ خوش مزاج تھے۔ بعض لوگوں سے ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا۔ ایل لمبے صاحب جب وہ اختر صاحب کے کمرے میں آتے تو اختر

صاحب انہیں ادبدا کر چھیڑتے۔ وہ بھی تُرکی بترکی جواب دیتے۔ اختر صاحب کہتے، ”یہ تمہارا نہیں تمہارے قد کا قصور ہے۔“ اس وجہ سے اختر صاحب اُن پر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ ویسے اختر صاحب میں بڑی شائستگی تھی، اساتذہ سے عزت اور تکریم سے پیش آتے تھے۔ دفتر کے لوگوں سے بھی سنجیدگی اور متانت سے گفتگو کرتے تھے۔

اختر صاحب عید اور بقر عید کے اگلے دن ٹھیک گیارہ بجے میرے یہاں آتے تھے۔ اُنہیں میری بیوی تاج بیگم کے ہاتھ کے دہی بڑے بہت پسند تھے۔ کہتے تھے، ”دہی بڑے کھانے آیا ہوں۔ عید ملنا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔“ تاج بھی اُن کے لیے بڑے اہتمام سے دہی بڑے تیار کرتی تھیں۔ اختر صاحب کھاتے جاتے اور تعریف کرتے جاتے۔ اب عید بقر عید کے اگلے دن تاج بڑے اہتمام سے دہی بڑے بناتی ہیں۔ ہم سب اختر صاحب کو یاد کرتے ہیں اور آنے جانے والوں کو دہی بڑے کھلاتے ہیں۔

بعض باتوں میں اختر صاحب کا انداز غیر معمولی تھا۔ چائے میں شکر کے چار چمچے ڈالتے تھے کوئی ٹوکتا تو کہتے، ”میاں زندگی میں اور کون سی مٹھاس رہ گئی ہے۔ چائے میں ذرا سی مٹھاس مل جاتی ہے۔“ جفاکش ایسے کہ ایک سو تین بخار میں بھی معمول کے مطابق کام کرتے رہتے تھے۔ صحت اچھی تھی۔ میں نے انہیں کبھی دفتر سے غیر حاضر نہیں دیکھا مگر......

ایک رات میں بخار میں بُھن رہا تھا۔ فون آیا میں نے فون اُٹھایا۔ اختر صاحب کے بیٹے بات کر رہے تھے۔ ”ابا چلے گئے۔“ میں کچھ اور سُن نہیں سکا۔ اختر صاحب چلے گئے۔ کراچی یونیورسٹی کا ایک ستون گر گیا۔ وہ جو یونیورسٹی کی زندہ تاریخ تھا وہ گزر گیا۔ اب یونیورسٹی کے بارے میں کوئی بات پوچھنا ہوگی تو کس سے دریافت کروں گا۔ مہر و وفا، وضع داری اور شائستگی کے ایک روشن مینار گر گیا۔ ساری رات بخار میں بھنتا رہا اور یہی سوچتا رہا۔ غالب کا مصرع ”ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔“ افسوس اختر صاحب چلے گئے۔ رفاقتوں، محبتوں، خلوص اور وفا کی یادوں کا ایک انمول خزانہ چھوڑ گئے۔

۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۳۵ء

۱۴ جنوری ۲۰۱۴ء

لطیف الزماں کی یاد میں

جہاں تک یاد پڑتا ہے، ۱۹۴۵ء کا آخری دور تھا۔ آگرہ فورٹ ریلوے اسٹیشن کے ای آئی آر والے پلیٹ فارم پر شام کو بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ "اسٹیشن نواز" طلبہ کے گروہ نظر نوازی اور ایکٹی ویٹی کرتے رہتے تھے۔ پلیٹ فارم کے گیٹ پر انھیں لوگوں کا ایک ہم سن ریلوے کی وردی پہنے ٹکٹ چیکر اسٹول پر بیٹھا نظر آتا۔ چھوٹا قد، گول چہرہ۔ روشن آنکھیں، لیکن طلبہ کی شرارتوں سے ڈرا ڈرا اور سہما ہوا۔ طلبہ اس سے خوب لطف لیتے۔ لطف کیا لیتے۔ تنگ کرتے اور آزار پہنچاتے۔ وہ بیچارہ سٹ پٹایا رہتا۔ اس کا بھی دل چاہتا ہو گا کہ میں بھی ان طلبہ میں شامل ہوتا تو کیسا اچھا ہوتا۔ شرارت کرنے والے کبھی اسے دھکّا دے دیتے اور اسٹول پر خود بیٹھ جاتے۔ وہ خاموش دیکھتا رہتا۔ سب سے زیادہ شرارتیں "لمبے شاہ" کی جانب سے ہوتی تھیں۔ لمبے شاہ آگرے کے ایک نہایت معزز روحانی ادبی اور علمی گھرانے کے فرد تھے اور اپنے لقب کی مناسبت سے نہایت لمبے اور گوشت پوست کا پہاڑ تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے اور پھر نظر بچا کر ٹکٹ چیکر کے ایک چپت رسید کرتے۔ لڑکے قہقہے لگاتے۔ یہ ڈرامہ ہر شام کو پابندی سے ہوتا تھا۔

پاکستان قائم ہو گیا۔ نہ وہ آگرہ رہا نہ آگرہ فورٹ کا اسٹیشن۔ نہ وہ صورتیں نہ وہ شرارتیں۔ ِ"سب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں۔" ایک شام بندر روڈ سے گزر رہا تھا تو وہ ٹکٹ چیکر نظر پڑے۔ انھوں نے مجھے اور میں نے انھیں پہچانا۔ فوراً قریب کے ایک ایرانی ہوٹل میں جا بیٹھے۔ حال احوال بیان ہونے لگا۔ یہ وہ دور تھا کہ ہر جان پہچان والا قریبی عزیز اور جان چھڑکنے والا معلوم ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ لطیف الزماں خان نام ہے۔ علی گڑھ کے قریب کسی جگہ کے باشندے تھے۔ پاکستان بنا تو یہاں آ گئے ہیں۔ اثاثوں میں سو ڈیڑھ سو کتابیں، تر ترقی پسند ادب کا ذخیرہ ہے اور ایک سائیکل ہے۔ مکان ملا نہیں۔ کتابیں ایک دوست کے یہاں امانت رکھوا دی

ہیں۔ دن بہر طور گزر جاتا ہے۔ رات کا پہلا پہر بھی یار دوستوں میں کٹ جاتا ہے۔ پھر لی مارکیٹ کے چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے "خیریت آباد" ریستوران میں پہنچتے ہیں۔ سائیکل میں تالا لگا کر فٹ پاتھ پر کھڑی کرتے ہیں اور اسی طرف رخ کر کے ریستوران میں بیٹھ جاتے ہیں۔ بیرے سب کے سب پہچان گئے ہیں۔ اس لیے کچھ نہیں کہتے۔ ہر دو گھنٹے کے بعد چائے دے جاتے ہیں۔ صبح منھ ہاتھ دھو کر ناشتا کرتے ہیں اور کام پر چلے جاتے ہیں۔ مجھے بڑا ترس آیا۔ میں تو اپنے ہی کو ستم رسیدہ سمجھتا تھا۔ "وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے۔"

لطیف الزماں سے فوراً دوستی ہو گئی۔ کوئی ادبی تقریب ہوتی تو ہم دونوں ساتھ جاتے۔ پاکستان چوک پر انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں بیٹھے رہتے۔ یہ لطیف الزماں کی ملازمتوں کا تجرباتی دور تھا۔ میں ان دنوں ریڈیو پاکستان میں تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ لطیف الزماں ریڈیو کے دفتر میں بیٹھے فائلیں دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا، "ہم سے این او سی لیے بغیر یہاں کیسے؟" کہنے لگے، "ہم تو بہتا پانی رمتے جوگی ہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔" میں نے کہا، "جب یہاں آ ہی گئے تو شعبہ موسیقی میں بھی آجاتے۔ وہاں بہت سے اچھے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی۔" کہنے لگے، "دل تو میرا بھی چاہتا ہے مگر ایک تو وہاں میرا پرانا دشمن لمباشاہ بیٹھا ہوا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ملازمت عارضی ہے۔ مجھے تو پڑھنے پڑھانے کا کام کرنا ہے۔ اس لیے ملازمت کے تجربے کرتا رہتا ہوں۔"

لطیف الزماں نے اردو کالج میں داخلہ لے لیا۔ پڑھنا شروع کر دیا۔ کالج کے نمایاں طالب علموں میں ان کا نام بھی آنے لگا۔ میں اردو کالج اکثر جاتا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ میرا پرانا کالج تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحبؒ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل ہو جاتی اور دوسرے پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر سے شرف نیاز حاصل ہو جاتا۔ لطیف الزماں سے اکثر ملاقات ہوتی۔ وہ ہمیشہ نصابی سرگرمیوں میں غیر نمایاں اور غیر نصابی سرگرمیوں میں سرگرم نظر آتے تھے۔

لطیف الزماں نے بی اے کر لیا۔ پھر انگریزی میں ایم اے کرنے کراچی یونیورسٹی گئے۔ یونیورسٹی میں ان کے ہم سبق معروف افسانہ نگار ممتاز شیریں اور کلیم الرحمن مرحوم تھے جو آخر میں ڈاکٹر اور شعبہ انگریزی کے صدر، پھر رئیس کلیہ فنون ہو گئے تھے۔

یہ دور بھی گزر گیا۔ ایک دن ملے تو کہنے لگے، "ملتان جا رہا ہوں، وہاں کے سرکاری کالج میں میرا تقرّر ہو گیا ہے۔" میں نے کہا، "تو اب یہ پانی ملتان بہہ گیا ہے۔ خدا ملتان والوں کو تمہاری دشت نوردی سے محفوظ رکھے۔"

پھر ایک دن خبر ملی کہ لطیف الزماں کا تبادلہ "ڈیرا غازی خان" ہو گیا ہے اور وہ اپنا ڈیرا ڈنڈا لے کر وہاں سدھار گئے ہیں۔ لیکن وہاں کچھ ہی دن رہنا ہوا اور لطیف الزماں "گرد و گرما۔ گدا و گورستان" کی رہگزر پر قطب بن کر بیٹھ گئے اور ورد کرتے رہے کہ "بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں۔" ورد کرتے کرتے ملتان کے قطب ہو گئے اور ساری زندگی فرائض قطبیہ انجام دیتے رہے، "اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ، اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو۔"

لطیف الزماں اچھے استاد تھے۔ ملتان میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ میں نے خود دیکھا کہ ملتان میں صبح سے شام تک طلبہ ان سے پڑھنے آتے رہتے تھے گھر طلبہ سے بھرا رہتا تھا۔ کالج میں بھی ان کا وقار تھا۔ ساتھیوں میں مقبول تھے۔ نئے آنے والے ان کا احترام کرتے تھے۔ پرانے ان سے محبت کرتے تھے۔ ملتان میں وہ مجھے اپنے کالج لے گئے تو میں نے اساتذہ کو ان کا گرویدہ پایا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر ایک سے ہنستے بولتے تھے۔ محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ جو ایک پیشہ ورانہ مسابقت ہوتی ہے ان میں نہیں تھی۔ کھلے دل سے ملتے تھے اور محبت و نفرت دونوں میں عمیق تھے۔ انھیں غالب سے بے پناہ محبت اور پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ غالب کے حوالے سے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا جس کی بڑی دھوم تھی۔ اہل علم و دانش میں سے جو کوئی بھی ملتان جاتا وہ ان کے مکان "غالب نما" پر حاضری دے کر یہ نایاب و نادر ذخیرہ ضرور دیکھتا اور ان کی محنت کی داد دیتا۔ ایک دن وہ میرے یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں نے کہا، "ایک ایسا تحفہ تمہارے لیے رکھا ہے کہ تم پھڑک جاؤ گے۔" یہ کہہ کر میں نے لاہور والے عبداللہ انور بیگ کی انگریزی کتاب "غالب" ان کے سامنے رکھ دی۔ کتاب دیکھی تو کہنے لگے، "یہ میرے ذخیرے میں نہیں ہے۔ میں نے نام سنا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ بہت معمولی ہے لیکن ہے تو غالب کے بارے میں۔" میں نے کہا، "ہاں اسی وجہ سے ان کی اقبال

والی کتاب "PoetoftheEast" کے سامنے اس کا چرچا نہیں ہوا۔" لطیف الزماں نے وہ کتاب فوراً اپنے ڈب میں رکھ لی۔

ایک اور دفعہ میں نے انھیں غالبؔ کی کلیات فارسی کا ایک نسخہ دکھایا۔ یہ نول کشوری نسخہ بڑے سائز پر تھا۔ دیکھا تو کہنے لگے، "یہ یہاں کیوں ہے، اس پر تو میرا حق ہے۔" میں نے جواب میں کہا، "تمہاری اردو تو صحیح ہے نہیں، چلے ہو فارسی کلیات پر حق جتانے۔" بہت ہنسے۔ بولے، "یہ جملہ تمہیں کہہ سکتے ہو۔ کوئی اور کہتا تو__ " میں نے کہا، "لے لو۔ کیا یاد کروگے۔ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔"

انھوں نے کتاب فوراً قبضے میں کر لی۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو میں نے الماری کھول کر کلیات غالب فارسی کا دوسرا نسخہ نکالا۔ یہ متوسط سائز اور سفید کاغذ پر چھپا ہوا تھا۔ لطیف الزماں یہ نسخہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ کہنے لگے، "یہ کیا حرکت ہے" میں نے کہا، "یہ وہ نسخہ ہے جو میرے زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ ذخیرہ اندوزی کے لیے نہیں ہے۔ سمجھتے ہو؟ تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا ہوں میں۔"

لطیف الزماں کی غالب پرستی کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ وہ بمبئی گئے اور غالبؔ کے مشہور محقق کالی داس گپتا رضا کے مہمان ہوئے۔ جب وہ گپتا جی کے گھر پہنچے تو دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا" صبح سے شام تک غالبؔ ہی غالبؔ۔ مسز گپتا نے کہا، "پہلے تو گھر میں ایک ہی پاگل تھا اب ایک اور پاگل بھی آگیا ہے۔" یہ واقعہ مجھے لطیف الزماں نے خود سنایا تھا اور بہت ہنسے تھے۔

لطیف الزماں پروفیسر رشید احمد صدیقی پر دل و جان سے فدا تھے۔ بڑا کام کیا ہے ان کے حوالے سے اور بڑی محبّت سے کام کیا ہے۔ ان کی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے خطوط کے مجموعے مرتب کیے ہیں۔ بڑے اہتمام سے شائع کئے ہیں اور بڑے معلومات افزا حواشی مرتّب کیے ہیں۔ رشید صاحب کے بعض شاگرد ایسے بھی تھے جو ان سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کے بعد ان کے حریف بن بیٹھے تھے۔ لطیف الزماں ایسے تمام لوگوں کے جانی دشمن تھے۔ ان تمام لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خاں صاحبی نمایاں ہو جاتی اور وہ پورے جوش و خروش سے ان کی ہجو کرتے

تھے۔ ''اس کی نفرت بھی عمیق'' اس کی محبت بھی عمیق پر پوری طرح کاربند تھے۔

رشید صاحب کے خطوط مرتب کرنے سے لطیف الزماں کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ انھیں اچھے خط لکھنے کا سلیقہ آگیا۔ رشید صاحب مختصر نویس تھے۔ عموماً پوسٹ کارڈ استعمال کرتے تھے اور چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کے ماہر تھے۔ اپنی دوسری تحریروں کے برعکس ان کے خطوط مختصر اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا بڑا کامیاب نمونہ تھے۔ ان مختصر خطوط میں بڑی دل نوازی اور ایک خاص ادیبانہ شان پائی جاتی تھی۔ لطیف الزماں نے طویل خط لکھے۔ آبشار ہے کہ اچھل رہا ہے۔ قطرے رقص کررہے ہیں۔ سورج کی کرنوں میں جگمگارہے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مکتوب نگاری کی روایت کو ای میل اور ایس ایم ایس نے غارت کردیا۔ اس روایت پر پہلا حملہ ٹیلیفون کی طرف سے ہوا تھا۔ اس حملے کے بعد حملوں کا جو تانتا بندھا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا۔ بچّے پوچھتے ہیں، خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ای میل بھیج دیجیے۔ انھیں کیا معلوم کہ خطوں میں لکھے جانے والے فقرے کتنا اہم ادبی سرمایہ ہیں۔ لطیف الزماں نے اس سرمائے کو نہ صرف محفوظ رکھا ہے بلکہ اس کی توسیع بھی کی ہے۔ ان کا کوئی خط پڑھ لیجیے۔ مزے مزے کی باتیں ہیں۔ چٹکیاں ہیں، چہل ہے، علمی معلومات ہے سبھی کچھ ہے مگر ''نامے کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں'' کا دور گزر چکا۔

معروف ادیب اور نثر و نظم سبھی کچھ لکھنے میں ''شہرت کی ہوس'' سے بے نیاز نظیر صدیقی سے بھی ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ لطیف الزماں نے انھیں بڑے دل نواز خطوط لکھے ہیں۔ یہ مجموعہ لطیف الزماں کے رواں اسلوب، خلوص، ذاتی پسند وناپسند اور ذہنی رویّوں کا بڑا دل نواز مجموعہ ہے۔ پڑھتے جائیے اور ان کے ادبی اور شخصی مزاج کے حسن ورعنائی کی داد دیتے جائیے۔

لطیف الزماں دریا دل آدمی تھے۔ پاکستان میں شائع ہونے والی کتابیں خریدتے رہتے۔ بنڈل بندھواتے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھجواتے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ بھجواتے۔ جامعہ ملیہ بھجواتے۔ اور خوش ہوتے۔ یہ خیرِ جاریہ ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ اور بھی قابلِ ذکر ہے۔ میری بیگم تاج بیگم فرخی گورنمنٹ کالج کورنگی (۴) کی پرنسپل مقرر ہوئیں۔ کالج نیا کھلا تھا۔ ایک پرانے اسکول میں قائم کردیا گیا تھا جس کی عمارت میں دروازے اور کھڑکیاں بھی

نہیں تھیں مگر ہمت اور حوصلہ تھا کالج چلنے لگا۔ ایک بار لطیف الزماں میرے یہاں آئے۔ انھوں نے کالج کے بارے میں پوچھا۔ تاج بیگم نے کہا، ”ریزہ ریزہ جمع کر رہی ہوں۔ بہت سی چیزیں مل گئی ہیں۔ بہت سی چیزوں کی تلاش ہے۔ لائبریری ہے۔ کتابیں نہیں ہیں۔“ فوراً بولے، ”پانچ ہزار کی کتابیں میری طرف سے مگر میری دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میری مرحوم بیوی کی ایک تصویر لائبریری میں لگائی جائے اور دوسری یہ کہ لائبریری کو میری بیوی کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔“ دونوں کام ہو گئے اور اُنھوں نے کتابیں بھجوائیں۔ اگلے سال انھوں نے پھر پانچ ہزار کی کتابیں بھجوائیں اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کی ایک صاحبزادی ایک دفعہ کالج آئیں اور اپنی والدہ کی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور لطیف الزماں کو اطلاع دی کہ ”لائبریری میں اماں کی تصویر لگی ہوئی ہے۔“

طلبہ اور بالخصوص تحقیق کے طلبہ ان سے اور ان کے ذخیرہ کتب سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ بڑی خوش دلی سے کتابیں دکھاتے اور معلومات فراہم کرتے تھے۔ ملتان ہی میں نہیں لاہور اور کراچی میں بھی ان کی دھاک تھی۔ بڑی مقبول علمی شخصیت سمجھے جاتے تھے۔

یہ سب تو تھا مگر تھے پکے خاں صاحب، اکثر بد نفس انھیں دھوکے دیتے۔ ذہنی اور مالی ایذا پہنچاتے لیکن وہ ترکی بترکی جواب دیتے تھے۔ ایک دفعہ وہ اپنی ایک بوڑھی خالہ کو جو علی گڑھ کے قرب وجوار کے کسی دیہات میں رہتی تھیں، پانچ ہزار روپے بھیجنا چاہتے تھے مگر کوئی صاحبِ اعتبار نظر نہیں آتا تھا۔ اتفاق سے دلّی کے ایک مشہور محقق اور چرب زبان لاہور آئے۔ لطیف الزماں سے بھی ملاقات ہوئی۔ لطیف الزماں نے انھیں مردِ معتبر سمجھ کر ان پر بھروسا کیا اور رقم پہنچانے کی فرمائش کی۔ وہ بڑی خوشی سے تیار ہو گئے۔ کہنے لگے، ”جیسی آپ کی خالہ ویسی میری بھی خالہ۔ آپ نے مجھ پر اعتبار کر کے میرا وقار بڑھایا۔ میں دلّی پہنچتے ہی علی گڑھ جاؤں گا اور بہ نفسِ نفیس خالہ جان کو رقم پہنچا دوں گا۔‘ لطیف الزماں نے رقم انھیں دے دی۔ اب یہ ہوا کہ خالہ کے خط پر خط چلے آرہے ہیں کہ بیٹا رقم تو پہنچی نہیں۔ میں روز انتظار کرتی ہوں۔ ادھر روز خط پر خط دلّی جارہے ہیں کہ بھائی خدارا رقم پہنچا دو۔ بعض دلّی جانے والوں سے کہلوایا۔ انھوں نے کہا، ”کیسی رقم، کس کی رقم، مجھے کوئی رقم وقم نہیں دی۔“ صاف مکر گئے۔ پھر تو ”کانونِ سینہ“ لطیف

الزماں خاں میں خان صاحبی کا ایک شعلہ بھڑکا "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں کر سکتی۔" بس انھوں نے ایک "قصیدہ نثریہ بہ مدح آں جناب" رقم کیا جو کسی رسالے میں شائع ہو گیا۔ مگر صاحب ڈھیٹ ہو تو ایسا اور لے لیٹ ہو تو ایسا کہ اس نے لطیف الزماں کے مضمون کا جواب لکھا اور اپنی سیاہ کاریوں میں معتد بہ اضافہ کر لیا۔ لطیف الزماں نے ان کا لقب ہاضم تجویز کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔

یہ لطیف الزماں خاں کے جلال کا مظاہرہ تھا۔ عام طور پر وہ مخالفوں اور ایذا پہنچانے والوں کو معاف کرنے کے قائل تھے۔ "ہو گا یار، اگلا اپنا دل نوش کر لے۔ ہم کیوں وقت ضائع کریں۔"

ایک دفعہ میں ملتان گیا، لطیف الزماں کو اطلاع بھیج دی تھی اور عرش صدیقی کو بھی فون کر دیا تھا۔ گاڑی صبح سویرے ملتان پہنچی۔ اسٹیشن پر دونوں موجود تھے۔ اس وقت کسی نے مجھے بتایا کہ دونوں میں شکر رنجی ہے۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ "دونوں سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں۔" یہ مسئلہ عرش صدیقی نے بڑی خوبی سے حل کر دیا۔ مجھ سے کہا، "ڈاکٹر صاحب! آپ لطیف الزماں کے ساتھ جائیے۔ ان کا حق مجھ سے زیادہ ہے۔ میں جب جی چاہے گا آپ کو بلوالوں گا۔" چنانچہ میں لطیف الزماں کے ساتھ چلا گیا۔ مسئلہ حل ہو گیا۔ بعد میں مجھے کسی نے بتایا کہ شکر رنجی دور ہو گئی۔ وہ ایسے کہ لطیف الزماں کے صاحبزادے کی شادی تھی۔ کارڈ صدیقی صاحب کو بھی گیا تھا۔ وہ بڑی خوش دلی سے شادی میں شریک ہوئے اور شکر رنجی خندہ جبینی میں تبدیل ہو گئی۔

لطیف الزماں دوستوں کے دوست تھے۔ جاں نثار تھے۔ ایک دفعہ میرا ادیبوں کی ایک کانفرنس میں اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ کراچی میں سردی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ازراہ حماقت گرم کپڑے نہیں لے گیا تھا۔ وہاں سردی کا دور دورہ تھا شام کو سیشن کھلے میں ہوا۔ مجھے لگی سردی اور ایسی کہ کانپنے لگا۔ لطیف الزماں میرے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے، "کیا ہوا۔ یہ لرزہ کیوں طاری ہے؟" میں نے کہا، "بڑی سردی لگ رہی ہے۔" بولے، "یہی تو تم لوگوں کی شان ہے۔ موسم کا خیال نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا گرم کوٹ اتارا۔ میری طرف بڑھایا اور کہا، "اسے پہن لو۔" میں نے کہا، "میں نہیں پہنوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری سردی

تمھیں بیمار ڈال دے۔ میں خاموشی سے کھسکا جاتا ہوں۔" انھوں نے بڑا اصرار کیا لیکن میں خاموشی سے اپنی قیام گاہ واپس آگیا۔ صبح سویرے ناشتہ ہو رہا تھا کہ وہ آن پہنچے۔ کہیں اور ٹھہرے ہوئے تھے۔ بیٹھے، طبیعت پوچھی۔ پھر کہا، "کوٹ پہن لیتے تو زحمت سے بچ جاتے۔" میں نے کہا، "دو وجوہ سے نہیں پہنا ایک تو یہ کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری سردی تمہاری طرف منتقل ہو جائے دوسرے جب تم نے کوٹ اتارا تو مجھے اس میں تمہاری "خوئے بد" کی مہک آئی تھی۔ اس لیے نہیں پہنا۔" بہت ہنسے۔ کہنے لگے، "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم فقرے بازی میں بہت تیز ہو گئے ہو۔"

ایک طرف سخاوت کی یہ لہر بہر کہ تن کے کپڑے اتار کر پیش کر دیے۔ دوسری طرف یہ سرشوری کہ آن کی خاطر رشتے پر بھی لات مار دی۔ ان کے ایک قریبی عزیز جنھیں میں بھی جانتا تھا۔ ارباب بست و کشاد کی بد توفیقی سے ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہو گئے۔ ولایت بھی ہو آئے۔ اب تو جو میرے سوراجہ کے نہیں۔ آپے سے باہر ہو گئے اور متوسط طبقے کے عزیزوں کو نظر انداز کرنے لگے۔ لطیف الزماں ان کی دنیاوی بلندی کے بعد دو ایک دفعہ ان کے یہاں گئے مگر جب انداز اور رویوں میں حقارت اور بے توقیری دیکھی تو جانا چھوڑ دیا اور پھر کبھی ان کے یہاں کا رخ نہیں کیا۔ اتفاق سے میں ان عزیز کو جانتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے نادانستگی میں لطیف الزماں سے ان کی خیریت پوچھ لی۔ خیریت کیا پوچھی، میری خیریت نہیں رہی۔ لطیف الزماں نے ٹھیٹ خاں صاحبی لہجے میں اس طرح ان کی "مدح سرائی" کی کہ سارا معاملہ آئینہ ہو گیا۔ وہ صاحب لطیف الزماں کو دنیاوی فائدہ پہنچا سکتے تھے لیکن لطیف الزماں تو لطیف الزماں تھے اور اپنے ممدوح "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، مرزا اسد اللہ خان بہادر" کے بقول "دیوار بار منّت مزدور سے ہے خم + اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے۔" دشمن کا احسان کیسے اٹھاتے مرتے مرتے مر گئے مگر ان کے دروازے پر نہیں گئے۔

میرے لیے لطیف الزماں اور ملتان ہم معنی تھے۔ ملتان کا ذکر ہوتا تو لطیف الزماں یاد آتے۔ لطیف الزماں کی بات چھڑتی تو بات ملتان تک پہنچتی۔ میں نے ملتان انھیں کی رہ نمائی اور انھی کی آنکھوں سے دیکھا ہے ع جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے۔ جانے کہاں کہاں لے گئے۔ کس کس جگہ لے گئے 'گل گشت' کے غالب نما سے نکلے تو پڑوس کی کتابوں کی دکان پر پہنچے

اور پھر ملتان کے صاحبان کتاب کا مطالعہ شروع ہو جاتا۔ مقصود زاہدی کے مطب گئے۔ انھوں نے شام کو گھر پر مدعو کیا اور بڑی عمدہ رباعیاں سنائیں۔ ابن حنیف سے ملاقات ہوئی۔ میں ان کی سادگی، علم و فضل اور ان کے ذوق جستجو سے بہت متاثر ہوا۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نام و نمود سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد سے ملاقات ہوئی۔ مسعود اشعر کو دیکھا اور ان کے ہمّت مردانہ کے افسانے سنے۔ اردو اور انگریزی کے بہت سے اساتذہ سے ملا۔ انہی کے ساتھ 'تاجداران ملتان' کے آستانوں پر بھی حاضری ہوئی۔ بڑا لطف آیا۔ میں نے لطیف الزماں سے کہا، "یہ سارا لطف تمہاری وجہ سے ہے۔" کچھ بولے نہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے، "تم تو صوفی ہو۔ کچھ شیخ بہاالدین زکریا ملتانی کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے تذکرہ چھیڑا تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ شیخ کے حال احوال اور بزرگی کے ذکرِ انور نے طول کھینچا۔ بڑی دیر تک گفتگو رہی۔ سننے والوں نے لطیف الزماں سے میرے بارے میں پوچھا، کہنے لگے، "بزرگان کرام کی انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ ع اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

ان کا مکان 'غالب نما' علم و آگہی اور امن و عافیت کا گہوارہ تھا۔ بھابھی سادہ مزاج، وفا شعار، بچے ہونہار اور کیا چاہیے۔ رہ گئے لطیف الزماں تو وہ گہے مسکین اور گہے طرار۔ مکان بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ واقعی 'غالب نما' تھا۔ علم و آگہی کا مسکن اور شعر و ادب کا مخزن تھا۔

لطیف الزماں سال میں دو مرتبہ کراچی کا پھیرا کرتے تھے۔ ایک دفعہ گرمیوں میں آتے اور دوسری مرتبہ دسمبر کے آخری ہفتے میں آتے۔ سارے دوستوں اور جاننے والوں کے یہاں جاتے، پرانی باتیں دہرائی جاتیں۔ فقرے بازیاں ہوتیں۔ تبصرے ہوتے۔ مگر وہ پچھلے برس نہیں آئے۔ بیمار رہنے لگتے تھے۔ ایک دن اپنی بیماری کا ذکر کرنے لگے۔ میں نے کہا، "پریشان کیوں ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تمہارا نمبر نہیں آیا۔" تھوڑی دیر سوچا پھر کہنے لگے، "تم بڑے ہو یا میں بڑا ہوں۔" میں نے کہا، "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ علم میں، عمر میں، تجربے میں، آگہی میں، داد و دہش میں، سب میں بڑے ہو۔" انھوں نے تھوڑی دیر پھر تامل کیا۔ اور ذرا دیر بعد پوچھا، "تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے؟" میں نے تاریخ بتادی، کچھ دیر غور کیا، پھر بولے، "میں تم سے چار مہینے بڑا ہوں۔" میں نے کہا، "سبحان اللہ بڑوں کی بڑی باتیں۔ اب میں

تمھیں قبلہ بھائی صاحب کہا کروں گا۔" گھبرا کر کہا، "ایسا ہر گز نہ کرنا سب لوگ مجھے قبلہ بھائی صاحب کہنے لگیں گے۔" میں نے کہا، "کیا مضائقہ ہے تمھاری بزرگی کا عام چرچا ہو جائے گا۔" اس کے بعد میں نے دو ایک خطوں میں انھیں قبلہ بھائی صاحب لکھا تو انھوں نے جواباً لکھا۔ "بھائی خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔ چھوٹائی بڑائی کو چھوڑو۔ ہم دونوں برابر ہیں___"

میرے خیال میں وہ ۲۰۱۳ء میں بھی کراچی نہیں آئے۔ میں یہ سوچتا رہا کہ بیمار ہوں گے۔ فون کروں گا۔ میری مشکل یہ ہے کہ کوئی فون ملا دے تو میں بات کر سکتا ہوں۔ فون میں آواز بڑھانے والا ایک اسپیکر بھی لگا ہے، خاصا جھنجھٹ ہے۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں مَیں نے دو تین دفعہ فون کیا۔ مگر جواب نہیں ملا۔ خیال آیا کہ شاید بیٹے کے یہاں چلے گئے ہوں۔ ان کی بیٹی کے یہاں فون کیا لیکن وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ چپکا ہو رہا۔ پھر مسعود اشعر صاحب کا کالم محدّب شیشے کے زور پر پڑھا۔ کسی نہ کسی طرح ان کا کالم میں ضرور پڑھتا ہوں۔ غالب اور رشید صاحب کے عشق کا تذکرہ آیا تو اندازہ ہو گیا کہ چلے گئے۔ پھر اسی دن ڈاکٹر عبدالسلام کا فون آیا۔ سوچتا رہا۔ پرانی یادوں میں محو رہا، "کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو۔" لطیف الزماں کیا چلے گئے، ملتان کی ادبی بہار چلی گئی۔ ان کے ممدوح کے بقول؎

ہوتا ہے ہر مکاں کو مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

جنگل ہی نہیں ہمارے دل بھی اُداس ہیں۔

۱۸ جنوری ۲۰۱۴ء

یعقوب لطیف

"کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں"

کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ میں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ تھا۔ ایک دن میرے رفیق کار ابوالخیر کشفی نے مجھ سے کہا "سائنس کے کسی شعبے میں تقریب ہے بلاوا آیا ہے۔ تم بھی فارغ ہو، میں بھی فارغ ہوں تو چلو ذرا سیر ہو جائے گی۔" ہم دونوں اُس شعبے میں پہنچ گئے۔ ہمارے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد ایک صاحب مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبا لیے آئے اور ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ کشفی نے تعارف کرایا۔ "اسلم، یہ یعقوب لطیف ہیں۔" میں نے اُنہیں غور سے دیکھا۔ چھوٹا قد، دلوں میں جھانکنے والی تیز آنکھیں، چہرے پر متانت اور بُردباری کے آثار، عمدہ لباس اور جب گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ لہجہ بڑا نرم اور انداز گفتار بڑا شائستہ ہے۔ کشفی تو تعارف کے بعد اُٹھ کر کہیں اور چلے گئے، میں اور یعقوب لطیف صاحب باتیں کرتے رہے۔ میں نے پوچھا، "آپ کا تعلق کس شعبے سے ہے؟" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا" یونیورسٹی کے کسی شعبے سے نہیں ہے۔" میں نے پھر پوچھا، "تو آپ کا مشغلہ کیا ہے؟" کہنے لگے، "میں دکان دار ہوں۔ صدر میں جلال دین کی دکان کے سامنے میری کھلونوں کی دکان ہے۔" میں نے کہا، "اچھا۔ اچھا۔ وہ ٹوائے لینڈ!" بولے، "جی ہاں وہی۔" میں نے کہا" وہ تو شہر بھر میں کھلونوں کی سب سے بڑی دکان ہے، بڑی مشہور ہے۔ میں بھی وہاں خریداری کر چکا ہوں۔" کہنے لگے، "آپ ہی کی دکان ہے۔ میں نے آپ کو کبھی کبھی شام کے وقت ایلفی پر کتابوں کی دکانوں میں دیکھا ہے۔ اب جو آپ ایلفی کا چکّر لگائیں تو میرے یہاں بھی ضرور تشریف لائیں۔ مجھے استفادے کا موقعہ ملے گا۔" میں 'استفادے' کے لفظ پر چونکا کیونکہ یہ لفظ ان کے پڑھے لکھے

ہونے کی پہچان تھا۔

کچھ دن کے بعد میں ایک شام کو "ٹوائے لینڈ" گیا۔ بڑی زبردست دکان تھی۔ ہر عمر کے بچوں کے کھلونے سجے ہوئے تھے۔ خریداروں کا بڑا ہجوم تھا۔ بچّے، خواتین، مرد۔ دکان کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ پانچ چھ 'سیلز مین' کام کررہے تھے۔ ایک گوشے میں ایک میز رکھی تھی، دو ایک کرسیاں تھیں۔ میز کے پہلو میں ایک بڑا سا سیف تھا۔ یعقوب لطیف درمیان میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور میری طرف بڑھے، سلام کیا۔ ساتھ لے جاکر کرسی پر بٹھایا۔ فوراً ہی چائے آگئی۔ خالی چائے نہیں تھی بلکہ اُس کے ساتھ لوازمات بھی تھے۔ میں نے کہا، "میں غلط وقت پر آگیا، یہ آپ کی مصروفیت کا وقت ہے۔" کہنے لگے، "اللہ تعالیٰ کے کرم سے مصروفیت ہر وقت رہتی ہے لیکن آپ جیسے حضرات کا آنا مصروفیت کی کوفت دور کردیتا ہے۔" میں تھوڑی دیر بیٹھا۔ معلوم ہوا کہ محض تاجر نہیں، شعر و ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ تاریخ اور فلسفے سے لگاؤ ہے۔ مطالعہ بہت اچھا ہے۔ بی اے میں اُن کے مضامین میں تاریخ، فلسفہ اور اردو ادب شامل تھے۔ کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں لاتے اور بڑے شوق سے پڑھتے۔ فکشن سے دل چسپی نہیں تھی۔ خود بھی شعر کہتے تھے لیکن اپنے اشعار ہر کس و ناکس کو سنانے سے گریز کرتے تھے۔ خاص خاص احباب کو سناتے تھے۔ اکثر اپنے یہاں شعرا اور اپنے باذوق دوستوں کو جمع کرتے تھے اور اچھا خاصا چھوٹا سا مشاعرہ ہوجاتا تھا۔ بڑی اچھی محفل ہوتی تھی۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا، "میں آپ کا شاگرد ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا، "میں اپنا شمار شاعروں میں نہیں کرتا اور نہ اپنے آپ کو اس فن کا اُستاد سمجھتا ہوں۔ شاعری میری شناخت نہیں ہے۔" لیکن اُن کا اصرار جاری رہا۔ ایک دن کشفی نے جھلّا کر مجھ سے کہا، "آخر تم یعقوب لطیف کو شاگرد کیوں نہیں بنا لیتے، کوئی خاص وجہ ہے؟" میں نے کہا، "میں نے آج تک شعر و سخن میں کسی کو شاگرد نہیں بنایا۔" کشفی ایک حاضر جواب۔ بولے، "تو پھر آج انہیں شاگرد بنالو۔ یہ تمہارے واحد شاگرد ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سلسلہ چل پڑے۔" میں نے لاکھ انکار کیا مگر کشفی کی باتوں کے سامنے کس کی چلتی تھی۔ انہوں نے یعقوب لطیف کے گنڈا بندھوا کر ہی دم لیا۔ اب یعقوب لطیف کبھی کبھی اپنی کوئی غزل یا نظم اصلاح کے لیے پیش کرنے

لگے۔ اصلاح کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے عروض کا بھی مطالعہ کیا تھا اور فنِ سخن کے بارے میں بھی کچھ کتابیں دیکھی تھیں۔ یہ سب تھا مگر وہ اپنے گھر پر نشستیں کرنے کے باوجود مشاعرے میں پڑھنے سے گھبراتے تھے۔

میں نے ایک دفعہ اردو یونیورسٹی میں شعبہ تصنیف و تالیف کی جانب سے ربیع الاوّل کے مہینے میں سیرت کی ایک تقریب کی۔ یعقوب لطیف سے کہا، "اس تقریب میں آپ نعت پڑھیں گے۔" بڑے گھبرائے۔ "میں نعت پڑھوں گا؟" میں نے کہا، "جی ہاں آپ ہی نعت پڑھیں گے۔" خاموش ہو گئے۔ تقریب میں انہوں نے بڑی دل نواز نعت پڑھی۔ حاضرین نے پسند کی، خود یعقوب لطیف بھی خوش ہوئے۔ اسی طرح میں نے ایک دفعہ شعبہ تصنیف و تالیف کی جانب سے غالب کے یوم وفات پر ایک تقریب کا اہتمام کیا اور اُن سے کہہ دیا کہ آپ کو نظم پڑھنا ہے۔ انہوں نے نظم پڑھی اور بڑی اچھی نظم پڑھی۔ سب کو خوش کر دیا۔ دونوں تقریبوں میں وہ خالی ہاتھ نہیں آئے بلکہ مٹھائی لے کر آئے۔ یہ ان کا خاص انداز تھا۔

شاعری اور مطالعے کے ساتھ ساتھ انہیں موسیقی سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ پرانے ریکارڈوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ بہت سے کیسٹ تھے۔ کبھی کبھی اُن سے موسیقی کے بارے میں گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ موسیقی کی فہم بھی رکھتے ہیں اور کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے اُن کے یہاں بعض بڑے پرانے ریکارڈ سُنے اور اُن کی "ذخیرہ اندوزی" کی داد دی۔ جب وہ کوئی پرانا ریکارڈ سُناتے تو اُن کے چہرے پر سرخوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ پوری طرح موسیقی کی گرفت میں ہیں۔

اُن کے مزاج میں مروّت بھی بہت تھی۔ اس کا اظہار بھی اکثر ہوتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ میرے دوست راحت امین چغتائی سیر و تفریح کے لیے کراچی آئے۔ میں انہیں "ٹوائے لینڈ" بھی لے گیا۔ اُس زمانے میں "ٹوائے لینڈ" میں ایک گوشہ مردانہ شلوار قمیض کے سوٹوں کا بھی تھا۔ یعقوب لطیف خود اپنی پسند سے کپڑا بنواتے، بڑے اہتمام سے سلواتے اور اس طرح ایک طرح کی انفرادیت پیدا کر دیتے تھے۔ ان کپڑوں کے سوٹ کہیں اور نظر نہیں آتے تھے۔ چغتائی صاحب کو ایک سوٹ پسند آگیا۔ انہوں نے سیلز مین سے قیمت پوچھی۔ سیلز مین نے یعقوب

لطیف کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا، "یہ آپ ہی کی دکان ہے۔ آپ سے قیمت کیا لینا۔" چغتائی صاحب بھی چنگیز خانی آن بان کے قائل۔ انہوں نے کہا، "یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔" آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ رعایت کی جائے گی، چنانچہ خاصی رعایت دی گئی۔ میں نے ایک آدھ دفعہ چغتائی صاحب کو وہ جوڑا زیب تن کیے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

مروّت کے واقعات تو بہت ہیں لیکن میں صرف دو واقعات قلم بند کرنے پر اکتفا کروں گا۔ یہاں مُروّت، مُرّوت سے بڑھ کر احسان عظیم کی حدود میں آجاتی ہے۔ میں مکان بنوا رہا تھا۔ ایک بزرگ عزیز سے سولہ ہزار روپے قرض لیے۔ طے یہ ہوا کہ ادائیگی میں عجلت نہیں ہوگی لیکن ہوا یہ کہ وہ بزرگ مجھ سے ناراض ہوگئے اور ناراضی بہت بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ جس طرح بھی ہو ان کا قرض ادا کر دیا جائے تاکہ خفّت نہ ہو مگر سوال یہ تھا کہ روپیہ کہاں سے آئے۔ "درم و دام اپنے پاس کہاں۔" روز بروز پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ یاد آیا کہ ایک دن یعقوب لطیف مکان دیکھنے آئے تھے، پسند بھی کیا تھا اور دبے لفظوں میں یہ بھی کہا تھا کہ اگر کبھی میری کسی بھی خدمت کی ضرورت ہو تو میں جان و دل سے حاضر ہوں۔ ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور یہ بات یاد آئی۔ پھر خیال آیا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ شاگرد کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ گے۔ بہت غور کیا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اُن کے یہاں جانے کے لیے تیار ہوا، آدھے راستے سے لوٹ آیا۔

اُن کی محفل میں جا نہ پائے ہم
آدھے رستے سے لوٹ آئے ہم

ضمیر کی ملامت، ذہن کی اُلجھن، دل کی کشمکش۔ آخر کار گیا۔

نہ جائیں گے یہ طے پایا تھا مجھ میں اور میرے دل میں
گئے دونوں گئے اور بن بُلائے اُن کی محفل میں

کچھ جھجکتا ہوا، کچھ سوچتا ہوا، کچھ شرمندہ شرمندہ سا۔ پہنچا تو دکان کی رونق معمول کے مطابق، گاہکوں کا ہجوم، بچّوں کی شوخیاں، آوازوں کا شور۔ یعقوب لطیف حسبِ معمول مجھے اپنے ساتھ اپنے گوشے میں لے گئے۔ میں خاموش بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا پھر کہنے لگے، "آج آپ کچھ فکرمند، کچھ پریشان پریشان سے نظر آرہے ہیں۔ کیا مکان کے سلسلے

میں کوئی مسئلہ ہے؟" میں نے بڑے مجوب انداز میں کہا، "مجھے سولہ ہزار روپے کی فوری ضرورت ہے۔ ادائیگی جلد سے جلد کی جائے گی۔" اگرچہ یہ جملہ کہنا بڑا تکلیف دہ تھا لیکن کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ یعقوب لطیف نے سیف کھولا، نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا، کچھ نوٹ الگ کیے۔ ربر بینڈ چڑھایا اور نوٹ مجھے دے دیے۔ پھر کہنے لگے، "یہ رقم لے کر بس میں جانا مناسب نہیں۔ چلیے میں آپ کو یونیورسٹی چھوڑ آؤں۔" ہم باہر آئے۔ اُن کی گاڑی باہر کھڑی تھی، ہم دونوں بیٹھ گئے۔ وہ مجھے یونیورسٹی پہنچا کر خاموش چلے گئے۔ کوئی بات نہیں ہوئی۔

عجیب اتفاق یہ کہ وہ بزرگ جن سے قرض لیا تھا۔ اُس شام کو میرے یہاں آئے۔ میں سمجھ گیا کہ شاید قرض کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔ اس لیے میں نے اُن کی بات شروع ہونے سے پہلے سولہ ہزار اُن کے سامنے رکھ دیے اور کہا، "یہ رقم حاضر ہے۔" انھوں نے شرما حضوری کہا، "ایسی بھی کیا جلدی تھی۔" میں نے کہا "مجھے جلدی نہیں گھبراہٹ تھی۔" معاملہ ختم ہوا۔

اُن سے قرضہ جس مکان کی تعمیر کے لیے لیا گیا تھا وہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ دو ڈھائی مہینے میں بالکل تیار ہو گیا۔ کرائے پر اُٹھ گیا۔ دو برس کا کرایہ پیشگی مل گیا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ روپیہ لے کر دوڑا دوڑا یعقوب لطیف کے یہاں گیا۔ بیٹھا پھر روپیہ نکال کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھتے رہے پھر بولے، "ایسی عجلت کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے کہا "اس عجلت کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں قرض کے بار سے آزاد ہو گیا اور دوسرے "بارِ کرم" کچھ ہلکا ہو گیا۔" بڑے ہنسے۔ کہنے لگے، "نہ قرض کا بار تھا نہ بارِ کرم۔ اُستاد، شاگرد کا معاملہ تھا۔ ایسے معاملے ہوتے ہی رہتے ہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ میں "بارِ کرم" کو آج بھی محسوس کرتا ہوں اور ہمیشہ محسوس کرتا رہوں گا۔

دوسرا واقعہ قرض وام کا تو نہیں مگر ہے دل چسپ اور خدمت کے حقیقی جذبے پر مملو۔ ہوا یہ کہ اُن دنوں "سوزوکی ہائی روف" نئی نئی رائج ہوئی تھی۔ بڑی دھوم تھی۔ بڑی ہلکی اور خوش نما گاڑی ہے، لوگ دھڑا دھڑ خرید رہے ہیں۔ میرے چھوٹے بیٹے طارق کو گاڑیوں کا بڑا شوق ہے۔ دیکھ بھال، رکھ رکھاؤ سب کا خیال رکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا، "اپنی بھاری گاڑی فروخت کر کے

یہ گاڑی خرید لینا چاہیے۔" جب اُن کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو میں ایک دن صدر میں ایک شناسا موٹر ڈیلر کے پاس گیا اور اُن سے خریداری کی بات کی۔ انہوں نے کہا، "گاڑی تو میں فراہم کردوں گا لیکن کمپنی کی مقررہ قیمت کے علاوہ ایک اضافی رقم بھی ادا کرنا پڑے گی۔" میں نے واپس آ کر یہ صورت حال بیان کر دی۔ طارق نے مجھ سے فوراً کہا، "سوزوکی کمپنی میں تو آپ کے فلاں شاگرد مارکیٹنگ منیجر ہیں اُن سے کہیے گاڑی دلوا دیں۔" سوزوکی کمپنی میں میرے ایک بڑے سعادت مند شاگرد مارکیٹنگ منیجر تھے۔ میں نے دوسرے دن انہیں فون کیا۔ اب میری حماقت ملاحظہ کیجئے کہ بے سوچ سمجھے کہا "ایک سوزوکی ہائی روف چاہیے۔ گاڑی یونیورسٹی بھجوا دو۔ جو آدمی گاڑی لے کر آئے گا اُسے قیمت ادا کر دی جائے گی۔" اُس سعادت مند شاگرد نے کوئی چون و چرا نہیں کی۔ یہ پوچھا، "گاڑی کب چاہیے ہے؟" میں نے کہا، "جلد سے جلد۔ کل ہی بھجوا دو۔"

ان دنوں یونیورسٹی میں شعبہ تصنیف و تالیف کا اضافی چارج بھی میرے پاس تھا میں دوپہر کو وہاں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے نائب نے کہا، "مبارک ہو ڈاکٹر صاحب! آپ کی نئی گاڑی آگئی ہے۔ یہ تو زاید قیمت پر فروخت ہو رہی ہے۔ براہ راست کمپنی سے کیسے مل گئی؟" ہم دونوں نے باہر نکل کر گاڑی دیکھی۔ لانے والے نے کاغذات ہمارے حوالے کیے۔ میں اُسے بینک لے گیا۔ رقم نکلوا کر دی اور کہا، "احتیاط سے لے جانا۔" ایک دوسری گاڑی بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے ان شاگرد کا شکریہ ادا کر دیا۔

طارق پہلے تو بہت خوش ہوئے مگر پھر کہنے لگے، "بڑی ہلکی گاڑی ہے۔ چلانے میں مزہ نہیں آتا۔" میری بیوی نے بھی کہا، "لوگ کہتے ہیں، مسافر اور مال ڈھونے کی گاڑی ہے۔ یہ کیوں خرید لی۔" طارق نے زور دیا کہ "اسے بیچ دیا جائے۔ دوسری بھاری گاڑی خریدیں گے۔" کچھ دن تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ پھر فضا مکدّر ہونے لگی تو میں نے سوزوکی والے شاگرد کو فون کیا۔ "تجربہ ناکام ہو گیا۔ پہلے تم نے خریداری میں مدد کی تھی۔ اب بیچنے میں مدد کرو۔" شاگرد نے کچھ دیر سوچا پھر کہا، "کل شام کو گاڑی اور کاغذات صدر میں فلاں دکان پر لے جائیے اور ان کے حوالے کر کے قیمت طے کیجیے۔"

اگلی شام کو میں اور طارق اس دکان پر گئے۔ دکاندار بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔

چائے پلوائی۔ گاڑی اور کاغذات چیک کیے۔ پھر سیف میں سے رقم نکال کر گنی اور کہا، "اصل قیمت سے اتنی زیادہ ہے۔" میں نے رقم جیب میں رکھ لی۔ ہم دونوں باہر نکلے۔ باہر نکل کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے اور میں نے سوچا کہ اتنی بڑی رقم لے کر ٹیکسی میں جانا مناسب نہیں اور بس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر کیسے جائیں۔ کیا کریں۔ معاً یعقوب لطیف کا خیال آیا اور میں نے طارق سے کہا، "ٹوائے لینڈ" تک دوڑ لگاؤ۔" دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے "ٹوائے لینڈ" پہنچ گئے۔ وہی رونق، وہی ہجوم، وہی آوازوں کا شور، وہی گہما گہمی۔ یعقوب لطیف اپنے گوشے میں متانت کی تصویر بنے بیٹھے ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر اُٹھے۔ ساتھ لے گئے۔ ہم دونوں نے سانس درست کی۔ کہنے لگے، "کیا حکم ہے؟" میں نے کہا، "کیا آپ ہم دونوں کو یونیورسٹی پہنچا سکتے ہیں؟" کہنے لگے، "ضرور۔ مگر پہلے چائے پی لیجیے۔" چائے کی اس وقت ضرورت بھی تھی۔ چائے آگئی۔ پی لی۔ انھوں نے ایک کارکن کو بلا کر ہدایات دیں۔ باہر نکلے۔ گاڑی باہر کھڑی تھی۔ ہم گھر پہنچ گئے۔ راستے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب ہم گھر پہنچ گئے تو میں نے کہا، "چائے پیتے جائیے۔" بولے، "اس وقت نہیں۔ آج دکان میں غیر معمولی بھیڑ ہے۔ کل چھیڑ کے وقت آؤں گا۔"

اگلے دن دوپہر کو وہ آئے۔ آتے ہی پوچھا، "ڈاکٹر صاحب، رقم کتنی تھی؟" میں نے کہا، "آپ کو کیسے معلوم؟" کہنے لگے، "تاجر ہوں۔ روزانہ سیکڑوں گاہکوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ چہرے مہرے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔"

میں نے پورا قصّہ سنایا۔ کہنے لگے، "آپ کو شام کے بجائے دوپہر کو جانا چاہیے تھا۔ اور واپسی کا انتظام کر لینا چاہیے تھا۔ اتنی بڑی رقم لے کر دوڑ لگانا بھی نامناسب تھا۔ اگر میں دکان پر نہ ہوتا تو___" میں نے کہا، "اللہ تو ہے۔" انھوں نے اپنے نرم لہجے میں کہا، "اللہ تو ہے لیکن احتیاط بھی ضروری ہے۔" مجھے بارہا یہ خیال آیا کہ وہ صحیح کہتے تھے اس طرح دوڑنا نہیں چاہیے تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ اچھا گزرتا گیا۔ پھر نجانے کیا ہوا، "آشیاں جل گیا، گلستاں لُٹ گیا۔" اب تک گاڑی پٹڑی پر سیدھی سیدھی چل رہی تھی مگر پٹڑی کسی جگہ سے اکھڑ گئی اور لہرا کر گر پڑی۔ نجانے کیا ہوا کہ "ٹوائے لینڈ" فروخت ہو گیا۔ کیوں فروخت ہو گیا، یہ مجھے نہیں معلوم اور نہ دریافت کرنے کی ہمت ہوئی۔ یہ ضرور ہوا کہ جب شام کو ایلفی سے گزرتا تو دل میں ایک ہوک

اٹھتی۔ یعقوب لطیف شدت سے یاد آتے۔ شوراشوری اور اس کے ساتھ بے نمکی کا احساس ہوتا۔ خیال آتا کوئی ایسی ہی زبردست افتاد پڑی ہوگی جو یہ صورت حال پیدا ہوئی۔

یعقوب لطیف کچھ دن تو غائب رہے۔ پھر ان کا فون آیا کہ میں نے فیکٹری ایریا کے ایک مل میں منیجر کی حیثیت سے کام سنبھال لیا ہے۔ میں نے کہا، "آپ جو کچھ کرتے ہیں اچھا ہی کرتے ہیں۔" فون پر گفتگو ہوتی رہی۔ آواز، لہجے اور انداز گفتگو سے اضمحلال کا تاثر ملتا تھا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرکے جب حال احوال پر آتا تو وہ خاموش ہو جاتے۔ ع

سب کچھ کہا مگر نہ کھُلے راز داں سے ہم

ملازمت سے کچھ خوش نہیں تھے۔ خوش ہوتے بھی کیسے۔ پھیلنے کے بعد سمٹنا آسان نہیں ہوتا۔

فلموں کے محقق اور ادیب زخمی کانپوری کا بیان ہے کہ مشہور فلمی شاعر حسرت جے پوری بمبئی کے کسی مشہور سینما کے پاس بچوں کے کھلونے بیچا کرتے تھے۔ لوگ یہ بھی دیکھتے کہ کھلونے بیچنے والا ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے۔ ایک بڑے فلمی ہیرو بھی روزانہ ادھر سے گزرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے موٹر روکی اور حسرتؔ سے پوچھا، "آپ کیا لکھتے رہتے ہیں؟" حسرت نے کہا، "غزلیں، نظمیں، گیت لکھتا رہتا ہوں۔ مشاعروں میں پڑھتا ہوں۔" انھوں نے پوچھا، "فلمی گیت لکھیں گے؟" حسرتؔ نے کہا، "کیوں نہیں۔" وہ حسرتؔ کو اپنے ساتھ لے گئے اور پھر "جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو۔" لاجواب بن گئے۔ حسرت کھلونوں سے فلموں میں آئے اور اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ یعقوب لطیف کھلونوں سے مل میں پہنچے۔ بچوں کی سُریلی اور ملائم آوازوں کے بجائے مشینوں کی گڑگڑاہٹ، سرمایہ و محنت کی کشمکش اور مسائل کے جنجال میں پھنس گئے۔ حالیؔ سے بے حال ہوگئے۔ "فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ۔"

اب ایک اور دھاکا۔ مرے پر سو دُرّے۔ بیگم کا انتقال ہو گیا۔ بیگم روشن لطیف کے انتقال سے ان کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا بقول غالبؔ

گل فشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

بیگم روشن بڑی ملنسار، متواضع، شائستہ اور سلیقہ مند خاتون تھیں۔ کبھی کبھی 'ٹوائے لینڈ' آتیں اور میں بیٹھا ہوتا تو یہ محسوس ہوتا کہ ہر طرف خوشبو پھیل گئی ہے۔ بہار کی تازہ ہوا کا نرم جھونکا آ گیا ہے۔ آتے ہی جائزہ لیتیں۔ بڑے ادب سے سلام کرتیں۔ خیریت پوچھتیں۔ پھر دریافت کرتیں، "ڈاکٹر صاحب! آپ نے چائے پی لی۔" میں کہتا، "جی ہاں" اس پر وہ کہتیں، "کیا چائے پی ہوگی یعقوب تو محض دکاندار ہیں۔ برابر کی دکان سے چائے منگوالی ہوگی۔ چائے تو آپ اب پئیں گے۔" پھر کسی کارکن کو اشارہ کرتیں۔ "دیکھو! بسکٹ Parisian Bakery پیر ترین بیکری کے اچھے ہوتے ہیں خستہ اور مزے دار اور پیٹز کیفے جارج کی گرما گرم ہوتی ہیں۔ دونوں چیزیں لے آؤ۔ اور ہاں۔ چائے۔ فلاں ہوٹل سے لانا۔" یعقوب لطیف محبت سے ان کی طرف دیکھتے رہتے۔ ہنستے رہتے۔ فضا میں محبت کی خوشبو پھیلی رہتی۔ میاں بیوی دونوں نے مٹھاس کے ہوکے میں ساری شکر اپنے جسم میں اُتار لی تھی۔ بسکٹ اور پیٹز کھاتے میں احتیاط کرتے تھے۔ یعقوب لطیف زیادہ اور روشن بیگم برائے نام مگر دوسروں کو کھلا کر نہال ہو جاتے تھے۔

بیگم کے اُٹھ جانے سے یعقوب لطیف کو باپ اور ماں دونوں کی ذمے داری اُٹھانا پڑھی اور انھوں نے طرز تپاک اہل دنیا کی عطا کردہ افسردگی کے باوجود بچوں کی بڑی اچھی تربیت کی۔ یہ ان کا مزاج تھا۔ جو کام کرتے تھے خلوص سے اور دل لگا کرتے۔

اب ایک اور دہاکا __ دہاکا نہیں۔ بم پھٹ پڑا۔ ایک دن میں ان کے یہاں گیا تو انھوں نے بتایا کہ میں مکان کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔ بالعموم وہ اپنی پریشانیوں کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن اس دن شاید کچھ بھرے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے، "یہ مکان جس میں آپ بیٹھے ہیں۔ میں نے اس کا پلاٹ ایک صاحب سے خریدا تھا۔ عام دستور کے مطابق پاور آف اٹارنی پر خریدا تھا۔ پلاٹ ٹرانسفر نہیں ہو سکتا لہٰذا لوگوں نے یہ ترکیب نکالی۔ پاور آف اٹارنی پر پلاٹ خرید لو۔ مکان مکمل ہو جائے تو ٹرانسفر کروالو۔ میں نے بھی یہی کیا۔ مگر نجانے عقل کو کیا ہو گیا تھا۔ بیچنے والے کی باتوں پر یقین کیا۔ پاور آف اٹارنی کا کاغذ اسی کے پاس رہنے دیا۔ مکان بن گیا تو میں اس کے پاس گیا اور مکان ٹرانسفر کرنے کے لیے کہا تو وہ صاف مکر گیا۔ مجھے بہت بُرا بھلا کہا۔ کیسا پلاٹ۔ کس کا پلاٹ۔ پاگل ہو گئے ہو۔" میں اپنا سا منھ لے کر چلا آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس

کے بیٹے سے ملا۔ بیٹے نے کہا، ''افسوس والد صاحب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہم لوگوں کی زندگی دوبھر کر دی ہے۔ ہر وقت بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ گھر کا سامان فروخت کر دیتے ہیں۔ کوئی ملازم رکھو تو اسے مارتے پیٹتے ہیں۔ نکال دیتے ہیں۔ پلاٹ آپ ہی کا ہے۔ ہماری طرف سے کوئی روک نہیں دعا کیجیے کہ والد صاحب کا دماغ صحیح ہو جائے۔'' مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس قصے کا انجام کیا ہوا۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ یہ ذکر چھیڑ کر انھیں اور غم زدہ کروں۔ مگر بزرگوں کی یہ بات یاد کرتا رہا کہ دعویٰ جھوٹا، قبضہ سچّا۔

ایک اور دن ان کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ گھر کے اس کمرے پر جس کے دروازے سڑک پر کھلتے تھے۔ بیکری کا ایک چھوٹا سا بورڈ لگا تھا۔ اندر بیکری کا کچھ سامان رکھا تھا۔ میرے سوالیہ انداز کو بھانپتے ہوئے انھوں نے خود ہی بتایا، ''میں نے ایک بہت اچھے تعلیمی ادارے میں کینٹین کا ٹھیکا لے لیا ہے۔ وہاں بیکری کا جو سامان آتا ہے۔ اس میں سے کچھ یہاں رکھ دیتا ہوں۔ پاس پڑوس والے لے جاتے ہیں کیونکہ چیزیں اچھی اور دام مناسب ہوتے ہیں۔'' مجھے معاً غالب یاد آئے جنھیں گھر کی خانہ ویرانی میں اُگے ہوئے سبزے کی وجہ سے دربان کو گھاس کھودنے کی خدمت پر مامور کرنا پڑا تھا۔

اُگا ہے گھر میں سبزہ خانہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

کیا کہتا۔ ''تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو،'' کہتا رہا۔

ایک اتوار کی صبح وہ میرے یہاں آئے۔ اتوار کی صبح میرے یہاں کچھ شاگرد، کچھ ادیب اور کچھ شاعر دوست جمع ہوتے ہیں۔ شعر و ادب کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے۔ انھیں یہ محفل بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ پابندی سے آنے لگے مگر اور حسب روایت دیرینہ خالی ہاتھ کبھی نہیں آئے۔ کھانے کی کوئی چیز وافر مقدار میں لے کر آتے۔ ایک دفعہ ان کی بہو نے میری بیوی کو بتایا کہ ڈیڈی جب آپ کے یہاں سے واپس جاتے ہیں تو مجھ سے مشورہ کرتے ہیں کہ اگلی دفعہ کون سی نئی چیز لے کر جائیں۔ مشورہ ہوتا رہتا ہے۔ ہفتے کے دن سے پکنے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ بڑے خوش خوش ''پکوان'' ساتھ لے جاتے ہیں اور خوش خوش واپس آتے ہیں۔ تواضع کا یہ انداز

مجھے بہت کم نظر آیا ہے۔

میرے یہاں محفل میں وہ بالعموم تاریخ اور فلسفے پر گفتگو کرتے تھے۔ بڑا اچھا مطالعہ تھا۔ جم خانے کے ممبر تھے۔ اس کی لائبریری میں تاریخ اور فلسفے کی نئی سے نئی کتابیں منگواتے اور پھر ان کے بارے میں گفتگو کرتے۔ گل نغمہ اور پردہ ساز کی گفتگو میں مجھے وہ کبھی کبھی "اپنی شکست کی آواز" معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یہ کیفیت لمحاتی ہوتی تھی۔ وہ فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیتے۔ تاسف کا لمحاتی انداز ختم ہو جاتا اور گفتگو اطمینان سے جاری رہتی۔

ان دنوں یعقوب لطیف کو یہ دُھن لگ گئی کہ میں اپنے استاد کا کلام مرتب کروں گا۔ کہتے، "آپ کا مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہو جانا چاہیے۔ دو دو ٹکے کے آدمی مجموعوں پر مجموعے چھپوا کر شاعر اعظم بن گئے ہیں۔ آپ ایک مجموعہ شائع نہیں کرا سکتے۔" میں جواب میں کہتا کہ شاعری میری شناخت نہیں ہے۔ میری شناخت کے لیے میری نثر ہی کافی ہے۔" مگر وہ میرا عذر قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ ہمیشہ اصرار کرتے تھے۔ مشاعروں اور ادبی تقریبوں میں جانے کے قابل نہیں تھے۔ اپنے گھر ہی پر محفل شعر و سخن منعقد کر لیتے تھے اور شہر کے اچھے شاعروں کو جمع کر لیتے تھے۔

شام کی ادبی تقریبوں سے گریز کا سبب پہلے تو 'ٹوائے لینڈ' میں ان کی مصروفیت تھا۔ پھر شام کو گاڑی چلانے سے گھبرانے لگے تھے۔ کہتے تھے، "صحیح دکھائی نہیں دیتا۔ نظر خراب ہو گئی ہے۔ گاڑی چلانے سے گھبراتا ہوں۔ اس لیے تقریبوں میں آنا جانا بند کر دیا ہے۔" ان کے اس کہنے میں تاسف کی ایک جھلک ہمیشہ نمایاں رہتی تھی۔

ایک اور بات جو میں نے یعقوب لطیف میں خاص طور پر نمایاں دیکھی وہ ان کی نرم روی کے ساتھ سچائی تھی۔ وہ غلط بات سن کر عموماً خاموش ہو جاتے تھے لیکن اگر ان سے اس بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ صاف بات کہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک نام نہاد ادیب کا تذکرہ ہو رہا تھا جو اپنے وسیع وسائل کی بنا پر ادب کی دنیا میں در آئے تھے۔ جب یعقوب لطیف سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے برہمی کا اظہار کیا۔ یہ ان کی خفگی کا پہلا اظہار تھا۔ کہنے لگے، "ان نو دولتیوں نے شعر و ادب کو بھی نہیں چھوڑا۔ ملک و ملت پر تو زوال آیا

ہی تھا۔ ان جیسے لوگوں نے شعر و ادب کو بھی زوال آمادہ کر دیا۔" ان کی بات کی سچائی کو ہم سب نے محسوس کیا مگر جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔

اتوار کی محفلیں جاری تھیں۔ یعقوب لطیف پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ بظاہر تندرست اور توانا تھے۔ دل کا حال خدا کو معلوم کہ ایک دن اچانک ان کے بیٹے نے اطلاع دی کہ ڈیڈی چلے گئے۔ چلے گئے، ہم سب پر ستم کر گئے۔ یاد آیا کہ مولانا محمد علی جوہر کے ایک معاون تھے۔ راجہ غلام حسین ان کا ایک حادثے میں اچانک انتقال ہو گیا۔ مولانا نے بڑا دل دوز مرثیہ لکھا۔ پہلا شعر یہ تھا:

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین
کاش کچھ اور دن جیے ہوتے

دل میں بے اختیار یہی خیال آیا، "کاش کچھ اور دن جیے ہوتے۔" مگر ہر شخص کا وقت مقرر ہے۔ ع آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں۔" میں نے فوری طور پر تاریخ وفات کہی۔ حالانکہ یہ کام میں بہت عرصے پہلے چھوڑ چکا ہوں۔

آخرش پہلوئے روشن میں گئے
صاحبِ لُطف و کرم مردِ عفیف
فکر ہے تاریخ کی اسلمؔ لکھو
اے خلیقِ عصر یعقوب لطیف

۱۴۳۸ھ

مگر ایسی تاریخوں سے کیا ہوتا ہے۔ تاریخ تو وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلتی ہے اور دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ اسی تاریخ میں رنگ ثبات دوام بھی ہوتا ہے۔ تاریخ میں دل چسپی رکھنے والے یعقوب لطیف کی شخصیت اور زندگی میں بھی رنگ ثبات دوام کی ایک جھلک تھی۔ یہ جھلک میں اپنے آئینۂ دل میں اکثر دیکھتا رہتا ہوں۔

یکم فروری ۲۰۱۴ء

سید حسن فیروز

قیام پاکستان کے بعد جب دل ذرا ٹھہرے اور امی جمی ہوئی تو ریڈیو والے بخاری صاحب کے یہاں ماہانہ مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کیا دلآویز مشاعرے ہوتے تھے۔ ایک بڑے کمرے میں چاندنی کا فرش، گاؤ تکیے قرینے سے رکھے ہوئے۔ چنگیروں میں پھول۔ ہنستے، مہکتے مشاعرے۔ شعرا حضرات اور حاضرین سب شائستہ اور آداب مشاعرہ کے پابند، صدارت کبھی خواجہ شہاب الدین کبھی ابو طالب نقوی، کبھی ایسے ہی کسی اور سخن فہم بزرگ کے سپرد ہوتی۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں مَیں نے ایک صاحب کو دیکھا۔ دُہرا بدن، جگر جگر کرتی آنکھیں۔ چہرے پر طمانیت اور خوشیاں بکھیرنے کے آثار، گاؤ تکیے سے لگے اس طرح بیٹھے تھے کہ ہزاروں من کے معلوم ہو رہے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا تو وہ گاہے گاہے اشعار پر داد بھی دیتے۔ اس داد میں سخن فہمی اور شاعر کی حوصلہ افزائی کا وفور ___ میں نے شاہد احمد دہلوی سے جو میرے پاس بیٹھے تھے چپکے سے پوچھا، "یہ کون صاحب ہیں؟ داد و تحسین کے سلیقے سے پوری طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔" شاہد صاحب نے کہا، "ان کا نام سید حسن فیروز ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کے ہم زلف ہیں۔"

رات گئی بات گئی مگر جب میری شادی ہوئی تو میں نے حسن فیروز صاحب کو براتیوں کے استقبال میں شریک لوگوں میں دیکھا۔ یک لخت یاد آیا، شاہد بھائی نے کہا تھا، یہ میرے چھوٹے بھائی کے ہم زلف ہیں، تو اس رشتے سے برات کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہیں۔ سید حسن فیروز ہر کس و ناکس سے بڑے تپاک سے پیش آرہے تھے اور گاہے گاہے کوئی بڑا تیکھا فقرہ بھی کہتے تھے۔ لوگ ان کی بات سے بڑا لطف لے رہے تھے۔

چند دن کے بعد فیروز صاحب کے یہاں جانا ہوا۔ میں نے جانے سے پہلے خالو فیروز کے

بارے میں کچھ معلومات چاہی۔ معلوم ہوا کہ بڑے زبردست آدمی ہیں سارے خاندان میں ان کی دھوم ہے۔ دلّی میں بھی بڑی دھوم تھی، ہر شخص کی مدد کرتے ہیں، بڑے بڑے لوگوں سے بے تکلفی کے تعلقات ہیں۔ بڑے زندہ دل ہیں، چھوٹے بڑے سب سے انتہائی بے تکلفی سے بات کرتے ہیں۔ خدمت گزار ایسے کہ رات کو ہمیشہ ماں کے پیر دباتے ہیں، ان کے سرہانے پھول رکھتے ہیں۔ وہ پیر الٰہی بخش کالونی میں بس اسٹینڈ کے سامنے رہتے تھے۔ دو مکانوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا تھا۔ تین بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے۔ بڑے بیٹے واہ کی آرڈیننس فیکٹری میں ورکس منیجر تھے۔ فیروز صاحب نے جو اب ہمارے لیے خالو فیروز ہو گئے تھے، خیریت پوچھی اور پھر کہا، "بخاری صاحب کے یہاں تم نے بڑی اچھی غزل پڑھی تھی۔ ایسی ہی اچھی غزلیں کہتے ہو؟" میں نے جواب میں کہا، "خراب غزلیں بھی کہتا ہوں۔" بولے، "خراب غزلیں مت کہا کرو، اس سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔" جب ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو انھوں نے کہا، "میاں بدن پر بوٹی چڑھاؤ، ایسے سکھناپے سے کام نہیں چلے گا۔" میری بیوی سے کہنے لگے، "اری لڑکی پڑھائی نہ چھوڑ دینا کم از کم بی اے کر لے۔" سب ہنسنے لگے۔ اس طرح کے فقرے انھوں نے بعض اور لوگوں سے بھی کہے۔ سب ان کے فقرے سن کر ہنستے رہتے تھے۔ کیونکہ خالو فیروز جو کچھ کہتے تھے خلوص اور محبت سے کہتے تھے۔ بڑی شفقت ہوتی تھی ان کے فقروں میں___ اپنے بچوں سے بھی اسی طرح بات کرتے تھے۔

مجھے خالو فیروز کا بے تکلفانہ انداز بہت اچھا معلوم ہوا۔ چنانچہ میں شاہد بھائی کے یہاں پیر کالونی جاتا تھا تو کبھی کبھی خالو فیروز سے بھی ملنے چلا جاتا، ایسی دل چسپ گفتگو کرتے تھے کہ بس "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔" رفتہ رفتہ ان کے حالات بھی معلوم ہوئے۔

خالو فیروز کا تعلق نواح دہلی کے ایک قصبے (اب شہر) فرید آباد کے ایک معزز سادات گھرانے سے تھا۔ فرید آباد سارے برصغیر میں اپنی خوش رنگ مہندی کی وجہ سے مشہور تھا۔ فرید آباد کی مہندی ہر جگہ ملتی تھی۔ جدھر دیکھتے لڑکیوں بالیوں سے لے کر بوڑھی عورتوں تک کی ہتھیلیوں تک فرید آبادی حنا کے کنول روشن نظر آتے تھے۔ شہرت کی دوسری وجہ مرزا قتیل تھے۔ مرزا محمد حسن قتیل نو مسلم تھے۔ اسلام قبول کر لیا تھا۔ فارسی زبان و ادب کے صاحب

اجتہاد عالم تھے۔ مدتوں اصفہان اور شیراز کی خاک چھانی تھی۔ فرید آباد سے لکھنو چلے گئے تھے۔ سارے ملک میں ان کی شاعری اور علم لسان کا شہرا تھا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ دلی اور لکھنو سے لے کر کلکتے تک پھیلا ہوا تھا لیکن مرزا غالب کو ان سے چڑ تھی۔ ان سے کیا، سارے فارسی گویان ہند سے چڑ تھی۔ ادھر کسی کا نام آیا اور مرزا کا پارہ چڑھا۔ یہ دو مرزاؤں کی تنا تنی نہیں تھی، کیونکہ قتیلؔ کا انتقال ہوا تو غالبؔ بیس برس کے تھے۔ دونوں میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہر چند کے غالبؔ انیس برس کی عمر میں ایک دیوان مرتب کر چکے تھے لیکن اس وقت تک ان کی شاعری کا شہرا نہیں ہوا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ غالبؔ خود کو فارسی کا استاد بے بدل سمجھتے تھے اور برصغیر کے کسی فارسی استاد کی عظمت کے قائل نہیں تھے۔ اسی وجہ سے وہ ساری زندگی قتیلؔ سے اینٹھے رہے اور ان کے لیے انتہائی ناملائم الفاظ استعمال کرتے رہے، خالو فیروز کے ایک چچازاد بھائی تھے۔ (سمدھی بھی تھے) سید اسد علی انوری، انڈین فارسٹ سروس سے تعلق تھا۔ دہرادون فارسٹ کالج کے ڈائریکٹر بھی رہے تھے۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد یہاں آگئے تھے، یہاں بھی انھوں نے فارسٹ کالج قائم کیا۔ جنگلات کے سب سے بڑے افسر رہے، شہیدانِ بالاکوٹ کے مزار درست کرائے اور ایک سنگی تختی بھی لگوائی۔ یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری اہم بات یہ کہ انوری صاحب ''قانون باغبانی صحرا'' کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب اور فارسی کا بھی بڑا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، انھیں اپنے ہم وطن شاعر اور استاد مرزا قتیلؔ سے بھی محبّت تھی۔ چنانچہ انھوں نے ایک کتاب ''قتیل و غالب'' مرتب کی۔ منصفانہ انداز اختیار کیا۔ بڑی محنت کی۔ غالبؔ نے قتیلؔ کے بارے میں جو ناروا اور معاندانہ انداز اختیار کیا تھا ان کا تجزیہ کیا لیکن غالب پرستی کی فضا میں یہ متوازن کتاب مقبول نہیں ہوئی۔ دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں مکتبہ جامعہ نے شائع کیا۔ دوسرا کراچی سے فضلی سنز نے شائع کیا۔ انوری صاحب کا یہ کارنامہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے غالب کی انانیتِ بے جا کا اندازہ ہوتا ہے۔

خالو فیروز بہ سلسلہ تعلیم فرید آباد سے دہلی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے تھے۔ دلّی کے مشہور محلے فراش خانے میں رہتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ سیکریٹریٹ میں آگئے جسے اُس زمانے میں وائسرائے کا دفتر کہا جاتا تھا۔ خالو فیروز اپنی گوناگوں خوبیوں، کارگزاری اور

دل موہ لینے والے انداز کی وجہ سے سیکریٹریٹ کی ایک بڑے مقبول شخصیت تھے۔ خدا معلوم کیا جادو تھا ان کی باتوں اور اُن کی شخصیت میں کہ جو بھی ایک دفعہ ملتا والہ وشیدا ہو جاتا تھا۔ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ فیروز صاحب سب کے دوست تھے اور سب کے کام آتے تھے۔

میں جب بھی اُن کے یہاں جاتا تو وہ میری دل چسپی کے پیش نظر اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات سناتے رہتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے، ''مشہور شاعر حیرتؔ شملوی اور میری ملازمت ایک ہی دن شروع ہوئی تھی۔ کیا آدمی تھے حیرتؔ، منکسر المزاج۔ دوست نواز۔ اپنے کام میں ماہر۔ وہ مترجم تھے۔ بڑے مشاق مترجم تھے۔ اسمبلی میں بھی رہے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے رائڈر ہیگرڈ کے ایک ناول کا ترجمہ بھی کیا تھا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے پہلو بدلا۔ ''ہیگرڈ بڑا زبردست ناول نگار تھا۔ تم نے نام تو سنا ہو گا۔ اُس کی دو کتابیں ہیں 'SHE' اور AYESHA جن کا اردو میں بڑا خوب صورت ترجمہ ہوا ہے۔ 'شی' کا ترجمہ 'عذرا' کے نام سے اور 'عائشہ' کا ترجمہ 'عذرا کی واپسی' کے نام سے۔ ''شی'' کا ترجمہ مولوی خلیل الرحمان نے کیا تھا، بڑے عالم تھے۔ بڑے پاکیزہ بزرگ تھے۔ دارالاشاعت پنجاب کے مولوی ممتاز علی نے انہیں 'شی' کے ترجمے کے لیے چالیس روپے دیے تھے۔ دوسری کتاب کے ترجمے کے لیے انہوں نے معاوضہ کم کر دیا۔ مولوی صاحب نے انکار کر دیا۔ پھر وہ ترجمہ 'ظاہر حسن' نے کیا۔'' میں نے پوچھا، ''یہ ظاہر حسن کون تھے؟'' کہنے لگے، ''ان کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔'' میں نے کہا، ''ہیگرڈ کے تین اور ناولوں کے بھی لاجواب ترجمے ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے ایک ناول کا ترجمہ ''بحر ظلمات'' کے عنوان سے کیا ہے۔ آپ کی دلّی کے مولوی عنایت اللہ نے Morning Star کا ترجمہ 'نجم السحر' کے عنوان سے کیا اور تیسرا یہ حیرتؔ صاحب کا ترجمہ۔'' خالو فیروز نے پھر پہلو بدلا۔ کہنے لگے، ''مولوی عنایت اللہ بڑے عجیب آدمی تھے۔ مولوی ذکا اللہ کے بیٹے تھے۔ حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ کے ناظم تھے۔ ساری زندگی ترجموں میں گزار دی۔ ریٹائر ہوئے تو ڈیرہ دون میں کوٹھی بنوالی۔ وہیں رہتے تھے۔ شادی وادی کا چکر نہیں پالا تھا۔ بس ایک دن چپکے سے مر گئے۔'' میں نے کہا، ''ہیگرڈ نے شی اور عائشہ کے طرز پر عذرا کی سوانح حیات بھی Wisdom's Daughter کے

نام سے لکھی تھی۔" خالو فیروز کہنے لگے، "تمہاری معلومات بہت اچھی ہے۔" ہاں تو حیرتؔ نے جس ناول کا ترجمہ کیا تھا اُس کا نام تھا بنی اسرائیل کا چاند۔ میں تو پڑھ کر انگشت بدنداں ہو گیا۔ حیرت نے کتنی محنت کی ہو گی۔ مصر کی قدیم تہذیب کے بارے میں معلومات کی ہو گی۔ یہ بھی 'عشق لازوال' کا مرقع ہے۔ سر سلطان احمد اُس زمانے میں انفارمیشن براڈکاسٹنگ کے ممبر تھے۔ انہوں نے دو صفحے کا تعریفی دیباچہ لکھا تھا۔ اب یہ کتاب کہیں ملتی نہیں، مل جاتی تو میں ایک دفعہ اور پڑھتا۔" پھر کہنے لگے، "حیرتؔ آدمی بھی اچھے اور شاعر بھی اچھے۔ چھوٹی بحر میں بڑی خوب صورت غزل کہتے تھے۔" میں نے پوچھا، "کوئی غزل یاد ہے؟" خالو فیروز نے کہا، اب حافظہ کام نہیں دیتا۔ پوری غزل تو یاد نہیں ایک غزل مجھے بہت پسند تھی اُس کے چند شعر سنائے دیتا ہوں۔

اُس بزم میں جو گردشِ پیمانہ ہو گئی
ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی
یا تھی وہی نگاہ کہ تھی چارہ سازِ دل
یا اب وہی نظر ہے کہ بیگانہ ہو گئی
حیرتؔ کے غم کدے میں خوشی کا گزر کہاں
تم آگئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

غزل کیا پڑھی خالو فیروز یادوں کے سمندر میں ڈوب گئے۔ "کیا خوب آدمی تھا حیرتؔ۔ نجانے کس کی نظر لگ گئی۔ شملے میں جو سالانہ مشاعرہ ہوتا تھا حیرتؔ ہمیشہ اُس میں نمایاں رہتا تھا۔ بڑے تاریخی مشاعرے ہوتے تھے۔ کون تھا جو نہیں آتا تھا۔ سر رضا علی صدارت کرتے تھے، میں نے ایسی دلچسپ، پُروقار اور کامیاب صدارت نہیں دیکھی اور حیرتؔ کی یاد آتی ہے تو دل میں ہوک اُٹھتی ہے۔ اُن کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا تھا۔ بڑی تکلیف اُٹھائی، بڑا علاج ہوا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ملازمت چھوڑ دی۔ رام پور چلے گئے۔ خط آتے رہتے تھے، پوسٹ کارڈ لکھتے تھے۔ پھر راجستھان چلے گئے وہاں رہے۔ وہاں سے بھی رابطہ رہا۔ وہاں بھی خوش نہیں رہ سکے۔ پاکستان قائم ہو چکا تھا ان کے کچھ عزیز سکھر میں تھے وہاں آگئے۔ وہاں سے کراچی آئے۔ عبد اللہ شاہ غازیؒ کے آستانے پر ایک حجرے میں قیام رہا۔ میں کبھی کبھی جاتا تھا دیکھ کر کھِل جاتے تھے۔ سگرٹ

کی پٹیوں پر غزلیں لکھتے رہتے تھے۔ شاہد صاحب نے ساقی میں ان کا بہت کلام شائع کیا۔ پوسٹ کارڈ پر غزل لکھی اور بھیج دی اور شاہد صاحب نے 'آئینہ حیرتؔ' کے عنوان سے غزل چھاپ دی۔ میرے پاس حیرتؔ کے بہت سے پوسٹ کارڈ تھے۔ بڑی احتیاط سے رکھے تھے۔ اتنی احتیاط سے رکھے کہ سب کھوئے گئے اگر مل جاتے تو تمھیں دے دیتا۔" خالو فیروز بہت دیر تک حیرت صاحب کو یاد کرتے رہے۔ بڑے افسردہ نظر آتے تھے۔ افسردگی اُن کے مزاج کے خلاف تھی۔ لیکن اس وقت وہ کسی اور ہی عالم میں تھے۔

ایک بار میں گیا تو کہنے لگے، "خوب آئے۔ آج تمھیں سیکریٹریٹ کا احوال سناؤں گا۔ کیا دفتر تھا۔ معمولی آدمی کے حواس گم ہو جاتے تھے۔ کیا شان دار عمارت تھی۔ ہر طرف انگریز کا دبدبہ نظر آتا تھا۔ وائسرائے کی شان یہ تھی کہ کوئی دفتری آدمی اُن کے پاس کوٹ پہنے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ ارے یہ تو یہ، لباسوں کے مہینے مقرر تھے۔ پندرہ اکتوبر سے پندرہ مارچ تک گرم کپڑے۔ سولہ مارچ سے چودہ اکتوبر تک گرمی کے کپڑے۔ سارا عملہ اس قانون کی پابندی کرتا تھا۔ انگریز کا نظام حکومت بڑا باضابطہ اور سخت تھا۔ انگریز ایک دوسرے کی پیچ بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ہمارے دفتر میں ایک نیا ڈپٹی سیکریٹری آیا۔ کسی صوبے سے تبادلے پر آیا تھا۔ چارج لینے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا تو وہاں فائلوں کے بنڈل اُس کے منتظر تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اُس کے کمرے میں ایک بڑی سی کھڑکی تھی جو ایک اندرونی صحن میں کھلتی تھی۔ اُس نے فائلیں ایک ایک کر کے وہاں پھینکنا شروع کر دیں۔ جب ساری فائلیں پھینک چکا تو کرسی سے اُٹھا اور چلا گیا۔

دفتر کے جوائنٹ سیکریٹری نے یہ آوازیں سنیں تو چپراسی کو بلا کر پوچھا یہ کیا ہے۔ چپراسی نے بتا دیا صاحب نے ساری فائلیں پھنکوا دی ہیں۔ جوائنٹ سیکریٹری نے ساری فائلیں وہاں سے اٹھوالیں۔ سب کو پڑھا اور حسبِ ضرورت احکام لکھ کر متعلقہ شعبے کو بھجوا دیے۔ دوسرے دن ڈپٹی سیکریٹری دفتر آیا اور اُسے حال معلوم ہوا تو بڑا اسٹ پٹایا مگر جوائنٹ سیکریٹری نے دفتر میں اُس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ یہ پاسداری تھی۔ بڑا نظم وضبط تھا۔ ذرا سی بے قاعدگی برداشت نہیں کی جاتی تھی اور محنت، کمال کی محنت، ایک بار گورنمنٹ آف انڈیا نے کسی ملکی

معاملے کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ دو بڑے انگریز ممبر تھے اور کمیشن کے سربراہ سر گلبرٹ لیتھویٹ تھے جو کسی محکمے کے سیکریٹری تھے۔ میں سر گلبرٹ کا پرائیویٹ سیکریٹری تھا۔ اس حیثیت سے کمیشن کے ساتھ تھا۔ ہم نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ میں اُس زمانے میں حقّہ پیا کرتا تھا۔ جس بڑے اسٹیشن پر ریل زیادہ دیر تک رُکتی تھی ڈبے میں ٹھاٹ سے حقّہ پیتا تھا۔ ایک دن سر گلبرٹ اپنے ڈبے سے اُتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے مجھے حقّہ پیتے دیکھا تو کہا،

Firoz! enjoying a a smoke

میں نے برجستہ جواب دیا Yes, Sir Gilbert. Would you like to share

اُس نے ہنس کر کہا۔ NoNo۔

اب صاحب کمیشن نے دورہ مکمل کر لیا۔ رپورٹ لکھی جانے لگی۔ رپورٹ میں کُل چوبیس باب تھے۔ دونوں ممبروں نے دو دو باب لکھے۔ سر گلبرٹ نے بیس باب لکھے۔ ایسے نہیں ہو جاتے تھے سر اور سیکریٹری۔"

"پاکستان بننے کے بعد میں پاسپورٹ کا انچارج مقرر ہو گیا تھا۔ ایک دن فارن آفس سے نکل رہا تھا تو ایک مانوس آواز سنائی دی۔ فیروز

Firoz what are you doing here?

میں نے پلٹ کر دیکھا تو برطانوی جھنڈے والی گاڑی سے سر گلبرٹ اُتر رہے تھے۔

میں نے کہا، IamheretowelcomeyouSirGilbert.

سر گلبرٹ مسکرائے۔ پوچھا، کہاں ہو، کیا کر رہے ہو؟ میں نے بتایا، پاسپورٹ کا انچارج ہوں۔ کہنے لگا۔ "شاید اسی لیے پاسپورٹ آفس صحیح چل رہا ہے۔" پھر بولے، "میں یہاں برطانوی ہائی کمشنر ہوں۔ پیلس ہوٹل میں دفتر ہے کسی وقت آؤ تو پُرانے دور کی باتیں کریں گے۔" مگر میں گیا نہیں نجانے کیا باتیں بنیں۔ رات گئی، بات گئی۔ اب اُس کا کیا لینا دینا ___ وہ ضرور دل میں سوچتا ہو گا۔ یہاں آ کر بالکل بدل گیا مگر میں بدلا نہیں تھا۔ فارن آفس کی مجبوری تھی۔

خالو فیروز کہنے لگے، "اب کچھ ہندوستانیوں کی ہیکڑی کے واقعات بھی سُن لو۔ ہندوؤں میں ایک سیاسی رہ نما ولبّھ بھائی پٹیل تھے۔ کانگریس کے مردِ آہن کہلاتے تھے۔ مسلمانوں سے متنفر تھے۔ ان کے بڑے بھائی وِ ٹھل بھائی پٹیل کونسل آف اسٹیٹ کے چیئرمین تھے۔ بڑا رعب

داب تھا مگر چھوٹے بھائی سے ڈرتے تھے۔ میں ان کا پرائیویٹ سیکریٹری تھا۔" میں نے کہا، "یہ کیا بات ہے کہ آپ سبھی کے پرائیویٹ سیکریٹری رہے؟" کہنے لگے، "پہلے یہی بات سن لو، بڑے افسر پرائیویٹ سیکریٹری کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ ایسا آدمی ہو جو سب کو جانتا پہچانتا ہو۔ باخبر ہو۔ افسر کے مزاج اور روش کو جانتا ہو۔ دفتر میں کوئی گڑبڑ نہ ہونے دے۔ سب کو سنبھالے رہے۔ کیا سمجھے؟ میں جس افسر کا بھی پرائیویٹ سیکریٹری رہا اُس نے مجھ پر پورا اعتبار کیا۔ مجھے عزت دی اور دفتر ہی نہیں گھر کے کاموں میں بھی مجھ سے مشورہ کیا۔ تو یہ وٹھل بھائی ولبھ بھائی سے ڈرتا تھا۔ ڈرتا کیا تھا گھبراتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے گھر واپس جاکر شکایت کرتا تھا کہ بھائی نے مجھے نظر انداز کیا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط تھی۔ تو اب یہ ہوا کہ ولبھ بھائی جب دلّی آتا اور اکثر آتا تھا تو بھائی کو پہلے سے اطلاع دیتا اور اُسی کے یہاں ٹھہرتا تھا۔ جب اطلاع آتی تو وٹھل بھائی مجھے بُلاتے۔ کہتے ولبھ آرہا ہے۔ اب تم میری ڈیوٹی چھوڑ کر اُس کی ڈیوٹی کرو۔ دیکھو کوئی شکایت نہ ہونے پائے سمجھ گئے۔ میں کہتا سمجھ گیا۔ اب ولبھ بھائی آندھی طوفان کی طرح آدھمکتے۔ میں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتا اور اتنا آرام پہنچاتا کہ وہ میرا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتا۔ بھائی سے بات کرتا تو مجھے پوچھتا۔ ایک دن وٹھل بھائی نے پوچھا، فیروز صاحب (وہ ہمیشہ مجھے فیروز صاحب کہتا تھا۔ ولبھ بھائی بھی فیروز صاحب کہتا تھا) آخر بات کیا ہے۔ ولبھ جیسا DifficultMan تمہیں اتنا مانتا ہے۔" میں نے کہا، "پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ کا کرم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں انہیں ہنساتا رہتا ہوں۔ اس لیے وہ مجھ سے خوش رہتے ہیں اور مجھے پسند کرتے ہیں۔"

اب خالو فیروز نے پہلو بدلا اور کہا" وٹھل بھائی کی ہیکڑی کا واقعہ بھی سُن لو۔ وائسرائے نے یہاں سے اطلاع آئی کہ آپ اپنے دفتری عملے میں سے کس کو خطاب کے لیے نامزد کرنا چاہتے ہیں تو نام اور حیات نامہ بھیج دیجئے۔ وٹھل بھائی نے اپنے ہیڈ اردلی کا نام خان بہادری کے لیے بھیج دیا جو ایک مسلمان تھے۔ وہاں سے فوراً اطلاع آئی کہ اگر آپ کے دفتر کے ہیڈ اردلی کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا تو سارے ہندوستان کے مسلمان خان بہادر اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ لہٰذا دوسرا موزوں نام بھیج دیجئے۔ وٹھل بھائی نے جواب بھجوایا کہ میرے لحاظ سے یہی نام سب سے موزوں ہے۔ میں کوئی اور نام نہیں بھیج سکتا۔ دیکھی تم نے اکڑ۔" وائسرائے کی بھی

کوئی پروا نہیں کی۔"

ایک دن خالو فیروز سے ملاقات ہوئی تو پڑوس میں کوئی تقریب تھی۔ ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا، "دفتر کے قصے تو بہت سُن لیے، موسیقی سے بھی دلچسپی رہی؟" کہنے لگے، "رہی، ستار سیکھنے کی کوشش کی مگر سُر اور تال دونوں قابو میں نہیں آئے۔ ہاں ایک واقعہ یاد آیا ہم لوگ گرمیوں میں شملہ جاتے تھے۔ حکومت کا 'سمر ہیڈ کوارٹر تھا' وہاں ایک احاطہ تھا جو مولوی صاحب کا کمپاؤنڈ کہلاتا تھا۔ اُس میں کچھ مکان تھے۔ مولوی صاحب ایک مکان ہمارے لیے محفوظ رکھتے تھے۔ کمپاؤنڈ کے سامنے ایک پنواڑی کی دکان تھی۔ وہاں شام کو ایک آدمی ہارمونیم بجا کر گاتا رہتا تھا۔ کیا سوز تھا اُس کی آواز میں۔ چلنے والے ٹھہر جاتے تھے۔ میں بھی جب اُدھر سے گزرتا تو تھوڑی دیر ٹھہر کر اس کا گانا سنتا۔ کبھی کبھی اُس کی جیب میں کچھ ڈال بھی دیتا۔ وہ احسان مندی کی ایک نظر مجھ پر ڈالتا۔ پھر اُس نے آنا بند کر دیا۔ کئی برس ہو گئے۔ اب جو دیکھا تو وہ فلمی ہیرو اور گانے میں نمبر ون۔ اُس کی فلم دیوداس بڑی مشہور ہوئی۔ بہت سی فلموں میں آیا۔ ایک دفعہ دلّی میں ایک میوزک کانفرنس ہوئی۔ فن کاروں میں اُس کا بھی نام تھا۔ خلقت ٹوٹ پڑی۔ ہزاروں آدمی تھے۔ اُس کے گانے پر پبلک ٹوٹ پڑی۔ خیر جب وہ گا چکا تب بھی لوگ ڈٹے رہے۔ میں بھی منتظر رہا۔ کچھ چھیٹر ہوئی تو میں لوگوں کو چیرتا پھاڑتا اُس تک پہنچ گیا۔ گلدستہ پیش کیا۔ اُس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا پھر پہچان گیا۔ لپٹ گیا سب کی خیریت پوچھی۔ اُس کی نگاہوں میں دیرینہ شناسائی کی ایک لہر جگمگا رہی تھی۔ پھر اُس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟ وہ تھا کندن لال سہگل۔ جس کی آج بھی دھوم ہے۔"

میں نے بارہا غور کیا کہ خالو فیروز میں ایسی کیا بات تھی کہ لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اُن کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ صرف یہی سمجھ میں آیا کہ وہ ہر ایک کے دوست تھے۔ بہت بڑوں بڑوں کے بھی اور معمولی آدمیوں کے بھی۔ میں نے اُن کے ایک بیٹے کی شادی میں اُس وقت کے صدر اسکندر مرزا کو بھی دیکھا اور اسی محفل میں اُس وقت کے وزیر اعظم شہید سہروردی بھی نظر آئے۔ اسکندر مرزا انہیں چچا کہہ کر باتیں کر رہے تھے۔ سہروردی اُن سے بھائی فیروز کہہ کر گفتگو کر رہے تھے۔ قاعدے کے مطابق صدر اور وزیر اعظم ایک محفل

میں یک جا نہیں ہوتے مگر خالو فیروز کے یہاں دونوں یک جا تھے۔ اور نجانے کتنے لوگ تھے جن سے اُن کا یارانہ تھا۔ میں نے سُنا ہے کہ اُن کے ایک صاحب زادے کی شادی میں اُس وقت کے گورنر جنرل غلام محمد بھی موجود تھے۔ اُن میں اور خالو فیروز میں کچھ گفتگو "جامع مسجد کے روزمرہ" میں بھی ہوئی تھی۔

میرا خیال ہے کہ خالو فیروز کی ہر دل عزیزی کا سبب اُن کا کھلا ڈلا انداز تھا۔ چھوٹا ہو یا بڑا۔ سب سے یکساں بات کرتے تھے۔ سب کی مدد کرتے تھے۔ ہر ایک کے دُکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ اُن کے یہاں تکلف۔ تصنع اور بناوٹ نہیں تھی۔ خلوص تھا، محبت تھی اور ہر ایک کی دلداری تھی۔

مثل مشہور ہے اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ خالو فیروز نے اولاد بھی بڑی سعادت مند پائی۔ بڑے بیٹے حسن بھائی واہ فیکٹری میں ملازم تھے۔ عین میں باپ کی شبیہہ۔ وہی تن و توش وہی ہنسنے ہنسانے والا لہجہ۔ ہر ایک سے ہنسی مذاق۔ اُن سے چھوٹے محمود زیدی علی بھائی کہلاتے تھے۔ ہنس مُکھ وہ بھی تھے اور سب کے کام کرتے تھے۔ فلپس کمپنی نے رنگین ٹی وی متعارف کیا۔ ہمارے گھر میں یہ فیصلہ ہوا کہ رنگین ٹی وی خرید لینا چاہیے کسی نے کہا، "علی بھائی سستا اور اچھا دلوا سکتے ہیں۔" چنانچہ انہیں فون کیا گیا۔ انہوں نے دو باتیں پوچھیں، "کب چاہیے اور کس سائز کا چاہیے؟" انہوں نے ہمارا جواب سُن کر کہا، "بس پہنچ جائے گا۔" ہم نے کہا "قیمت؟" بولے "وہ بھی طے ہو جائے گی۔" دوسرے دن کیا دیکھتے ہیں کہ فلپس کا رنگین ٹی وی چلا آرہا ہے۔ میکنک ساتھ تھا۔ اُس نے نیا محل بستا ہے، پُرانا محل گرتا ہے کے مصداق پرانا ٹی وی ہٹایا۔ نیا ٹی وی فٹ کیا۔ کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ بتایا اور سلام کر کے چلا گیا۔ اب ہمیں یہ فکر کہ قیمت تو بتائی ہی نہیں۔ خاصے دن بعد قیمت بتائی تو بازار سے بہت کم۔ بس انہوں نے ایک کام نہیں کیا۔ وہ انسانی وسائل کے بڑے ماہر تھے۔ میں نے انہیں بہتیرا اسے پر لگایا کہ انسانی وسائل کے حوالے سے اردو میں ایک اعلیٰ درسی کتاب مرتب کر دیں مگر وہ ٹالتے رہے۔ آخر میں یہ کہنے لگے کہ میں کتاب نہیں لکھ سکتا۔ بہت مشکل کام ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

خالو فیروز کے تیسرے صاحب زادے مظفر زیدی مجّھو بھائی کہلاتے تھے۔ بنے بنائے

خالو فیروز تھے۔ وہی لب و لہجہ، وہی شگفتگی اور وہی خدمت کا جذبہ۔ آغا حسن عابدی کے بینک سے وابستہ ہوئے اور لندن کے ہو گئے۔ چوتھے بیٹے ڈاکٹر منظور زیدی ملک کے مشہور معالج۔ سرطان کے خصوصی ڈاکٹر۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ملک میں سرطان کے واحد بڑے ڈاکٹر تھے۔ خلیق، بُردبار مگر اصولوں میں سخت۔ مدتوں جناح اسپتال میں کینسر ریسرچ کے ڈائریکٹر رہے۔ اُن کا اصول تھا کہ جس مریض کو اسپتال میں دیکھتے تھے اُسے مطب میں نہیں دیکھتے تھے اور جس مریض کو مطب میں دیکھتے اُسے اسپتال میں نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ بے اصولی ہے اور ایک بڑی اہم بات یہ کہ دوسرے ڈاکٹروں کے مقابلے میں فیس بہت کم لیتے تھے۔ دوسرے ڈاکٹر اعتراض بھی کرتے تھے مگر وہ اُن کی نہیں سنتے تھے۔ منظور بھائی سارے خاندان کے طبّی مشیر ہیں، ڈاکٹروں کے نام بتاتے ہیں لیکن کوئی دوا کبھی نہیں بتاتے۔

ایک بات جو میں نے خالو فیروز اور اُن کے بچوں میں دیکھی یہ تھی کہ وہ تمام رشتے داروں کے یہاں ہر تقریب میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ آج کے زمانے میں امارت اور شہرت کے نشے نے رشتوں کی جڑیں بھی کھوکھلی کر دی ہیں لیکن کوئی محفل ہو کسی رشتے دار کے یہاں تقریب ہو خالو فیروز اور اُن کا خاندان ضرور وہاں نظر آتا تھا۔ یہ محبت اور خلوص کی بات ہے۔ بڑے پن کی بات ہے، اب یہ بات آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی ہے۔

خالو فیروز ہر شخص کی مدد کرتے تھے۔ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ سب کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ میں اس سلسلے میں دو واقعات پیش کروں گا۔ پہلا واقعہ میرا پڑھا ہوا ہے اور دوسرا ذاتی واقعہ ہے۔

یہ پاکستان قائم ہونے کے تھوڑے عرصے بعد کی بات ہے۔ انکم ٹیکس کے محکمے میں ایک صاحب تھے فاضلی صاحب۔ بڑے افسر تھے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت بھی مرتّب کی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کوئی بہت بڑے افسر مجھ سے ناراض ہو گئے۔ نکال تو نہیں سکتے تھے لیکن تبادلہ کر دیا اور تبادلہ بھی کالے کوسوں دور چاٹگام کا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بڑا پریشان ہوا۔ بھاگ دوڑ کی۔ کچھ نہ ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کیا جائے۔ کسی صاحب نے بتایا کہ پیر کالونی میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ بس اسٹاپ کے سامنے مکان ہے۔ سیّد حسن فیروز

نام ہے۔ سنا ہے کہ وہ ہر شخص کی مدد کرتے ہیں۔ اُن سے ملو۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ سیّد حسن فیروز کے پاس گیا۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ سارا احوال سنا، پھر کہنے لگے، "گھبرایئے نہیں۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" اُن کی اس تسلی سے دل کو کچھ ڈھارس تو ہوئی لیکن اندیشے قائم رہے۔

تین چار دن گزر گئے، ایک صبح جو دفتر گیا تو حکم رکھا ہوا تھا۔ "آپ کا تبادلہ منسوخ کیا جاتا ہے، کراچی میں کام کرتے رہیے۔" کیا کہوں کیسی خوشی ہوئی۔ شام کو مٹھائی اور پھول لے کر فیروز صاحب کے گھر گیا۔ وہ مٹھائی اور پھول دیکھ کر ناراض ہوئے کہنے لگے، "میاں کارساز اللہ ہے۔ اُس کا شکر ادا کرو۔ اور کبھی کسی کو آزار نہ پہنچاؤ۔"

میں نے ایک دن خالو فیروز سے اس واقعے کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے، "کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔ کتاب میں لکھا ہے تو درست ہی ہوگا۔" میں نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ وزیر خزانہ نے یہ تبادلہ منسوخ کیا تھا۔ کہنے لگے، "میاں ہندی کی چندی نہ نکالو۔ کام سے کام رکھو۔"

دوسرا واقعہ خود میرا ہے۔ ہوا یہ کہ انجمن ترقی اردو نے میری کتاب "محمد حسین آزاد، حیات و تصانیف" شائع کی۔ معاہدہ یہ ہوا کہ دو ہزار روپے رائلٹی ملے گی۔ کتاب شائع ہوگئی، خوب فروخت ہوئی اس کتاب پر داؤد ادبی انعام بھی ملا لیکن رائلٹی نہیں ملی۔ جب تقاضا کیا یہی جواب ملا کہ زیرِ غور ہے۔ کبھی معلوم ہوا کہ ساری کارروائی ہوگئی ہے بس صدر صاحب کی منظوری کی دیر ہے۔ جب جاتا ایسا ہی مایوس کن جواب ملتا۔ ایک دن میں انجمن کے دفتر میں اوپر جارہا تھا۔ دور گیٹ پر خالو فیروز پر نظر پڑی۔ بڑا تعجب ہوا۔ یہ یہاں کہاں پھر خیال آیا کہ اختر حسین صاحب صدر ہیں۔ بڑے پُرانے بیوروکریٹ ہیں۔ مغربی پاکستان کی گورنری سے فارغ ہوئے تو انجمن اُن کے سپرد کردی گئی ہے۔ خالو فیروز انہی سے ملنے آئے ہوں گے۔ سامنے انجمن کے پیر مرد صوفی عبدالرشید کھڑے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا یہ صاحب جو ابھی موٹر میں گئے ہیں کون ہیں؟" صوفی نے کہا، "تعجب ہے آپ انہیں نہیں جانتے۔ سیّد حسن فیروز ہیں۔ صدر صاحب سے بڑی دوستی ہے۔ اکثر اُن کے پاس آیا کرتے ہیں۔ لوگ خاموشی سے دیکھتے ہیں کہ صدر صاحب انہیں

دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور وہ بھی جب تک بیٹھتے ہیں صدر صاحب جیسے سنجیدہ آدمی کو ہنساتے رہتے ہیں۔" میں نے دل میں کہا، "چلو کام بن گیا۔"

شام کو میں پیر کالونی گیا۔ خالو فیروز سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ساری الف لیلیٰ سنائی بہت ہنسے۔ کہنے لگے، "یار تم بڑے بیوقوف ہو۔ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ دو تین دن میں چیک مل جائے گا۔" تین دن کے بعد انجمن سے فون آیا کہ آپ کا چیک تیار رکھا ہے۔ آکر لے جایئے۔ اگلے دن میں خوشی خوشی انجمن گیا۔ عملے کے چہرے مجھے دیکھ کر لٹک گئے۔ چیک مل گیا۔ میں گھر آگیا۔ شام کو میں بیوی کے ساتھ پھر کالونی گیا۔ خالو فیروز نے دیکھتے ہی کہا، "چیک مل گیا۔" میں نے کہا، "جی مل گیا۔" بولے، "اگر پہلے بتادیتے تو اتنی پریشانی کیوں ہوتی۔ جتنے پُرانے لوگ ہیں سب سے ملنا جلنا ہے۔ سارے جائز کام ہوجاتے ہیں۔ اُلٹے سیدھے کام نہیں ہوتے۔ یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے۔ پھر انہوں نے مٹھائی اور پھولوں پر نظر ڈالی اور میری بیوی سے کہا، "ان سے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ داماد ہیں مگر تو یہ سب کیوں لائی ہے۔ جی چاہتا ہے سب اُٹھا کر پھینک دوں۔" میری بیوی نے کہا، "خالو ابا، خوشی کی بات ہے۔" کہنے لگے، "اور کام کرو۔ آگے قدم بڑھاؤ۔ یہ مٹھائی وٹھائی سب فضول ہے۔"

رفتہ رفتہ خالو فیروز کے بیٹے اپنے اپنے مکانوں میں منتقل ہونے لگے۔ کالونی کا مکان چھوٹا تھا۔ سب کو تکلیف ہوتی تھی۔ خالو فیروز کی اجازت سے علی بھائی سوسائٹی منتقل ہوگئے۔ منظور بھائی کو جناح اسپتال میں مکان مل گیا۔ پھر انہوں نے ڈیفنس میں مکان بنوالیا۔ حسن بھائی واہ میں مقیم تھے۔ مجھو بھائی لندن میں آباد ہوگئے۔ خالو فیروز اور بھابو اکیلے رہ گئے۔ اُن کی بیگم سارے خاندان میں بھابو کہلاتی تھیں۔ گھر پر سناٹا چھا گیا مگر خالو فیروز ویرانے میں بھی بہار کا انداز پیدا کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے گھر کو شاد و آباد رکھا۔ اُن دنوں ٹی وی نیا نیا رائج ہوا تھا۔ شام کے پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک چلتا۔ اُس زمانے کے لحاظ سے مہنگا بھی تھا۔ خالو فیروز نے یہ کیا کہ شام کو بڑے کمرے میں دری بچھوالی۔ پانی کی صراحیاں اور کٹورے رکھے گئے۔ ایک بڑی میز پر ٹی وی رکھا گیا۔ جو ٹھیک پانچ بجے کھول دیا جاتا محلّے اور آس پاس کے تمام بچّوں اور عورتوں کو اجازت تھی کہ آئیں، بیٹھیں اور ٹی وی دیکھیں۔ ایک میلہ لگا رہتا تھا۔ بچے اُدھم مچارہے ہیں۔

دھینگا مشتی بھی ہو جاتی۔ عورتیں رات کا کھانا دوپہر کو پکا کر آن بیٹھتیں۔ خالو فیروز دیکھ رہے ہیں۔ خوش ہو رہے ہیں۔ بھابو کبھی کبھی جُز بُز بھی ہوتی تھیں۔ "بڑا اُدھم مچاتے ہیں یہ بچے۔" خالو کہتے، "خدا کا شکر کرو۔ گھر میں رونق رہتی ہے۔"

آخر میں خالو فیروز بیمار رہنے لگے تھے۔ کوئی پوچھتا، "کیا ہو گیا ہے۔ کس کا علاج ہے؟" تو خالو فیروز کہتے، "میاں منظور اتوار کی صبح آتے ہیں۔ ایک گولی مجھے کھلاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کاہے کی گولی ہے تو جواب گول کر جاتے ہیں۔ میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ خوب سمجھتا ہوں۔ کیا مرض ہے مگر کبھی منہ سے بھاپ نہیں نکالتا۔"

آخر کار ایک دن سب کو ہنسانے والا سب کو رُلا کر چلا گیا۔ ایک روایت ختم ہو گئی، ایک عہد ختم ہو گیا۔

میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ آخری دور کی دلی میں تین مسلمانوں کی آنکھ میں موہنی تھی۔ ایک تو اپنے خالو فیروز اور دوسرے اشتیاق احمد چشتی جو شاہد احمد دہلوی کے رشتے کے ماموں تھے اور اُن کی خاندانی جائیداد کے نگراں تھے۔ چشتی صاحب کو میں نے نہیں دیکھا۔ لوگ کہتے تھے کہ انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے تھے مگر بڑے بڑے انگریزوں سے دوستی تھی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت اور بعد ازاں بہ سلسلہ ملازمت ڈھاکہ بھجوانے والے وہی تھے۔ میں نے ایک دفعہ شادانی صاحب سے اُن کے بارے میں پوچھا تو اُن کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں، گلا رُندھ گیا اور انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تیرے صاحب کا تذکرہ مُلّا واحدی نے کیا ہے مگر مجھے اُن کا نام یاد نہیں رہا۔

موہنی کیا ہوتی ہے کس کی آنکھ میں ہوتی ہے، اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں۔ میں ان سب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ جانتا ہوں کہ خالو فیروز ساری زندگی دوسروں کی خدمت کرتے رہے اور نجانے کیا موہنی تھی کہ جس نے دیکھ لیا وہ بن داموں خادم ہو گیا۔ یہی بات چشتی صاحب کے بارے میں بھی سُنی تھی۔ اب نہ موہنی ہے نہ موہن۔ نہ موہن کی مُرلیا باجے ہے۔ یہ بھی خاموش ہو گئیں۔

۱۸/ فروری ۲۰۱۴ء

شبیر علی کاظمی

"پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی"

ڈھاکے کے شاہ باغ ہوٹل میں بڑی گہما گہمی تھی۔ رائٹرز گلڈ کا جلسہ تقسیم انعامات اس سال ڈھاکا میں منعقد ہونے والا تھا۔ مغربی پاکستان سے آنے والے ادیبوں، شاعروں اور عالموں کا ہجوم تھا۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل تھا۔ ایک صاحب نظر پڑے۔ چھوٹا قد، باوقار چہرہ، نفیس شیروانی، علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ، شخصیت پر علی گڑھ کی گہری چھاپ۔ "ہجوم سخن وراں" میں سب سے منفرد نظر آئے۔ میں نے انہیں دیکھا تو انہیں سلام کیا اور اُن کی طرف بڑھا۔ انہوں نے بڑی محبّت سے معانقہ کیا۔ بولے، "میں شبیر علی کاظمی ہوں۔" میں نے کہا، "چلیے۔ اچھا ہوا بنگلہ اردو کا اشتراک یہیں ہو گیا۔" مسکرائے، کہنے لگے، "ماشاء اللہ۔ برجستہ گو ہیں۔ محمد حسین آزاد کہاں ہیں؟" میں نے کہا، "ساتھ ہی ہیں۔ تھیلے میں بند ہیں۔" ہم دونوں بیٹھ گئے اور باتیں چھڑ گئیں۔ بنگلہ اور اردو کے اشتراک پر ان کا کام انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ انعام وصول کرنے راج شاہی سے ڈھاکے آئے تھے۔ راج شاہی یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ شعبہ اردو کے صدر اور یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔

پھر جو ساتھ ہوا تو ایسا کہ ہم دونوں تقریب کے دوران پاس بیٹھے، انعامات کی تقریب کے علاوہ جو دوسری تقریبیں ہوئیں اُن میں بھی مسلسل ساتھ رہا۔ بڑے بذلہ سنج تھے۔ بڑی دل چسپ گفتگو کرتے تھے۔ کہنے لگے۔ "ذرا فرصت ملے تو پھر آپ کو ڈھاکے کی سیر کراؤں۔ یہ لوگ ڈھاکے کو کیا جانیں۔" خدا معلوم کس بازار میں لے گئے۔ ایک دکان پر ٹھہرے۔ کہنے لگے، "یہ ڈھاکے کے میٹھے دہی کی سب سے بہتر دکان ہے۔" ہم دونوں نے دہی چکّھا۔ واقعی بہت

عمدہ تھا۔ مسجد بیت المکرم دیکھی۔ کچھ اور مسجدوں میں گئے۔ موتی جھیل پر یہ ہوا کہ ہم دونوں جس رکشا پر جارہے تھے ایک اور رکشا سے اُس کی ٹکر ہوگئی۔ دونوں رکشا چلانے والے مارنے مرنے پر تُل گئے۔ کاظمی صاحب رکشا سے اُترے اور بنگالی میں دونوں کو سمجھانا اور ڈانٹنا شروع کردیا۔ ذرا سی دیر میں دونوں کے ہاتھ ملوائے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اس واقعے سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ کاظمی صاحب بنگلہ خوب بولتے ہیں اور جھگڑنے والوں میں صلح صفائی بھی کرادیتے ہیں۔ معاملہ فہم ہیں۔

ڈھاکے کی ملاقات مختصر تھی۔ انہوں نے بڑی محبت سے کہا، "اگر وقت ہوتا تو آپ کو راج شاہی لے چلتا۔ آپ دیکھتے کہ چھوٹے شہروں میں اہل علم کی کیسی عزت و تکریم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میں اور ڈاکٹر عترت حسین زبیری یونیورسٹی سے پیدل نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یقین مانیے کہ جس طرف سے گزرتے ہیں راستہ چلنے والے ٹھہر کر سلام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے دکان دار گدّی سے سلام کے لیے اُٹھ جاتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ میں اور ڈاکٹر زبیری بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک دکان میں رکھا ہوا سوٹ کا کپڑا انہیں پسند آیا۔ کہنے لگے، "چلو ذرا دیکھیں۔" ہم دونوں دکان میں گئے۔ کپڑے کا تھان نکلوا کر دیکھا اور یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس کا ایک سوٹ سلوائیں گے۔ قیمت دریافت کی۔ دکاندار نے ہمارے اصرار کے باوجود قیمت نہیں بتائی۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک بات کرتے رہے پھر گھر چلے آئے۔ ذرا دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی کپڑے کا بنڈل دے کر باہر ہی باہر چلا گیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے اندازے سے قیمت بھجوائی جو خاموشی سے قبول کرلی گئی۔ کوئی ردوقدح نہیں ہوئی۔ کیا سیدھے اور سچے لوگ تھے۔

ڈھاکے میں ہم لوگ شادانی صاحب سے ملے۔ فوق اور نظیر صدیقی سے ملے۔ انجمن ترقی اردو کے حبیب انصاری سے ملے۔ سرور بارہ بنکوی سے ملے۔ شاہین غازی پوری سے ملے۔ جس سے بات کی اس نے کاظمی صاحب کی بذلہ سنجی، علمی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ وہ یونیورسٹی کو ایسے ڈھنگ اور سلیقے سے چلا رہے ہیں کہ اپنے پرائے سب اُن کی تعریف کرتے ہیں۔ بنگالیوں میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ "دوئی کی بو" بھی باقی نہیں رہی۔

تقریب ختم ہو گئی۔ ہم لوگ تشنگی کے احساس کے ساتھ واپس آ گئے۔ بڑا افسوس رہا کہ اگر وقت ہوتا تو کچھ اور دیکھتے اور سیر کرتے۔ ہمارا مشاہدہ سطحی تھا کیونکہ ہم نے نفرت کی وہ آنچ محسوس نہیں کی جو اندر ہی اندر محبت اور خلوص کو پھونک رہی تھی۔ کاظمی صاحب سے خط کتابت رہی لیکن کم کم۔ ان کی معاملہ فہمی، دور اندیشی اور گھریلو معاملات میں ان کی سوجھ بوجھ کو سراہتا رہا۔ ڈھاکے کی سیر میں ایک جگہ رُکے اور بولے، "بیگم کے لیے ساری بھی لے جاؤ گے؟" میں نے کہا، "یہ تو ضروری ہے۔" کہنے لگے، "چلو! سامنے "پبنا ساری اسٹور" ہے۔ ساریوں کی سب سے بڑی دکان۔ وہاں چلتے ہیں۔" وہاں گئے تو دکان کا مالک خود اُٹھ کر آیا۔ کاظمی صاحب سے مصافحہ کیا۔ خیریت پوچھی۔ میرے بارے میں دریافت کیا۔ اتنی دیر میں "تھری کاسل" سگریٹ کی ڈبیا آ گئی، کوک آ گیا۔ میں حیران کہ یہ سب کیا ہے۔ دکانداری ایسے بھی ہوتی ہے۔ پھر کاظمی صاحب نے کہا، "دیکھو یہ بھی میری طرح اُستاد ہیں۔ بیگم کے لیے ساری خریدنا چاہتے ہیں۔" اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے سامنے ساریوں کے ڈھیر لگ گئے۔ پسند مشکل ہو گئی۔ یہ مشکل بھی کاظمی صاحب نے حل کی۔ ایک ساری کی طرف اشارہ کر کے کہا، "یہ لے لو۔ بہت عمدہ ہے۔" میں نے وہ ساری خرید لی۔ قیمت اندازے سے کم ادا کرنا پڑی۔ میں نے دکان سے باہر نکل کر کہا، "آپ تو راج شاہی میں پڑھاتے ہیں مگر یہاں بھی آپ کی اُستادی مُسلّم معلوم ہوتی ہے۔" مسکرائے اور غالبؔ کا مصرع پڑھا، "گویاں نہیں یہاں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ فرخی صاحب، یہ بنگلہ اردو اشتراک اور ربط باہم ہے۔"

ہماری وطن واپسی کے بعد حالات دگرگوں ہوتے گئے۔ اردو بنگلہ اشتراک ایک بھیانک خواب میں تبدیل ہو گیا۔ روزانہ بُری بُری خبریں سننے میں آنے لگیں۔ کاظمی صاحب سے دو چار خطوں کا تبادلہ ہوا مگر خطوں میں اصل حقیقت کہاں معلوم ہوتی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا اور پھر مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کا روپ دھار لیا۔ ایک دن نظیر صدیقی ریڈیو اسٹیشن پر ملے۔ وہ سقوط ڈھاکا سے پہلے کراچی آ گئے تھے۔ بات چیت ہوئی تو کہنے لگے، "بڑی اندوہ ناک خبر ہے۔ کاظمی صاحب کے اہلِ خاندان کو ان کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیا گیا۔ صرف وہ، ان کی بیگم اور ایک بیٹی زندہ بچ گئی اور کسی نہ کسی طرح ڈھاکے ہوتی ہوئی یہاں آ گئی ہیں۔" دل پر ایک گھونسا

لگا تھا۔ یہ بھی سُننا تھا۔ سارا دن طبیعت پر اُداسی طاری رہی۔ رہ رہ کر انہی کا خیال آتا رہا۔ اُن کی قیام گاہ کا پتا لگانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

دو تین دن کے بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمود حسین خاں جو اُن دنوں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور ڈھاکے میں مدتوں رہ چکے تھے پتا معلوم کر کے کاظمی صاحب کے یہاں پہنچے۔ انہیں ساتھ لے کر یونیورسٹی آئے۔ شعبہ تصنیف و تالیف میں لے گئے۔ وہاں کاظمی صاحب سے کہا، "اسے سنبھالیے یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔" کاظمی صاحب خاموش رہے۔ تیسرے دن وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور بڑے ادب سے کہا، "ڈاکٹر صاحب، میں اب کام نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر صاحب یہ سُن کر ہکّا بکّا رہ گئے تھے مگر کیا کہہ سکتے تھے۔ کاظمی صاحب خاموشی سے چلے آئے۔

انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی جمیل الدین عالی کو بھی کاظمی صاحب کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کی اطلاع ملی۔ وہ بھی اُن کے یہاں پہنچے، ساتھ لائے۔ انجمن کے دفتر میں بٹھایا اور کہا، "اب آپ کو یہاں بیٹھنا ہے۔" کاظمی صاحب نے کہا، "میں کام نہیں کر سکتا۔" عالیؔ نے کہا، "کیا میں آپ سے کام کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ روزانہ جب جی چاہے یہاں آئیے۔ بیٹھے جب جی چاہے چلے جائیں۔ ملنے جُلنے والے آئیں گے کچھ دل بہل جائے گا۔" یہ بات کاظمی صاحب کی سمجھ میں آگئی اور وہ روزانہ انجمن آنے لگے۔

میں اُن دنوں اردو کالج میں ایم اے کا ایک کلاس پڑھاتا تھا۔ معلوم ہوا تو کلاس ختم کر کے کاظمی صاحب کی طرف پہنچا۔ اُن پر نظر پڑی تو غالبؔ کا مصرع "رگ وپے میں جب اُترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو" بے اختیار اس احساس کے ساتھ ذہن میں اُبھرا کہ زہر غم رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔ یہ وہ کاظمی صاحب ہی نہیں تھے۔ خاموش۔ اپنے آپ میں گم سُم، کمر جھکی ہوئی، چہرے پر اُداسی کے گہرے نقوش، آواز نہایت مدھم، بڑی دیر تک بیٹھا رہا، کچھ شعر پڑھے۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ وہ گلشن میں میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ ساڑھے چار بجے دفتر بند ہونے لگا تو میں نے رکشا منگوایا۔ انہیں بٹھایا، خود بیٹھا، انہیں اُن کے گھر پر چھوڑا اور اُداس اپنے گھر چلا آیا۔ ساری شام سوچتا رہا۔ بار بار کاظمی صاحب کا خیال آتا رہا۔ "کیا

ہوئی آپ کی وہ شوخی گفتار و نگاہ + اب نہ اگلی سی وہ باتیں ہیں نہ افسانہ کوئی۔" کاش اتنا دُکھ کاظمی صاحب کے حصے میں نہ آتا۔

میں نے یہ دستور بنالیا کہ اردو کالج سے اُٹھتا تو انجمن میں کاظمی صاحب کے پاس کچھ دیر بیٹھتا۔ باتیں کرتا، شعر پڑھتا۔ لطیفے سناتا، ہنسانے کی کوشش کرتا مگر وہ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہتے۔ کسی گہری سوچ میں غرق رہتے۔ بڑی مدھم آواز میں بات کرتے۔ میں اُن کے مزاج کا رُخ بدلنے کے لیے ایک دن اُنہیں اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن لے گیا۔ ادب کے انچارج کو پہلے ہی اعتماد میں لے لیا تھا۔ سُرخ بتّی جلی۔ پروگرام شروع ہوا۔ گفتگو ہونے لگی۔ میں نے دو تین دفعہ کاظمی صاحب کو اشارہ کیا مگر وہ بُت بنے بیٹھے رہے۔ پروگرام ختم ہوگیا۔ کاظمی صاحب نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اسٹوڈیو سے باہر نکل کر انہوں نے مجھ سے کہا، "دیکھو میاں۔ مجھے آئندہ یہاں نہ لانا۔ میں اب گفتگو نہیں کر سکتا۔"

لاہور میں ایک بڑی اردو کانفرنس کا اہتمام ہوا۔ سارے ملک سے مندوبین بُلائے گئے تھے۔ ایک دن عالی صاحب نے کاظمی صاحب سے فون پر کہا، "دن بھر کمرے میں بیٹھے بیٹھے آپ گھبرا گئے ہوں گے جائیے ذرا لاہور کی سیر کر آیئے۔ وہاں اردو کانفرنس ہو رہی ہے۔" میں ان دنوں کراچی یونیورسٹی میں شعبہ تصنیف و تالیف کا سربراہ بھی تھا۔ میرے پاس بھی بُلاوا آیا تھا۔ اس بلاوے کے بعد میں کاظمی صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے کہا، "لاہور جانے کی پخ لگ گئی ہے۔" میں نے کہا، "میں بھی جارہاہوں۔" بولے، "تو بس۔ تم مجھے لے چلنا۔"

میں انہیں گھر سے ایئرپورٹ لے گیا۔ لاہور پہنچ گئے۔ لاہور ہوٹل میں قیام کا انتظام تھا۔ صبح کو ناشتا آیا تو اُس میں کارن فلیک بھی تھے اور اتنے تھے کہ ہم دونوں نے پیٹ بھر کر کھائے۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کاظمی صاحب اپنی مدھم آواز میں کہنے لگے، "چلو اچھا ہوا دوپہر کے کھانے سے نجات مل گئی۔ شام کے کھانے سے بھی نجات مل گئی۔" میں نے بہتیرا چاہا کہ انہیں جہانگیر کے مقبرے، شاہی مسجد اور شاہی قلعے لے جاؤں مگر وہ کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ صرف مزار اقبالؒ پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ شاہی مسجد کو اُداس نظروں سے دیکھا اور کہا، "چلو بس چلو۔" کانفرنس میں بھی خاموش اور گم سم بیٹھے رہے۔ نہ منھ سے بولنا نہ سر

سے کھیلنا۔ ہم دونوں واپس آ گئے۔ میں نے انہیں گھر پہنچا دیا۔ لاہور کی سیر ختم ہو گئی۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے، ''ایک کام آ پڑا ہے۔ تم کر سکتے ہو میں کسی اور سے نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے کہا، ''فرمایئے! کیا حکم ہے۔'' بولے، ''ایک بیٹا اور ایک بیٹی بچے ہیں۔ بیٹی حیوانیات میں ایم ایس سی کرنا چاہتی ہے۔ سیکنڈ کلاس ہے وہ بھی معمولی۔ سنا ہے یونیورسٹی میں سیکنڈ کلاس کا گزر نہیں۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ بیٹی کی زندگی بن جائے گی۔'' میں نے کہا، ''کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔''

دوسرے دن میں حیوانیات کے شعبے میں گیا۔ صدر شعبہ نہایت سخت۔ جو صاحب داخلوں کے کرتا دھرتا تھے اُن سے ملا انہوں نے کہا، ''اسلم بھائی! آپ ادھر کہاں؟'' میں نے کہا، ''ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں جو آپ حل کر سکتے ہیں۔'' پھر میں نے انہیں پورا قصّہ سنایا۔ بولے، ''تھوڑی سی بے ایمانی کرنا پڑے گی۔ مگر میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔ دو تین دن بعد اطلاع دوں گا۔''

دو تین دن کے بعد اُن کا فون آیا کہ ''زحمت نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لیے یہاں آ جائیں۔'' میں فوراً دوڑ گیا۔ انہوں نے کہا، ''یہ داخلے کا فارم ہے۔ دستخط ہو گئے ہیں۔'' میں نے پوچھا، ''کیسے ہوئے؟'' بولے، ''اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر۔ فارموں کے گڈّے میں یہ فارم بھی شامل کر دیا۔ دست خط کرواتا رہا۔ اس پر بھی دست خط ہو گئے۔ ایک بج رہا ہے۔ اب آپ خود بینک چلے جایئے۔ منیجر آپ کا دوست ہے فیس جمع کرا دیجئے۔ صبح سے طلبہ کا ہجوم رہتا ہے۔ بڑی گڑبڑ ہوتی ہے۔'' میں شکریہ ادا کر کے بینک گیا۔ منیجر سے بات کی۔ فیس جمع ہو گئی کام ختم ہو گیا، داخلہ کرانے والے صاحب نے یہ ہدایت کی تھی کہ بیٹی سے کہہ دیجئے کہ خاموش رہے۔ یہ نہ بتائے کہ داخلہ کیسے ہوا۔ کُریدنے والے کُریدیں گے مگر منہ سے بھاپ بھی نہیں نکلنا چاہیے۔ میں نے دوسرے دن رسید کاظمی صاحب کے حوالے کی اور کہہ دیا کہ بیٹی کو اچھی طرح سمجھا دیں، خاموش رہے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کاظمی صاحب نے یہ بات سُن کر میری طرف دیکھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے اُداس اور خاموش نظروں سے شکریے کا حق ادا کر رہے ہیں۔

اس موقعے پر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کل جب مجھ سے یہ سوال ہو گا کہ تم نے یہ حرکت

کیوں کہ تو میں جوشؔ صاحب کی طرح "اُس" کے عتاب کو ہنسانے والا رحمت کا قصیدہ نہیں پڑھ سکوں گا۔ اور نہ فیضؔ صاحب کی طرح یہ کہہ سکتا ہوں کہ "سب داغ میں اس دل میں بجز داغ ندامت۔" 'داغ ندامت' تو ہے لیکن اس ندامت پر آنکھیں نم ناک نہیں اور پھر وہی مرزا غالبؔ کا بیان کہ "آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں۔"

کبھی کبھی خلاف معمول مسکرا کر بات کر لیتے مگر یہ مسکراہٹ پھیکی اور نیم دلانہ ہوتی تھی۔ ایک دن میں گیا۔ تو کہنے لگے، "ڈاکٹر! تمہارے والد تو بڑے زبردست آدمی ہیں۔" میں نے کہا، "آپ میرے والد کو کیا جانیں۔" بولے، "اردو اکیڈمی والے علاالدین خالدؔ نے ملاقات کرائی تھی۔ بھائی! وہ تو شعروں کی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ہمارے بچپن اور لڑکپن میں ہمارے شہر سنبھل ضلع مراد آباد میں بعض بوڑھے ایسے تھے جو بات بات پر شعر پڑھتے ہر بات کا جواب موزوں اور برمحل اشعار میں دیتے تھے تمہارے والد سے مل کر مجھے وہ سارے بزرگ یاد آئے۔ تمہارے والد انہی لوگوں کی طرح برجستہ شعر پڑھتے ہیں۔ شعر تمہیں بھی بہت یاد ہیں۔ مگر تمہارے والد کی بات کچھ اور ہی ہے۔ اُن کے بارے میں 'قومی زبان' کے لیے ایک مضمون لکھ دو تاکہ نئی نسل کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو گزر گئے اُن کی زندگی میں شعر و شاعری کی کیا اہمیت تھی اور برمحل اشعار کیسے پڑھے جاتے تھے۔" میں نے کہا، "میں آپ اپنے منھ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔ ویسے میں والد کے سامنے کبھی کوئی شعر نہیں پڑھتا ہوں۔ میں ایک شعر پڑھوں تو وہ جواب میں دس شعر سنا دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس موضوع کے دو چار فارسی شعر بھی سُن لو۔ سو اشعار کی ایک نظم جو کائستھو کی ایک برات سے متعلق تھی اُنہیں یاد تھی۔

للّا طول عمرہ، بنے ہیں جو نوشا + حقیقت کرت ہوں براتن کی انشا

چلی زرد بھتیا سے سوئے مہوبا"

یہ اشعار سُن کر انہوں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی اور پھر وہ اپنے خیالوں میں ڈوب گئے۔

رفتہ رفتہ کاظمی صاحب انجمن کے رسالے "قومی زبان" پر توجہ دینے لگے۔ کتابوں کی اشاعت کا کام دیکھنے لگے "رسالہ اردو" پر بھی اُن کا نام آنے لگا۔ مگر دل کی کلی کھلی نہیں۔ آنے

جانے والے بھی آنے لگے۔ طالبِ علم آتے تو وہ اُن کی رہنمائی کرتے۔ میرے بڑے بیٹے آصف فرخی اُن دنوں میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ ادب کا ذوق موروثی ہے۔ لکھنے لکھانے کا بھی شوق ہے۔ انگریزی اور اردو دونوں میں لکھتے ہیں۔ یہ ان کے لکھنے کا ابتدائی دور تھا۔ ادبی ذوق کی وجہ سے انجمن بھی جاتے تھے۔ میڈیکل کالج اور انجمن کے دفاتر بہت قریب تھے۔ آصف کتابوں کی تلاش میں انجمن کے کتب خانہ عام جاتے رہتے تھے۔ اس کے رُکن بھی تھے۔ انجمن آنے جانے میں کاظمی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بزرگانہ شفقت سے پیش آئے۔ آصف اُن کے بڑے مداح تھے۔ اکثر کہتے ہیں کہ کاظمی صاحب اکثر پوچھتے رہتے تھے کہ کیا لکھ رہے ہو۔ پھر نرمی سے کہتے۔ میڈیکل کی پڑھائی بہت سخت ہوتی ہے۔ لکھنے لکھانے کی دُھن میں اُس سے غافل نہ ہونا۔ ایک دفعہ آصف کو انجمن کی ڈکشنری کی ضرورت پیش آئی۔ خریدنا چاہی تو معلوم ہوا کہ اسٹاک میں نہیں ہے۔ کاظمی صاحب سے ذکر آیا تو انہوں نے الماری سے اپنا ذاتی نسخہ نکالا۔ اس پر اُن کے دست خط تھے۔ آصف کے حوالے کر دیا۔ یہ نسخہ اب بھی آصف کے پاس محفوظ ہے۔

کاظمی صاحب کے خصوصی ملنے جلنے والوں میں مشفق خواجہ تھے جو اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی شوخ فقرہ بھی کہتے مگر کاظمی صاحب خاموش رہتے۔ پروفیسر ذوالفقار مصطفی اکثر جاتے رہتے تھے اور بہت سے آنے جانے والے تھے۔ کاظمی صاحب سب سے دل سے ملتے تھے لیکن اُداسی بہر حال قائم رہتی تھی۔

ایک دفعہ عالی صاحب نے باہر سے آئے ہوئے کچھ ادیبوں اور شاعروں کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔ کاظمی صاحب اور اُن کی بیگم بھی مدعو تھیں۔ میرا اور میری بیگم کا بھی بُلایا گیا تھا۔ کاظمی صاحب نے مجھ سے کہا، ”تم ہم لوگوں کو ساتھ لے چلو گے؟“ بے تکلفی کی برف اس حد تک پگھل چکی تھی کہ وہ مجھ سے 'تم' کر کے بات کرتے تھے۔ میں نے کہا، ”ضرور لے چلوں گا لیکن کرایہ پیشگی ادا کرنا پڑے گا۔“ یہ جملہ سُن کر اُن کے چہرے پر ایک مضمحل مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

ہم لوگ عالیؔ صاحب کے یہاں گئے۔ بڑی سُتھری محفل تھی۔ کھانا ہو چکا تو اچانک کاظمی

صاحب گھبرا کر اُٹھے اور چلے گئے۔ پھر گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور بولے، "آپ میرے لیے ایک ٹیکسی منگوا سکتے ہیں۔ میری بیوی کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے۔" میں نے کہا، "کھانا ہو چکا ہے۔ میں عالی صاحب سے اجازت لیے لیتا ہوں۔ آپ دونوں کو گھر پہنچا دوں گا۔" عالی صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا، "ضرور چلے جاؤ۔ گاڑی ہے تمہارے پاس یا میں ڈرائیور بُلواؤں۔" میں نے کہا، "گاڑی موجود ہے۔" بیگم کاظمی آگئیں۔ میں نے دیکھا کہ اُن کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ یہ محسوس ہوا کہ کوئی دورہ پڑا ہے۔ ہم چاروں گاڑی میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ راستے میں دو تین مرتبہ "مسز عالم۔ مسز عالم" کی آواز تو کان میں آئی اس کے علاوہ اور کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کاظمی صاحب گُم سُم اور مسز کاظمی اندوہ گیں۔ خدا خدا کر کے کاظمی صاحب کے گھر پہنچے۔ دونوں میاں بیوی اُتر گئے۔ میں نے کاظمی صاحب سے کہا، "ڈاکٹر کے یہاں جانے کا خیال ہو تو میں لے چلوں، یا کسی دوا کی ضرورت ہو تو لا دوں۔" انہوں نے کہا، "نہیں دوا کی ضرورت نہیں۔" میں اور میری بیوی گھر واپس آگئے مگر رات بھر ایک خلش رہی کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ مسز کاظمی بھری محفل میں آنسوؤں سے رونے لگیں۔

یہ معمّہ دوسرے دن حل ہوا۔ تاج بیگم شارع لیاقت کے زنانہ کالج میں پڑھاتی تھیں۔ وہیں ایک بنگالی خاتون مسز عالم بھی انگریزی پڑھاتی تھیں۔ اُن کے شوہر عالم صاحب حکومت پاکستان کے بڑے افسر تھے۔ دونوں میاں بیوی سقوط ڈھاکا کے بعد بھی پاکستان ہی میں رہے (بعد میں بنگلہ دیش چلے گئے تھے) مسز عالم نے تاج سے کہا، "رات مجھے بڑا افسوس ہوا۔ مسز کاظمی کی طرح مجھے بھی رونا آیا مگر میں نے ضبط کیا۔ اب تم پوری بات سُنو۔

"میری شادی" ہوئی تو عالم صاحب راج شاہی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ شادی کے بعد راج شاہی جانے کا پروگرام بنا تو میں نے کہا، وہاں نہ مکان ہے، نہ رہنے کا ٹھکانا۔ کیا ہو گا؟ عالم صاحب نے کہا گھبراؤ نہیں۔ میں نے کاظمی صاحب کو لکھ دیا ہے۔ سارا انتظام ہو جائے گا۔ ہم راج شاہی پہنچے تو کاظمی صاحب اور مسز کاظمی نے خیر مقدم کیا۔ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ مسز کاظمی نے مجھے پیار کیا اور کاظمی صاحب سے کہا، بیٹی آئی ہے اپنے میکے آئی ہے۔ مجھے سرخ دوپٹہ اڑھایا۔ جوڑا دیا۔ کہنے لگیں، تم میری دین دنیا کی بیٹی ہو۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ اطمینان سے رہو۔ ہم اعتماد سے

رہنے لگے۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ دونوں میاں بیوی کیسی شفقت برتتے تھے۔ سگی بیٹیوں سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ پھر عالم صاحب کو یونیورسٹی کا ایک مکان الاٹ ہو گیا مگر مسز کاظمی نے مجھے جانے نہیں دیا۔ آخر کار یونیورسٹی کی طرف سے نوٹس آیا کہ اگر آپ کو مکان کی ضرورت نہیں ہے تو الاٹ منٹ واپس کر دیں۔ میں نے اور عالم صاحب نے مسز کاظمی کی بڑی خوشامد کی کہ اب ہمیں جانے دیں۔ اُنہوں نے کہا کہ اس شرط پر جاسکتی ہو کہ ہفتے میں دو دن شام کا کھانا یہاں کھاؤ گی اور تیج تہوار کا دن یہاں گزارو گی۔ چنانچہ اس شرط کے بعد ہم اپنے مکان میں منتقل ہو گئے۔ دو دن کا کھانا جاری رہا اور روزانہ کوئی نہ کوئی چیز آتی رہی۔ یہ پکوایا تھا جی چاہا کہ تم بھی کھالو۔ ایک جگہ سے انگور آئے تھے یہاں بڑے نایاب ہیں تمہارا حصہ بھیج رہی ہوں۔ ماں بیٹی کا رشتہ پوری محبت اور خلوص سے قائم رہا۔

"گئی یک بیک جو ہَوا پلٹ۔" ہَوا تو بہت دن سے پلٹ رہی تھی لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں تھا۔ انسانی رشتوں میں دراڑیں پڑنا شروع ہوئیں اور ایسی پڑیں کہ رشتے مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ ہم اپنی بہترین کوششوں کے باوجود کاظمی صاحب کے خاندان کو بچا نہیں سکے۔ لوگوں کے خون سفید ہو گئے۔ کاظمی صاحب کا سارا خاندان اُن کی آنکھوں کے سامنے سیاسی نفرت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بمشکل انہیں اُن کی بیوی اور ایک لڑکی اور ایک بیٹے بچ گئے۔ بیٹی اور بیٹے یوں بچ گئے کہ دونوں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے نکال کر کراچی بھیج دیا گیا۔ مجھے کراچی میں کاظمی صاحب اور اُن کی بیگم سے ملنے اور سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی کس منہ سے سامنا کروں۔ کیا کہوں کہ میں نے اپنے بہن بھائیوں کو خود قتل کیا ہے۔ کل رات دعوت میں اچانک نظر پڑی تو میں اُن کی طرف بڑھی لیکن مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، دورہ سا پڑ گیا___ شاید میں کبھی اُن کا سامنا نہ کر سکوں۔"

میری بیوی نے گھر آ کر مجھے ساری داستان سنائی۔ اس داستان کے بعد میں جب بھی کاظمی صاحب کے پاس جاتا تو مجھے اُنہیں دیکھ کر انتہائی ہولناک انسانی دُکھ کا احساس ہوتا۔ دل ہی دل میں غالب کو یاد کرتا۔ "میری قسمت میں غم گر اتنے تھے" پڑھتا رہا۔

مشرقی پاکستان میں کاظمی صاحب نے بڑا قابل قدر علمی کام کیا تھا۔ اردو اور بنگلہ کے

مشترک الفاظ پر اُن کی کتاب انجمن نے شایع کی تھیں اور اس کتاب پر گلڈ کی جانب سے انعامات بھی عطا ہوئے تھے۔ مگر اب ان کتابوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اب کوئی جانتا بھی نہیں کہ لسانیات کے حوالے سے اس موضوع پر ایک سر پھرے محنتی عالم نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے کیسا قابلِ قدر کام کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ اب ہمیں ایسے کسی کام کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کشاکش غم پنہاں سے فرصت کسے۔ جب اشتراک و اتحاد ہی نہیں رہا۔ انسان بدل گئے، محبت کی جگہ نفرت کا دور دورہ ہو گیا تو لسانی اشتراک کو کون پوچھتا ہے۔ ساری محنت ضایع ہو گئی۔ "نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو۔" ان کی چند کتابوں کے نام جو یادداشت میں محفوظ رہ گئے ہیں، لکھے دیتا ہوں کہ "سند رہیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔"

اردو کے مختلف نام

پراچین اردو

چند تعلیمی تصورات

عوامی اردو روز مرہ محاورات

اردو بنگلہ مشترک الفاظ

ممکن ہے کوئی اور کتاب بھی ہو لیکن میرے حافظے میں محفوظ نہیں ہے۔

کاظمی صاحب چار و ناچار انجمن میں اپنے آپ کو گھسیٹتے رہے۔ زیادہ مضمحل ہوتے، زیادہ بیمار ہوتے تو دفتر نہیں آتے تھے۔ اکیس جنوری ۸۵ء کی شام کو وہ کسی کام سے صدر گئے۔ اچھلے بھلے گھر واپس آئے۔ پروفیسر ذوالفقار مصطفی نے انہیں گھر چھوڑا اور اپنے گھر چلے گئے۔ صبح مشفق خواجہ نے انہیں فون کیا کہ بھائی! شام کو آپ نے انہیں گھر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ دنیا چھوڑ گئے، چپ چاپ چلے گئے۔ "اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر۔"

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزرا

سانحے اور قتل و غارت کی وارداتیں تو بہت پیش آتی رہتی ہیں لیکن بیسویں صدی میں ایک شاعر اور ایک ادیب کے ساتھ جو خوں چکاں سانحہ پیش آیا اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ سوچیے تو دل دہل جاتا ہے۔ پہلا سانحہ بہار کے شاعر شیریں نوا کلیم عاجزؔ کو ہمیشہ کے لیے سوگوار کر گیا۔ بہار کے ہندو مسلم فساد نے اُن کے سارے خاندان کو اُن کے سامنے قتل کر دیا۔ عاجزؔ تو بیچارے عاجز تھے۔ انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ اردو شاعری کو یہ کہہ کر خوں چکاں کر گئے۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

کاظمی صاحب شاعر نہیں تھے۔ انہوں نے ذاتی سانحے کو شعر کے قالب میں نہیں ڈھالا۔ ستم اس طرح گوارا کیا کہ اپنے آپ میں گم ہو گئے۔ مگر

ع جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اردو ادب کی تاریخ میں آستین کے اس لہو کی پکار اور اوراق پارینہ پر اس کے چھینٹے ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔

مہادیو

یہ تذکرہ ہے ۱۹۵۶ء کا جب کراچی مرکزی حکومت کا پایۂ تخت تھا۔ مرکزی حکومت نے اپنی تعلیمی ذمّہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے ناظم آباد میں "سنٹرل گورمنٹ کالج فار مین" قائم کرنے کا اہتمام کیا۔ کالج کی عمارت کے لیے ٹریننگ کالج کا ایک حصہ حاصل کیا گیا۔ اساتذہ کے لیے پبلک سروس کمیشن کے توسط سے اشتہار شائع کیا گیا۔ اشتہار میں یہ وضاحت بھی تھی کہ لائق اور تجربہ کار اساتذہ کو اضافی ترقیاں بھی ملیں گی۔ دفتر قائم ہو گیا۔ شارع لیاقت کے زنانہ کالج سے سائنس کے ایک استاد کو افسر انچارج کی حیثیت سے بلایا گیا۔ داخلے ہونے لگے۔

کمیشن نے ڈھاکے اور کراچی میں امیدواروں کے انٹرویوز کیے اور تجربہ کار اساتذہ کے لیے اضافی ترقیوں کی سفارش کے ساتھ وزارت تعلیمات کو ارسال کر دیے۔ وزارت تعلیمات نے تقرر نامے جاری کر دیے اور مشرقی پاکستان سے منتخب ہونے والے تمام اساتذہ رجوع بکار ہو گئے۔ مغربی پاکستان سے کوئی نہیں آیا۔ سب نے انکار لکھ بھیجا کیونکہ کمیشن کی منظور کردہ اضافی ترقیاں کسی کو نہیں دی گئیں۔ وزارت کے ایک انڈر سیکریٹری نے یہ سوچا کہ اگر اضافی ترقیاں دی گئیں تو مغربی پاکستان کے اساتذہ سینئر ہو جائیں گے لہٰذا اس مسئلے کو گول کر دیا جائے۔

پڑھائی شروع ہو گئی لیکن بہت سے شعبوں میں اساتذہ نہیں تھے۔ طلبہ نے کچھ دن تو صبر اور برداشت سے کام لیا پھر اُن کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ایک دن سارے طلبہ جلوس کی شکل میں نعرے لگاتے مسجدِ خضرا کے پاس وزارتِ تعلیمات پہنچ گئے اور پوری قوت سے نعرے لگانے لگے۔

یہ آج کل کا زمانہ نہیں تھا۔ طلبہ کے نعروں کی آواز سُن کر مشیر تعلیم خود اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔ وہ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ طلبہ کے پاس گئے۔ اُن سے

پوچھا، "کیا مسئلہ ہے؟ نعرے کیوں لگ رہے ہیں؟" لڑکوں نے صورت حال بیان کی۔ مشیر تعلیم نے پہلے تو سب کو ٹھنڈا پانی پلوایا پھر متعلقہ فائلیں منگوائیں اور سب کا بغور مطالعہ کیا۔ مطالعہ کے بعد وہ بے حد برہم ہوئے۔ دفتر کے افسروں سے کہا، "اسی وقت اضافی ترقیاں پانے والوں کو تار سے اطلاع دیجئے کہ وہ فوراً رجوع بکار ہو جائیں، دیر نہ کریں۔" لڑکوں سے کہا، "نعرے لگانا اچھی بات نہیں ہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ ہو تو میرے پاس آجائیے۔" لڑکوں نے اس کے جواب میں خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور واپس آگئے۔

کچھ دن کے بعد مغربی پاکستان سے منتخب ہونے والے سارے اساتذہ آپہنچے اور کالج میں پورے زور و شور سے پڑھائی ہونے لگی۔

کالج میں ایک بات جو حیرت انگیز تھی، وہ مشرق و مغرب کا اتحاد اور ملاپ تھی۔ جلد ہی مشرق و مغرب کے اساتذہ ایک دوسرے سے شیر و شکر ہو گئے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ الگ الگ خطوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشرق سے عبدالباطن جنہیں اساتذہ اور طلبہ سب عبدالباٹنی کہتے تھے، ریاضیات کے مجیب الرحمان جو مجیب الرحمن کہنے سے بگڑ جاتے تھے اور کہتے تھے، "میرا نام 'مزیب الرحمن' ہے۔" خوش رو، خوش لباس، خوش گفتار، انیس الرحمن۔ بنگالی کا استاد علی نواز جو اپنے خیالات میں گم اسٹاف روم میں بیٹھا نظمیں لکھتا رہتا تھا۔ اردو کے ڈاکٹر عبدالسلام۔ تاریخ کے ڈاکٹر رؤف۔ نفسیات کی ڈاکٹر جمیلہ خاتون۔ انگریزی نے مسیح الدین صدیقی سب ایک خاندان اور ایک گھرانا معلوم ہوتا تھا۔ بڑا اچھا ماحول تھا۔

اچانک ایک دن علی نواز نے اعلان کیا کہ انہیں جہانگیر نگر یونیورسٹی میں جگہ مل گئی ہے اور وہ یہاں سے جارہے ہیں۔ دو تین دن کے اندر اندر علی نواز چلے گئے۔ بنگالی نظموں کی خوش گوار یادیں چھوڑ گئے۔

بنگالی کے طالبِ علم کچھ دن تو چپکے رہے پھر انہوں نے غُل مچانا شروع کیا اور پھر ایک دن اسٹاف روم میں ایک صاحب نمودار ہوئے۔ قد کے چھوٹے، رنگ کے سانولے، سر بڑا، دُبلا جسم، چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں۔ اُچھلتے کودتے آئے۔ بہ آواز بلند اعلان کیا: "میں۔ میں پروفیسر عبدالغفور۔ ایم اے بنگلہ۔ ایم اے ہسٹری۔" پھر جتنے اساتذہ بیٹھے ہوئے تھے سب سے اُچھل

اُچھل کر ہاتھ ملایا۔ معانقے کی کوشش ناکام رہی کیونکہ جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے اُن میں کوئی بھی انہیں دیکھ کر کھڑا نہیں ہوا سب نے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ اسلامیات کے مولانا نے کچھ زیادہ تپاک کا مظاہرہ کیا لہٰذا پروفیسر عبدالغفور اُن کی سرپرستی میں آ گئے۔ میں چونکہ مولانا کے پاس ہی بیٹھا تھا لہٰذا انہوں نے مجھے بھی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ بے تکلفی سے باتیں ہونے لگیں۔ ایک دن میں نے پوچھا، "یہاں آنے سے پہلے تم کس کالج میں پڑھاتے تھے؟" بولے، "میں کسی کالج میں نہیں پڑھاتا تھا۔ میں تو سکھر میں رائس انسپکٹر تھا۔ اخبار میں اشتہار دیکھا تو درخواست دے دی۔ لے لیا گیا۔" مولانا نے پوچھا، "رائس انسپکٹر تھے پھر تو خوب ہاتھ مارتے ہو گے۔" کچھ شرمائے پھر کہنے لگے، "ہاں پیسہ تو خوب ملتا تھا مگر میں نے سارا پیسہ جمع کر کے مکان بنوا لیا۔ اب مزے سے اپنے گھر میں رہتا ہوں اور سرکار سے کرایہ وصول کرتا ہوں۔" مولانا نے ڈانٹا، "تم رشوت لیتے تھے خبردار اب رشوت نہ لینا ورنہ ہم لوگ تم سے ملنا جلنا چھوڑ دیں گے۔"

ان دنوں مشرقی پاکستان میں بننے والی اردو فلمیں بہت مقبول تھیں۔ ان فلموں میں ایک مزاحیہ کردار تھا سُبھاش دتا۔ اُچھلتا، کودتا رہتا، چھوٹا سا قد تھا۔ پروفیسر عبدالغفور کو چند ہی دن میں اساتذہ اور طلبہ سبھی "سُبھاش دتا" کہنے لگے۔ حیرت کی یہ بات تھی کہ بنگالی بھی اُنہیں سُبھاش دتا ہی کہتے تھے۔

ایک دن اسٹاف روم میں اساتذہ کی ایک میٹنگ ہوئی اور یہ غور کیا گیا کہ فلمی نام ایک استاد اور ہم سب لوگوں کے لیے باعثِ توہین ہے۔ انہیں کوئی اور لقب دیا جائے۔ کسی نے کہا، "گرودیو کہو۔" مگر اعتراض ہوا کہ گرودیو ٹیگور کا لقب ہے۔ کہاں ٹیگور اور کہاں پروفیسر عبدالغفور۔ آخر بڑے غور کے بعد یہ طے ہوا کہ پروفیسر عبدالغفور کو "مہادیو" کے لقب سے پکارا جائے۔ یہ لقب فوری طور پر مقبول ہو گیا۔ سارے اساتذہ اور طلبہ پروفیسر عبدالغفور کو "مہادیو" کہنے لگے۔ وہ خود بھی اپنے اس لقب سے بہت خوش ہوئے اور اپنے آپ کو مہادیو کہنے لگے۔

قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ مہادیو ہم لوگوں کے علاوہ کسی کی چائے نہیں پیتے تھے۔ کوئی اُستاد چائے کے لیے پوچھتا تو انکار کر دیتے تھے مگر ہم لوگوں کی چائے پی لیتے تھے۔ کسی اور کی چائے نہ پیتے، نہ کسی کو چائے پلاتے۔

دوپہر کو جب چھٹی ہو جاتی تو مہادیو اپنا تھیلا کھولتے۔ پیتل کی ایک چماچم تھالی نکالتے ایک پوٹلی نکالتے، کھولتے۔ اُس میں سے پلیٹ میں دال پڑے ہوئے چاول پلیٹ میں اُلٹتے اور سُڑ پے لگاتے مزے سے کھالیتے۔ دال بھات کھانے کے بعد پلیٹ دُھلواتے۔ پوٹلی کا کپڑا اور پلیٹ تھیلے میں رکھ دیتے۔ ایک گلاس پانی ڈگ ڈگا کر پیتے اور پنکھے کی ہوا میں بیٹھے رہتے۔

ایک دن میں نے مولانا کی موجودگی میں اُن سے پوچھا کہ "تم دوسروں کی چائے نہیں پیتے۔ نہ کسی کو چائے پلاتے ہو۔ ہماری چائے پی لیتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟" مہادیو نے بڑی عاجزی سے کہا، تنخواہ میں پورا نہیں پڑتا۔ بیوی ہر وقت کُڑکڑاتی رہتی ہے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اب گھر میں دوسروں کی چائے پینے لگوں تو پھر انہیں خود بھی چائے پلاؤں۔ سو میں یہ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا، "اور ہماری چائے جو پیتے ہو۔" مہادیو نے اور زیادہ انکسار سے کہا، "آپ دونوں تو میرے اپنے ہیں۔" یہ سُن کر ہم دونوں مہادیو کی خودداری اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔

اگرچہ سارے اساتذہ اور بالخصوص نوجوان اساتذہ مہادیو سے بڑا لطف لیتے تھے لیکن مہادیو مجھے اور مولانا کو اپنا حقیقی سرپرست سمجھتے تھے۔ بہر حال وہ کالج میں جم گئے اور اُن کے گرد نوجوان اساتذہ کا جماؤ بھی رہنے لگا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ نوجوان اساتذہ حلقہ بنائے بیٹھے ہیں اور مہادیو انہیں کچھ پڑھا رہے ہیں۔ مہادیو سے پوچھا تو وہ خاموش رہے۔

کچھ دن کے بعد باطن نے جو ان دنوں کالج کے پرنسپل تھے، مجھ سے کہا، "اسلم! یہ تم لوگ بنگلہ Slang کیسے سیکھ گئے؟" میں نے کہا، "مجھے تو بنگلہ سلینگ کا کوئی علم نہیں۔" تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بعض نوجوان اساتذہ نے مہادیو سے بنگلہ بھاشا پڑھنا شروع کی۔ ابتدا اعضائے انسانی کے ناموں سے ہوئی۔ جب سر کا لفظ آیا تو بالوں کا لفظ آنا ضروری تھا۔ کسی استاد نے پوچھا، "بال کو کیا کہتے ہیں۔ مہادیو نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ نانا۔ نا۔ بال بہت بُرا لفظ ہے۔ چول کہنا چاہیے۔ مولانا جو بنگالی میں خاصی مدت گزار چکے تھے۔ فوراً بولے، "بنگالی میں بال موئے زہار کو کہتے ہیں۔" کہنے کو تو مولانا نے یہ الفاظ کہہ دیے مگر وہ خاصے شرمندہ ہوئے۔ اس کے بعد میں نے مہادیو کو سمجھایا کہ تم بنگلہ پڑھاتے رہو لیکن بنگلہ سلینگ نہ سکھاؤ۔ مہادیو نے فوراً وعدہ کیا مگر

یہ سارا سلسلہ جو مذاق کے طور پر شروع ہوا تھا ختم ہو گیا اور مہادیو نے اپنی گفتگو میں محتاط رویہ اختیار کر لیا۔

مہادیو ٹھیک صبح نو بجے کالج آجاتے تھے۔ بیٹھے رہتے۔ سب رخصت ہو جاتے ہم لوگ بھی چلے جاتے مگر مہادیو بیٹھے رہتے۔ جب چوکیدار اسٹاف روم بند کرنے آتا اُس وقت اُٹھتے اور گھر جاتے۔ جب میں نے پوچھا کہ تم اتنی دیر تک کیوں بیٹھے رہتے ہو۔ اسٹاف روم خالی سب جا چکے مگر تم بیٹھے ہو، آخر بات کیا ہے تو مہادیو نے بڑی لجاجت سے کہا، "یہاں پنکھا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی پنکھا نہیں ہے۔ اس لیے یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔" میں نے کہا، "اور گھر والے؟" تو مہادیو بولے، "گرمی برداشت کرتے ہیں۔ بیوی ہر وقت چیختی چلاتی رہتی ہے۔ پنکھا لگواؤ، پنکھا لگواؤ۔ مگر کہاں سے لگواؤں۔ تنخواہ کم خرچ زیادہ جو کچھ جمع جتھا تھی مکان بنوانے میں خرچ ہو گئی، کیا کروں۔" مجھے مہادیو کی یہ بات سن کر بڑا افسوس ہوا کیونکہ یہ کیفیت خود مجھ پر بھی گزر چکی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں پاکستان چوک کے جس فلیٹ میں برسوں رہا تھا اس میں پنکھا نہیں تھا۔ دن بھر باہر گزارتا۔ شام کو کھانا کھا کر پاکستان چوک کے راؤنڈ اباؤٹ پر بچھی ہوئی بینچوں میں سے کسی پر بیٹھا رہتا۔ جب رات زیادہ گزر جاتی اور نیند کا غلبہ ہوتا تو اس شرق رویہ فلیٹ میں جہاں ہوا کا گزر نہیں تھا لوٹ آتا اور کروٹیں بدلتا رہتا۔

مہادیو کی یہ بات سن کر میں اور مولانا بہت متاثر ہوئے اور ہم نے یہ طے کیا کہ مہادیو کے یہاں ایک پنکھا لگوا دینا چاہیے۔ چنانچہ پروگرام بن گیا۔ لیاقت آباد میں بجلی کے سامان کی ایک بڑی دکان کا مالک میرے دیار سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے دن مولانا اُدھر سائیکل پر روانہ ہوئے اور ادھر میں سلیمان چپراسی کو ساتھ لے کر بس میں وہاں گیا۔ سلیمان ریٹائرڈ فوجی تھا۔ بڑا ہوشیار، کالج کے ہر اُستاد کا گھر جانتا تھا۔ ہم دونوں جب وہاں پہنچے تو مولانا دکان کے سامنے کھڑے تھے، اندر گئے۔ دکان کے مالک احسان مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ "آؤ، آؤ۔ اسلم بھائی کیسے بھول پڑے۔ تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو۔" میں نے مولانا کا تعارف کرایا اور کہا کہ "ہم ایک مضبوط پنکھا خریدنا چاہتے ہیں۔" احسان نے کہا، "اسلم بھائی۔ خیر تو ہے، تمہارے گھر میں تو ہر طرف پنکھے ہیں۔" احسان کی اس بات پر میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا اور کہا "ہم اپنے دوست کے یہاں پنکھا

لگوانا چاہتے ہیں تا کہ ان کی تکلیف کم ہو۔" احسان یہ سُن کر بہت خوش ہوئے فوراً ملازم کو آواز دی۔ ایک پنکھا نکلوایا، ٹیسٹ کروایا اور اُس ملازم سے کہا کہ دکان کے ٹھیلے پر لے جاؤ۔ یہ آدمی (سلیمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تمھیں جگہ پر لے جائے گا۔ پنکھا لگا دینا۔ ٹیسٹ کر لینا اور واپس آجانا۔ پنکھا ادھر روانہ ہوا اور ہم لوگ بھی چائے بسکٹ سے فارغ ہو کر گھر چلے گئے۔

دوسرے دن جب ہم کالج پہنچے تو مہادیو اسٹاف روم میں موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر ایک قلانچ بھری۔ ہماری طرف پہنچ کر پہلے مجھ سے پھر مولانا سے معانقہ کیا۔ ہم دونوں نے ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو محسوس کیے۔ آواز رندھی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے کہنے لگے، "کل دوپہر جو گھر پہنچا تو دیکھا بیوی بچے سن سن کرتے ہوئے پنکھے کی ہوا میں آرام سے لیٹے ہوئے میری راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، "یہ کیسے لگا؟" بیوی نے کہا، "سلیمان آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اسلم صاحب اور مولانا نے پنکھا بھجوایا ہے۔ دکاندار سے بات کر کے آدمی بھی بھیجا کہ پنکھا لگا دے۔ اُس نے پہلے چھت میں کنڈا لگایا پھر پنکھا لگایا۔ چلا کر دکھایا اور چلا گیا۔ اب ہم لوگ پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لیٹے ہوئے ہیں۔" مہادیو مُستقل میرے اور مولانا کے ہاتھ چومتے رہے۔ بڑی مشکل سے ہم نے انہیں روکا۔ سلیمان نے یہ غضب کیا کہ کالج میں سب سے پھونک دیا کہ اسلم صاحب اور مولانا نے مہادیو کے گھر پنکھا لگوایا ہے۔ بعض اساتذہ نے ہم سے پوچھا مگر ہم نے ٹال دیا۔

جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے تو اُچک چال سوجھتی ہے۔ پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں مہا دیو کو بھی اُچک چال سوجھی۔ ایک دن انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم لوگوں کو کبھی کبھی سینما دیکھنا چاہیے۔ ریلیکس سینما کالج کے قریب ہے وہاں اچھی اچھی فلمیں چلتی ہیں۔ ہم لوگ ساڑھے تین بجے والے شو میں آسانی سے جاسکتے ہیں۔ میں نے مہادیو کی اس تجویز کی مخالفت کی۔ میں نے کہا، "ریلیکس سینما میں کالج کے دادا ہر وقت ٹہلتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر کیا کہیں گے۔" مولانا نے سینہ پُھلا کر کہا، "کیوں؟ کیا ہم سینما نہیں دیکھ سکتے؟ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟" یہ صورتِ حال دیکھ کر مولانا بولے، "مہادیو! اسلم صاحب جائیں یا نہ جائیں۔ میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا۔" آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ ہم تینوں پکچر دیکھنے ریلیکس سینما جائیں گے اور ایک سہ پہر ہم وہاں

پہنچ گئے۔ کالج کے بعض دادا جو وہاں ٹہل رہے تھے ہمیں کنکھیوں سے دیکھتے رہے۔ بعض مولانا کو دیکھ کر مسکرائے مگر ہم لوگوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ دوسرے دن شہنشاہ حسین اور امداد جو کالج کے طالب رہ نما سمجھے جاتے تھے ہمارے پاس آئے۔ دونوں نے بڑی شائستگی سے کہا، ''سر! جب بھی پکچر دیکھنا ہو تو ہمیں اطلاع دے دیجئے۔ ہم پاس بھجوادیں گے۔'' میں نے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا، ''ابھی یہ نوبت نہیں آئی۔'' دونوں میرے بڑے عزیز شاگرد تھے۔

تین چار فلمیں دیکھی گئیں کہ مہادیو یہ خبر لائے کہ ایک بہت عمدہ انگریزی فلم لگی ہے ہمیں یہ فلم ضرور دیکھنا چاہیے۔'' مولانا نے کہا، ''انگریزی فلمیں دیکھنے سے علم بڑھتا ہے اور شعور میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ میں بھی چلوں گا۔''

دوسرے دن ہم تینوں سینما پہنچے۔ وہاں جو طالب علم دادا موجود تھے وہ حیرت سے ہمیں دیکھتے رہے۔ ہم ٹکٹ لے کر آرام سے اندر بیٹھ گئے۔ پکچر شروع ہوئی۔ خاصی بے ہودہ پکچر تھی۔ مہادیو اُچھلتے رہے۔ میں خاموش رہا۔ مولانا دانت پیستے رہے۔ انٹرول ہوا تو مولانا ''ابھی آتا ہوں'' کہہ کر کھسک گئے۔ لوٹ کر نہیں آئے۔ اگلے دن مولانا بڑے لال پیلے ہوئے۔ مہادیو کو بہت برا بھلا کہا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ مجھے اس پکچر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مولانا نے جلال میں آکر یہ کہہ دیا کہ ''اب تمہارے ساتھ جو سینما جائے وہ جہنمی۔'' انہوں نے غصّے کی جھونج میں مہادیو کو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں دیے۔

کچھ دن سر کوہ ندا ایک تعطل رہا۔ پھر نجانے کیسے مہادیو نے مولانا کو رام کرلیا۔ یہ طے ہوا کہ اب ناظم آباد کے کسی سینما میں فلم نہیں دیکھی جائے گی۔ شہر میں ایک سینما تھا جس کا نام ''گوڈین سینما'' تھا وہاں فلمیں دیکھی جانے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

ایک دن میں نے مہادیو سے کہا، ''تم اسٹاف روم میں بیٹھے اُچھلتے رہتے ہو۔ تمہاری انگریزی تحریر بہت اچھی ہے۔ کسی اچھے بنگلہ ناول کا انگریزی میں ترجمہ کیوں نہیں کر ڈالتے۔'' مہادیو نے کہا، ''کون چھاپے گا؟'' میں نے کہا، ''ڈھاکے میں کچھ دوست ہیں اُن کے ذریعے سے کوشش کریں گے۔''

اب مہادیو نے بنگلہ کے مختلف ناولوں کا جائزہ لیا۔ پھر نگاہ انتخاب ایک ناول 'بڑی دیدی'

پر ٹھہری۔ اس ناول پر فلم بھی بن چکی ہے۔ چنانچہ ترجمے پر جٹ گئے۔ اسٹاف روم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی کیونکہ مہادیو کی اُچھل کود ختم ہو گئی تھی مگر ایک دوسری اُچھل کود شروع ہو گئی۔ جسے دیکھا اُسے 'بڑی دیدی' کا انگریزی ترجمہ سنانے لگے۔ سب سے زیادہ کم بختی میری تھی کہ ہر وقت مجھے سامع معتبر بننے کی سعادت حاصل ہوتی تھی۔ مولانا صاف بچ گئے کیونکہ انہوں نے انگریزی صرف میٹرک تک پڑھی تھی۔

ترجمہ بڑھتا رہا۔ پھر ایک دن مہادیو نے یہ مژدہ سنایا کہ ترجمہ مکمل ہو گیا ہے اور انہوں نے اسے ڈھاکے بھیج دیا ہے۔ ہم لوگوں کو فرصت مل گئی۔

غالباً دو برس بعد ایک دن مہادیو شاداں و فرحاں اُچھلتے کودتے اسٹاف روم میں وارد ہوئے۔ باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی ایک کتاب میرے حوالے کی۔ یہ بڑی دیدی کا انگریزی ترجمہ تھا اور کلکتے کے کسی پبلشر نے شائع کیا تھا۔ ترجمے پر پروفیسر عبدالغفور کا نام تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مہادیو کا ترجمہ کلکتے سے کیسے چھپ گیا۔ میں نے بہت پوچھا مگر مہادیو کا یہ حال کہ اپنی کہے جا رہے ہیں کسی اور کی سننے کو تیار نہیں۔ مگر اس ترجمے سے انہیں کوئی یافت نہیں ہوئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ترجمہ ڈھاکے کے کسی پبلشر نے کلکتے بھجوا دیا اور وہاں اس کی اشاعت ہو گئی۔ بہت دن تک مہادیو اسٹاف روم میں ہر آنے جانے والے کو اپنی کتاب دکھاتے رہے۔ پھر ایک اور ناول کا ترجمہ شروع کر دیا مگر اُس کی اشاعت نہیں ہوئی۔ مہادیو بڑے بد دل ہوئے۔

میں نے انہیں یہ سمجھایا کہ اب تم مترجم ہو گئے ہو۔ بنگلہ ادب اور مشرقی پاکستان کے بارے میں کچھ مضامین لکھو اور انہیں اخباروں میں چھپواؤ۔ مہادیو افسردگی کے ساتھ کہنے لگے، "کون چھاپے گا میرے مضمون۔" میں نے کہا، "ایسی بات نہیں 'مورننگ نیوز' سے شروع کرو، بنگالیوں کا اخبار ہے وہ چھاپے گا۔" یہ بات اُن کی سمجھ میں آگئی۔

مہادیو نے بنگالی ادب کے حوالے سے کچھ مضامین لکھ لیے اور مورننگ نیوز کے دفتر پہنچ گئے۔ جھاڑ کا کانٹا ہو گئے وہاں کے لوگوں کے لیے۔ آخر کار ان کا ایک مضمون شائع ہو گیا۔

بڑے خوش ہوئے۔ تین چار مضمون شائع ہو گئے۔ پھر روزنامہ 'ڈان' پر حملہ آور ہوئے۔ وہاں بھی مضمون پہنچائے اور بلاناغہ حاضری دینے لگے۔ کچھ مضمون وہاں بھی چھپ گئے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ چلا نہیں کیونکہ مہادیو انگریزی تو اچھی لکھتے تھے لیکن اُن کے پاس موضوعات اور معلومات کم تھیں۔ بہر حال انہوں نے کالج میں اپنا سکّہ جما لیا اور ہر شخص اُن کے علم اور اُن کی تحریر کا معترف ہو گیا۔ یہ اُن کے لیے بڑا اعزاز تھا مگر نہ مصروفیت تھی نہ یافت کی کوئی صورت۔

جلد ہی مہادیو اپنی پرانی روش پر لوٹ آئے۔ لکھنے پڑھنے کے کام سے پہلے وہ اسٹاف روم میں بیٹھے ہوئے تمام اساتذہ کو سمجھایا کرتے تھے کہ "صبح سویرے جسم پر سرسوں کا تیل ملو۔ پھر ٹھنڈے پانی سے نہاؤ۔ دیکھو تمہارا جسم کیسا چمکتا ہے۔ کیسا تنا ہوا رہتا ہے۔" کوئی چٹکی لیتا، "مہادیو! یہ تمہاری کھال کیوں لٹکی ہوئی ہے۔ تم تو روز نہاتے ہو گے اور تیل کی مالش کرتے ہو گے۔" مہادیو فوراً سینہ پُھلا کر کہتے، "روز نہاتا ہوں۔ روز مالش کرتا ہوں مگر بڈھا ہو گیا ہوں اس لیے کھال لٹک گئی ہے۔"

دوسرا نسخہ جسے مہادیو شدومد سے بیان کرتے تھے دانتوں سے متعلق تھا۔ "دیکھو روزانہ سویرے کوئلہ چبا کر دانت مانجھو۔ دانتوں کی کوئی بیماری نہیں ہو گی۔ دانت موتی کے طرح چمکتے رہیں گے۔" ادھر سے جوابی حملہ ہوتا، "تمہارے دانت کالے کیوں ہو گئے ہیں؟" مہادیو کہتے، "یہ سب تو بڑھاپا ہے۔" سارے اساتذہ اُن کی اس 'تلقینِ بے ہنگام' سے عاجز رہتے تھے۔ ایک دن سب نے مجھ سے کہا، "مہادیو کو کام سے لگائیے۔ انہوں نے ہر وقت کے لیکچر سے پریشان کر دیا ہے۔"

میں نے بڑے غور کے بعد مہادیو سے کہا، "تم پی ایچ ڈی کیوں نہیں کر لیتے۔" مہادیو اُچھل پڑے، "میں پی ایچ ڈی کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا۔ "میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ میں نے کالج میں رہ کر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ تم کل یونیورسٹی جاؤ، فاروق سے ملو (فاروق یونیورسٹی میں بنگلہ کے صدر شعبہ اور میرے پرانے ساتھی تھے) اُن کی نگرانی میں کام کر ڈالو۔"

تیسرے دن مہادیو منھ لٹکائے ہوئے آئے۔ "نو ڈاکٹر نو۔ فاروق صاحب نے کہا۔ "میں پی ایچ ڈی نہیں ہوں نہ اتنا تجربہ ہے۔ اس لیے میں تحقیق کے کام کی نگرانی نہیں کر سکتا۔" مہادیو

نے اس ناکامی پر بڑے رنج کا اظہار کیا۔ پھر کہا، ''ڈاکٹر۔ ارے ڈاکٹر کچھ سوچو۔'' مولانا نے بھی کہا، ''انہیں کام سے لگانا ضروری ہے۔ یہ بالکل آپے سے باہر ہوتے جارہے ہیں۔''

ایک تجویز میرے ذہن میں آئی۔ میں نے کہا، ''مہادیو! تم تو ہسٹری میں بھی ایم اے ہو۔'' بولے، ''ہاں۔'' میں نے کہا، ''کل تم یونیورسٹی جاؤ، ڈاکٹر رحیم سے ملو۔ وہ تمہارے ہم وطن ہیں۔ اُن سے کہو۔ میں آپ کی نگرانی میں ''سراج الدوّلہ'' پر کام کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ سُن کر مہادیو کا بس چلتا تو وہ فوراً یونیورسٹی دوڑ لگاتے۔ ایک دن صبر کیا۔ اگلے روز یونیورسٹی گئے اور مُنھ لٹکائے واپس آگئے۔ ''کیا ہوا؟ اب کیا رکاوٹ ہے؟'' بولے، ''رحیم صاحب نے کہا۔ موضوع بہت اچھا ہے مگر جتنے بھی اُستاد ہیں اُن کے پاس طلبہ تعداد کے مطابق ہیں۔ کسی اور داخلے کی گنجائش نہیں۔'' ہم سب کو بڑا افسوس ہوا۔ لیکن میں نے ہار نہیں مانی۔ مہادیو سے کہا، ''تم جام شورو جاؤ، وہاں تاریخ کی صدر شعبہ ایک بڑی لائق خاتون ہیں۔ اُن سے ملو۔ اور کہو کہ میں آپ کی نگرانی میں سراج الدوّلہ پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہیں۔'' مہادیو کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ اگلے دن جام شورو پہنچ گئے۔ صدر شعبہ سے ملے۔ وہ بڑے اخلاق سے پیش آئیں۔ موضوع پسند کیا اور کہا، ''آپ بنگالی مآخذ سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تحقیقی منصوبہ اور کتابیات تیار کر کے لے آیئے۔ میں داخلے کے فارم پر دستخط کر دوں گی۔ کام شروع ہو جائے گا۔''

مہادیو اُچھلتے کودتے واپس آئے۔ ہنس ہنس کر سب کو روداد سنائی صدر شعبہ کی بڑی تعریف کی۔ فوراً ٹھنڈا پانی منگوا کر مجھے پلوایا۔ اور کہا، ''آپ ضرور پی ایچ ڈی کر لیجئے۔'' سب نے مہادیو کو مبارکباد دی۔ مولانا نے دعا کی کہ مہادیو کام جلد ہی مکمل کر لیں۔

اب ایک نئی بیماری شروع ہو گئی۔ مہادیو نے آفت مچادی۔ منصوبہ بنواؤ، کتابیات بنواؤ کیسے کام ہو گا۔ کیا کام ہو گا؟ اب لوگوں کو چھٹی مل گئی لیکن میری ایسی تیسی ہو گئی۔ جب دیکھو۔ مہادیو سر پر سوار ہیں، منصوبہ بنواؤ، کتابیات بنواؤ۔ آخر کار ایک تحقیقی منصوبہ بنایا اور مہادیو کے حوالے کر دیا۔ کتابیات کے سلسلے میں اُن سے کہا کہ یونیورسٹی لائبریری جاؤ، نیشنل لائبریری جاؤ، تاریخ کے اُستادوں سے ملو اور فہرست بنانا شروع کرو۔ کچھ دن تو امن رہا کیونکہ مہادیو کلاس پڑھانے کے لیے فوراً بعد یونیورسٹی لائبریری چلے جاتے تھے۔ بہت دن کام سے لگے رہے۔

مقالے کی منصوبہ بندی ڈاکٹر رحیم کو دکھائی۔ انہوں نے کچھ ترمیم تنسیخ کی اور اسے پسند کیا، مختصر یہ ہے کہ مہادیو نے سارے رفقائے کار کا دماغ اُلو کر دیا۔ خدا خدا کر کے سارا کام ہو گیا۔ مہادیو اُسے لے کر جام شورو پہنچ گئے۔

صدر شعبہ نے بڑی توجّہ سے سارا کام دیکھا۔ کچھ مشورے دیے فارم منگوایا۔ مہادیو فارم لے کر گئے تھے پیش کر دیا۔ صدر شعبہ نے دست خط کر دیے اور کہا یہ فارم منظوری کے لیے اعلیٰ ترین بورڈ میں پیش ہو گا، منظوری وہاں سے ملے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ضرور مل جائے گی۔ اب آپ مقالہ لکھنا شروع کر دیں اور جو باب مکمل ہو جائے وہ مجھے دے جائیں تا کہ میں اُسے دیکھ لوں۔

اب مہادیو کو خواب میں بھی سراج الدّولہ نظر آنے لگے۔ اُٹھتے بیٹھتے انہی کا تذکرہ کرتے۔ میر جعفر کو بُرا بھلا کہتے۔ داخلہ بھی منظور ہو گیا۔ مہادیو نے بڑے فخر سے ہمیں منظوری کا خط دکھایا مگر جلد ہی اُن کی ہمّت جواب دے گئی۔ کام رُک گیا۔ کچھ دن کے بعد ختم ہو گیا۔ سرسوں کا تیل ملنے اور کوئلے سے دانت مانجھنے کا لیکچر از سر نو شروع ہو گیا۔

دریں اثنا میں گورمنٹ کالج سے یونیورسٹی چلا گیا۔ مولانا سے فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن شام کو وہ میرے یہاں آتے تھے، میں بھی اُن کے یہاں جاتا تھا۔ کبھی کبھی مہادیو بھی نازل ہوتے تھے۔ کالج میں میری جگہ میرے بڑے لائق شاگرد اور دوست لطیف اللہ صاحب کا تقرر ہو گیا۔

پھر میں ناظم آباد سے یونیورسٹی کیمپس منتقل ہو گیا۔ مہادیو کا دیدار مشکل ہو گیا۔ کہاں تو وہ شوراشوری کہاں یہ بے نمکی۔ مگر اللہ بڑا کارساز ہے۔ لطیف اللہ صاحب ناظم آباد میں جمعے کی شام کو میرے یہاں آتے تھے۔ کیمپس میں بھی انہوں نے یہ دستور قائم رکھا۔ کیمپس آنا جانا آسان تھا کیونکہ شام کو یونیورسٹی کی بسیں ریل کی طرح پابندی وقت سے کیمپس سے ایمپریس مارکیٹ آتی جاتی تھیں۔ لطیف اللہ صاحب جمعے کی شام کو چھ بجے کیمپس پہنچتے اور کھانا کھا کر کبھی آٹھ بجے یا کبھی سوا نو بجے والی آخری بس سے واپس چلے جاتے۔ مہادیو کو اس آنے جانے کی سُن گُن مل گئی۔ وہ بھی لطیف اللہ صاحب کے ساتھ آنے لگے۔ شام کو چھ بجے پہنچتے۔ بس سے اُترتے

ہی دوڑتے ہوئے فاروق کے گھر کا رُخ کرتے جو میرے گھر کے قریب تھا۔ فاروق بنگالی کے صدر تھے اور سندھ مسلم کالج سے میرے ساتھی چلے آرہے تھے۔ فاروق کے یہاں مہادیو چائے پیتے، بسکٹ کھاتے، پھر میرے یہاں آتے۔ کبھی کبھی فاروق بھی باتیں کرنے آجاتے۔ مہادیو دوبارہ چائے پیتے اور بعد "انفراغ طعام" رخصت ہو جاتے۔ کبھی کبھی مولانا بھی اُن کے ساتھ آجاتے تھے۔ بڑی اچھی محفل رہتی۔

وقت کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی خبریں گرم سے گرم تر ہو گئیں۔ اس سے زیادہ گرم خبر یہ تھی کہ مہادیو ریٹائر ہو گئے۔ پینشن ملنے لگی۔ دن بھر کام کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے۔ اُن کے بڑے لڑکے شاہ جہاں میاں نے انٹر سائنس کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ پڑھنے پر راضی نہیں ہوا۔ مہادیو نے مجھ سے کہا تو میں نے ناظم تعلیمات سے بات کر کے اُسے ایک سرکاری کالج میں Lab Assistant رکھوا دیا۔ مہادیو نے اُس کی شادی بھی کر دی تھی۔ کام چلتا رہا۔ مگر مہادیو کے گھر میں کھلبلی مچی رہتی تھی۔

مشرقی پاکستان ختم ہو گیا، بنگلہ دیش بن گیا۔ بنگال کے سرکاری ملازم واپس جانے لگے۔ کیسے کیسے دوست چلے گئے۔ باطن اور اُس کی بیوی اسلام آباد میں تھے۔ کراچی آئے، میرے مہمان ہوئے اور روتے ہوئے چلے گئے۔ خوش رو، خوش پوش، خوش گفتار انیس اور اُس کی بیوی امینہ چلے گئے۔ انیس سے بڑی دوستی تھی۔ ایک دن اُس نے کہا، "میری بیوی ڈپریشن کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ گھر میں ہم دو میاں بیوی ہیں۔ میں کالج آجاتا ہوں وہ اکیلی رہتی ہے۔" میں نے پوچھا، "بیگم کی تعلیم کیا ہے؟" اُس نے کہا، "بی اے بی ٹی ہیں۔" میں نے کہا، "بس کام بن گیا۔ ڈپو لائن میں سرکاری بنگالی اسکول ہے امینہ کو وہاں رکھوائے دیتے ہیں۔ سارا ڈپریشن ختم ہو جائے گا۔" چنانچہ میں نے ناظم تعلیمات غلام مصطفیٰ شاہ سے بات کی۔ کیا نفیس، ہمدرد اور شفیق انسان تھے، میں نے درخواست ان کے سامنے رکھ دی۔ بولے، "کیا تم نے لوگوں کو ملازم رکھوانے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔" میں نے کہا، "اُس وقت تک کے لیے جب تک آپ یہاں ہیں۔ پھر میری کون سُنے گا۔" بہت ہنسے۔ متعلقہ افسر کو بلایا۔ پوچھا، "بنگالی اسکول میں کوئی جگہ ہے۔" اُس نے کہا، "وہاں تو بہت جگہیں خالی پڑی ہیں۔ کوئی آدمی ملتا ہی نہیں۔" شاہ صاحب نے درخواست اُس کے حوالے

کی اور کہا، "تقرر نامہ بنالاؤ۔" شاہ صاحب کسی کام میں دیر نہیں کرتے تھے۔ کام ہونا ہے تو فوراً ہو۔ تقرر نامہ آگیا۔ میں نے انیس کو دے دیا اور کہا، "جہانگیر روڈ سے بس سیدھی جیکب لائنز جاتی ہے۔ واپسی کا راستہ بھی یہی ہے۔ کوئی دقت نہیں ہوگی۔" لیجئے صاحب امینہ بنگالی اسکول میں ٹیچر ہوگئیں۔ سارا ڈپریشن جاتا رہا۔ انیس بڑا پیارا دوست تھا، دونوں میاں بیوی روتے ہوئے گئے۔ انیس کہتا تھا، "میں ریٹائر ہونے کے بعد کراچی ہی میں رہوں گا۔" سب خواب چکنا چور ہوگئے، سب چلے گئے۔ کچھ دن تک خط کتابت رہی پھر سب کچھ نذر طاق نسیاں ہوگیا۔

مہادیو اُس زمانے میں بڑے پریشان رہے۔ اُن کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ وہ خود جانا نہیں چاہتے تھے۔ بیوی جانا چاہتی تھیں۔ شاہ جہاں میاں اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا۔ بڑی بیٹی تھی اکاؤنٹس کے محکمے میں افسر تھی۔ اُس نے جانے سے صاف انکار کردیا۔ اسی الجھن میں مہادیو ایک دن میرے یہاں آئے۔

میں بھی ملازمت سے ریٹائر ہوگیا تھا اور یونیورسٹی کا مکان چھوڑ کر گلشن اقبال میں آگیا تھا۔ مہادیو یہاں آتے تو گلی کے نکڑ ہی سے اچھلنا اور چیخنا شروع کردیتے تھے، "ارے ڈاکٹر۔ او ڈاکٹر!" سارے محلے میں اعلان ہوجاتا کہ ڈاکٹر صاحب کے بنگالی دوست آئے ہیں۔ میرا ملازم ہنستا ہوا آتا اور کہتا۔

"بنگلہ بابو آیا ہے۔ میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا ہے۔"

خلافِ معمول اُس دن مہادیو بالکل خاموش تھے۔ نہ اُچھل کود، نہ چیخنا۔ بس آئے اور چپکے بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے جیب سے کُنجیوں کا ایک گچھا نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ کہنے لگے، "میں جارہا ہوں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ میرے گھر کی کنجیاں ہیں۔ تمہارے حوالے ہیں۔ گھر تمہارے سپرد ہے۔ تم اسے بیچو۔ کرائے پر دو، خود رہو۔ جو جی چاہے کرو۔ میں اگر کبھی واپس آیا تو گھر مجھے دے دینا اور نہ ہو تو تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گا۔" مہادیو نے یہ الفاظ بڑی اُداسی کے ساتھ کہے اور مجھے بھی سناٹا آگیا۔ مہادیو خاموش بیٹھے رہے۔

میں نے اُن سے پوچھا، "تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟" بولے، "میری بیوی نہیں مانتی۔ بڑی لڑکی نے صاف کہہ دیا ہے۔ وہ نہیں جائے گی۔ یہیں رہے گی۔"

میں نے کہا، ''تو پھر تم مکان اُس کے سپرد کیوں نہیں کر دیتے؟''

بولے، ''اُس کی بات نہ کرو۔ ہم جارہے ہیں۔'' میں نے صورتِ حال پر غور کیا اور پھر اُن سے کہا، ''میری بات توجہ سے سُنو۔ تمہارے جانے کے بعد حکومت تمہارے مکان پر قبضہ کرلے گی۔ مکان کسی کے پاس نہیں رہے گا۔ بنگلہ دیش میں مہنگائی بہت ہے اور نجانے تمہیں پینشن کب اور کتنی ملے؟ شاہ جہاں میاں کا مکان تم خود کہتے ہو بہت چھوٹا ہے اس چھوٹے مکان میں سارا کنبہ کیسے رہے گا اور پھر ساس بہو میں لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ روز جھگڑا ہوتا تھا۔ اب جو تم بہو بیٹے کے سر جا پڑو گے تو کیا ہو گا روز جوتیوں میں دال بٹتی رہے گی۔ زندگی دوبھر ہو جائے گی۔''

مہادیو نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا، ''ڈاکٹر! پھر میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میری بیوی میری نہیں سُنتی۔'' میں نے کہا، ''اگر تم پسند کرو تو میں انہیں سمجھاؤں۔'' مہادیو نے کہا، ''ہاں ضرور سمجھاؤ۔ شاید تمہاری بات سُن لے۔''

اگلے دن میں مہادیو کے گھر گیا۔ 'مہادیوی' سے ملاقات ہوئی۔ معاملے کی نزاکت کے پیش نظر وہ میرے سامنے آگئیں، پہلی ہی نظر میں یہ اندازہ ہو گیا کہ وہی سارے گھر پر حاوی ہیں۔ مہادیو صرف کمترین شوہر ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا۔ وہی سب باتیں کہیں جو مہادیو سے کہی تھیں۔ ساس بہو کے تعلقات پر زور دیا اور کہا کہ ''اگر بہو سے نہ بنی تو بیٹا بھی فرنٹ ہو جائے گا۔ پھر کیا کرو گی، کہاں جاؤ گی؟'' یہ بات مہادیوی کی سمجھ میں آگئی۔ برف پگھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ مہادیو نہیں جائیں گے مگر مہادیو نے یہ بھی کہا کہ پینشن میں گزارا کیسے ہو گا؟ میں نے وعدہ کیا کہ یہ میری ذمّے داری ہے۔ اتنا کام ملے گا کہ یہ کر نہیں سکیں گے۔''

دوسرے دن میں مہادیو کو ساتھ لے کر یونیورسٹی گیا۔ ناظم امتحانات عارف رضوی پرانے پڑوسی اور مخلص دوست تھے۔ خیریت پوچھی۔ میں نے مہادیو کا تعارف کرایا اور کہا، ''انہوں نے میرے کہنے پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ گزر اوقات کے لیے انہیں کوئی کام آپ کے یہاں سے مل جائے تو سہولت ہو گی۔'' عارف رضوی دوستوں کے دوست۔ فوراً گھنٹی بجائی اپنے نائب کو بلایا۔ ساجد صاحب اُن کے نائب تھے۔ وہ آئے مجھے دیکھا تو بہت جھک کر، بڑے ادب سے سلام کیا۔ رضوی صاحب نے پوچھا، ''آپ انہیں جانتے ہیں۔'' میں نے کہا،

"انہی سے پوچھیے۔" ساجد صاحب بولے، "میں نے ڈاکٹر صاحب کی ماتحتی میں شعبۂ تصنیف و تالیف میں کام کیا ہے۔" رضوی صاحب نے انہیں صورت حال سمجھائی اور کہا، "انہیں ٹیبولیشن اور چیکنگ کے کام پر لگا دیجیے۔" وہ مہادیو کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔

اب میں مہادیو کو ساتھ لے کر اپنے پرانے کالج گیا۔ پرنسپل سے ملا۔ مہادیو کے لیے کہا۔ انہوں نے کہا، "جب تک میں پرنسپل ہوں۔ مہادیو کو امتحانات کی نگرانی کا کام ملتا رہے گا۔ یہ ہمارے پرانے ساتھی ہیں۔ ان کی مدد ہمارا فرض ہے۔"

یہ مرحلہ طے ہوا تو میں مہادیو کو میٹرک بورڈ کے چیئرمین اسمٰعیل میمن کے پاس لے گیا۔ میمن برسوں کے پرانے دوست تھے۔ بے تکلفی تھی۔ ان سے کہا۔ انہوں نے فوراً مہادیو کا نام ٹیبولیشن میں شامل کرایا اور کہا، "جیسے ہی کام شروع ہو گا آپ کو بلایا جائے گا۔" آخری مرحلہ انٹر بورڈ کا تھا۔ وہاں کے چیئرمین بھی بڑے اچھے دوست تھے۔ انہوں نے بھی ناظم امتحانات کو بلا کر کام دینے کی ہدایت کر دی۔ مہادیو کام سے لگ گئے۔

میں نے اُسی دن مولانا کو ساری داستان سنادی۔ کہنے لگے، "تم نے بہت اچھا کیا۔ مہادیو کو تباہی سے بچالیا۔ محنتی آدمی ہے۔ امتحانوں کے کام میں جُتا رہے گا۔ بہت اچھا ہوا۔"

مہادیو کی آر جار بہت کم ہو گئی۔ کبھی کبھی شام کو لطیف اللہ صاحب کے ساتھ آجاتے تھے۔ میں فون کر کے مولانا کو بھی بُلوا لیتا تھا۔ وہ بڑی شان سے سائیکل چلاتے ہوئے آتے اور آتے ہی کہتے، "کب چل رہے ہو فلم دیکھنے؟" مہادیو کہتے، "مولانا صاحب۔ اب تو ہم خود فلم بن گئے ہیں۔"

لطیف اللہ صاحب سے مہادیو کی خبر ملتی رہتی تھی مگر ایک دفعہ انہوں نے بڑی لمبی غوطہ لگائی۔ آخر کار ایک دن آئے بڑے خوش تھے۔ بولے۔ ہم ڈھاکے ہو آئے ہیں۔ میری بیوی کے لیے ڈھاکا کی ساری اور ہم لوگوں کے لیے منشی گنج کے کیلے لائے تھے۔ حسب معمول اُچھلتے کودتے رہے۔ بتایا کہ جب بہو کو یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگ صرف ملنے ملانے آئے ہیں تو اس کا انداز بدل گیا۔ بڑی خوش ہوئی۔ ساس کو دو ساریاں دلوائیں۔ شاہ جہان میاں نے میرے لیے قمیض اور پتلون خریدی۔ میں نے کہا، "تمہارے سائز کی قمیض پتلون سلی سلائی مل گئی۔" مہادیو

ہنسے کہنے لگے، "اُدھر سب ہمارے سائز کے ہیں۔" کہنے لگے، "میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سب سے ملا۔ سب تمہیں یاد کرتے ہیں۔ انیس اور اس کی بیوی باطن سب نے خوب یاد کیا۔ مہادیو اس لیے بھی مطمئن تھے کہ ان کے دو لڑکے کام سے لگ گئے تھے مگر وہ بڑھاپے کے باوجود خود بھی کام کر رہے تھے۔

یہ مہادیو سے آخری ملاقات تھی۔ لطیف اللہ صاحب ایک دن خبر لائے کہ مہادیو گزر گئے۔ میں نے مولانا کو اطلاع دی۔ وہ فوراً میرے یہاں آئے۔ ہم دونوں نے اس بات پر افسوس کیا کہ مہادیو کے لڑکوں نے ہمیں اطلاع نہیں دی ورنہ ہم بھی جنازے میں شریک ہو جاتے۔ ہم دونوں نے فاتحہ پڑھی اور عمر گزشتہ کی کتاب پڑھتے رہے۔ کیا آدمی تھے مہادیو۔ بہت اچھی گزار گئے۔ پھر اس کے بعد مولانا بھی چلے گئے۔ لطیف اللہ صاحب نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔ ہر طرف اندھیرا ہو گیا۔ "اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔"

"امیرِ شہر باشانِ فقیری"

معین الدین حزیں کاشمیری

نہ کوئی جان پہچان۔ نہ واقفیت۔ نہ ملنا ملانا۔ مگر جب تعلقات ہوئے تو بھائیوں کے رشتے سے بھی بڑھ گئے۔ ہُوا یہ کہ لاہور کے ایک رسالے میں "معین الدین حزیںؔ کاشمیری" کی کچھ غزلیں نظر سے گزریں۔ اچھی معلوم ہوئیں۔ جستجو ہوئی کہ یہ "حزیںؔ کاشمیری" کون ہیں؟ لاہور کے بعض دوستوں سے دریافت کیا تو اتنا پتہ چلا کہ حزیںؔ صاحب اچھے ادیب اور شاعر ہیں۔ اساتذہ کی صحبتوں میں بیٹھے ہیں۔ موسیقی سے بھی دل چسپی ہے۔ لاہور میں کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں اور اپنے شعری مجموعے بھی شایع کر چکے ہیں۔ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ خاکوں کا ایک مجموعہ "کیسے کیسے لوگ" بھی شایع ہو چکا ہے۔

اتنی معلومات بہت کافی تھی۔ میں نے حزیںؔ صاحب کو ایک عدد خط لکھ مارا۔ کچھ اُن کی غزلوں کی تحسین، کچھ شوقِ ملاقات۔ فوراً ہی جواب آیا۔ میں نے جواب میں گرم جوشی اور محبت کی خوشبو محسوس کی۔ حزیں صاحب کا اندازِ تحریر دل لبھانے والا تھا۔ خلوص میں ڈوبا تھا۔ خط پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔" مراسلت کا سلسلہ چل نکلا مگر مراسلت کے سلسلے سے دل کی تسلی نہیں ہوئی۔ ٹیلیفون پر گفتگو ہونے لگی۔ "میری اُن کی دوبدو ہونے لگی۔" پھر یہ سلسلہ معمولاتِ زندگی میں شامل ہو گیا۔ ایک دن وہ فون کرتے۔ دوسرے دن میں فون کرتا۔ بڑی دل چسپ گفتگو ہوتی۔ جب وہ یقین کے لہجے میں کہتے کہ "ایمان اللہ۔ یہ بات یونہی ہے" تو مزہ آجاتا۔ "ایمان اللہ" اُن کا تکیہ کلام تو نہیں تھا لیکن کثرتِ استعمال سے اُس کا پہلو نشین ضرور ہو گیا تھا۔ مقررہ اوقات میں فون ہونے کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے کی

عادات و مزاج، آمد و رفت، گھر اور شوروم کے اوقات سبھی سے واقف ہو گئے تھے۔ شخصیتوں کی تہیں پورے طور پر کھل گئیں تھیں۔

ایک دن میں نے فون کیا۔ نہ گھر پر ملے نہ شوروم میں۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ دوسرے دن میں نے پوچھا، "کل کہاں غائب تھے۔ مجھے تو آپ کا چال چلن کچھ مشکوک معلوم ہوتا ہے۔" فون پر ہنسی کی آواز آئی۔ بولے "گوجرانوالے گیا تھا۔ وہاں بیوہ بیٹی کی زمین ہے۔ مکان بنوانے کا خیال ہوا تو سوچا پہلے زمین دیکھ لیں۔ گیا تو وہاں مکان بنا ہوا نظر آیا۔ پوچھ گچھ کی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مکان تو بہت دن پہلے بن گیا تھا۔ آپ اب خبر لینے آئے ہیں۔ ایک بزرگ نے سمجھایا۔ بھائی! صبر کرو۔ مقدمہ کرو گے تو مخالف پارٹی اپنے اثر کی وجہ سے تمھیں تگنی کا ناچ نچا دے گی۔ ہر ہفتے پیشی ہو گی۔ لاہور سے گوجرانوالے آنا پڑے گا۔ بہت خوار ہو گے۔ میں واپس آ گیا۔ لاہور میں بھی بہی خواہوں نے یہی مشورہ دیا کہ بھائی چپکے ہو جاؤ۔ کچھ ہو نہیں سکتا۔ ایمان اللہ بڑا رنج ہوا۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ فرخی صاحب! یہ تو اندھیر ہے اندھیر۔ سارے ملک میں یہی تباہی پھیلی ہوئی ہے۔"

ایک اور دن فون کیا۔ صبح کا وقت تھا۔ صبح وہ عموماً گھر پر ہوتے تھے۔ اخبار پڑھتے، کچھ لکھنے لکھانے کا کام کرتے تھے۔ بھابی نے بتایا کہ وہ تو صبح سویرے ہی چلے گئے ہیں۔ دوسرے دن میں نے دریافت کیا۔ "معمول کے خلاف کہاں گئے ہوئے تھے۔" "علی الصباح چو مردم بکاروبار روند بلا کشاں محبت بکوبے یار روند" والا معاملہ تو نہیں کچھ دیر ہنستے رہے۔ پھر کہنے لگے، "بہت دن سے اچھا گوشت کھانے کو نہیں ملا۔ شوروم کے قریب جو قصائی ہے اُس سے یاد اللہ ہے۔ میں نے کہا اچھا گوشت کھائے زمانہ ہو گیا۔ اچھا گوشت ملتا بھی ہے یا نایاب ہو گیا۔" وہ ہنسا۔ کہنے لگا۔ کل سویرے سویرے آ جاؤ۔ اچھا گوشت ہی ملے گا۔ تو "ایمان اللہ" ایسا تحفہ گوشت ملا کہ مزہ آ گیا۔ آپ کیا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ بچپن میں گلستان سعدیؔ میں ایک شعر پڑھا تھا۔ گوشت کے حوالے سے وہ ذہن میں رکھتا ہوں۔

بہ تمنائے گوشت مُردن بہ
زِ تقاضائے زُشتِ قصاباں

ہنسے۔ کہنے لگے، ”آپ ہر موقعے کے لیے موزوں اور بر محل شعر ذہن میں چھپائے رکھتے ہیں۔ اب اس طرح کی برجستگی عنقا ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ادبی مزاج اور رویہ بدل گیا ہے۔“ جواب ملا، ”بے شک۔ بے شک۔ گفتگو میں شعر پڑھیے تو ایمان اللہ اگلا اس طرح چونکتا ہے جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔“

ایک رات کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ میں نے نکل کر دیکھا تو ایک صاحب کھڑے تھے، شریف صورت، سنجیدہ اور متین انداز۔ میں انھیں پہچان نہیں سکا۔ آنے والے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا ”میں حزیںؔ صاحب کا بیٹا ہوں۔ دفتری کام سے یہاں آیا ہوں اور اب واپس جا رہا ہوں۔ والد صاحب نے یہ نان خطائیاں آپ کے لیے بھیجی ہیں۔“ میں نے انہیں بٹھانا چاہا لیکن وہ مصروفیت کا عذر کر کے رخصت ہو گئے۔ حزیںؔ صاحب کا تحفہ حوالے کر گئے۔ لاہور کی نان خطائیاں بہت مشہور ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں حزیںؔ صاحب کے انتخاب کی داد دی اور ایک عدد نظم گھسیٹ کر انہیں بھیج دی۔ نظم تو مجھے یاد نہیں رہی، نہ کوئی نقل محفوظ ہے۔ صرف ایک شعر یاد ہے۔

معین الدین نے بھیجی ہے اسلم
مجھے لاہور سے نان خطائی

بڑے محظوظ ہوئے۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب اُن کا شعری مجموعہ ”حدیث دیگراں“ شائع ہوا تو انہوں نے اس کا ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا۔ میں نے جواب میں قطعہ تاریخ ارسال کیا۔ آخری مصرع جس سے تاریخ نکلتی ہے۔ یہ تھا ”حدیث دیگراں نور علیٰ نور۔“

فون پر کہنے لگے ”کاش یہ قطعہ پہلے مل جاتا تو داخل کتاب ہوتا۔ کیا روشن تاریخ ہے۔“ میں نے کہا، ”آپ کی محبت میں یہ روشن تاریخ اتفاقاً سرزد ہو گئی ہے۔“ بولے ”انکسار سے کام نہ لیا کیجیے۔ ایمان اللہ آپ شاعری کے ہر پہلو پر حاوی ہیں۔“

حزیں صاحب ایک ممتاز علمی اور ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد میاں شمس الدین لاہور کی ایک معروف شخصیت تھے۔ اُن کے زیر سایہ حزیںؔ صاحب نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ باپ نے پوچھا۔ ”اب کیا کرو گے۔“ حوصلہ مند بیٹے نے کہا، ”نوکری

نہیں کروں گا۔ کاروبار کروں گا۔" میاں شمس الدین انہیں ساتھ لے کر شیخ مبارک علی کے یہاں پہنچے۔ حزیںؔ صاحب شیخ مبارک علی کی دکان پر معاون کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

شیخ مبارک علی لاہور کے مشہور تاجر کتب تھے۔ عربی، فارسی، اردو کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ اُن کے مکتبے میں موجود رہتا تھا۔ السنہ شرقیہ کے نصاب کی ساری کتابیں انہیں کے یہاں سے ملتی تھیں اور وہ السنہ شرقیہ کی نصابی کتابیں شایع بھی کرتے رہتے تھے۔ فارسی کی مختلف کتابوں کی شرحیں بھی انہوں نے مستند اہل علم سے لکھوا کر شایع کی تھیں۔ آدمی تھے دیانت دار، محنتی اور پڑھے لکھے۔ چھوٹے سے بڑے ہوئے تھے۔ اصولوں میں بہت سخت تھے۔ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ اُن کا مکتبہ شمالی ہند میں فارسی، عربی اور اردو کتابوں کا بہت بڑا مخزن تھا۔

حزیںؔ صاحب شیخ مبارک علی کے یہاں پہنچے تو انہیں سارے کام سیکھنا پڑے انہوں نے اسلامیہ کالج میں تعلیم پائی تھی لیکن ان کی سب سے بڑی درس گاہ جسے یونیورسٹی کہنا بجا ہے شیخ مبارک علی کی دکان تھی۔ یہاں انہوں نے کتابوں کے پیکٹ بنانا۔ وی پی سے کتابیں بھیجنا۔ ریل سے بھیجے جانے والی کتابوں کے پارسلوں کی بلٹیاں بنانا۔ ہر پارسل اور پیکٹ میں کتب خانے کی کتابوں کی فہرستیں رکھنا۔ وقت کی پابندی کرنا۔ گاہکوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا۔ ادیبوں، شاعروں اور لکھنے والوں کا احترام کرنا سیکھا۔ صبح وہ دکان پر آتے۔ دکان کھولتے اور صفائی کرتے۔ پھر اُس کے بعد — ایک فقرہ مشہور ہے، "ہم نے بڑے بڑے استادوں کی چلمیں بھری ہیں، تب یہ فن سیکھا ہے۔" حزیں صاحب دکان پر آتے ہی شیخ صاحب کا حقہ تازہ کرتے۔ اپلوں کی آگ سے چلم بھرتے اور شیخ صاحب کے لیے رکھ دیتے۔ چلم بھرنے کے اس سلسلے نے حزیں صاحب کو کتب فروشی اور اشاعت کتب دونوں میں کامل کر دیا۔ دکان پر لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں کے شاعر اور ادیب بھی آتے رہتے تھے۔ حزیں صاحب نے اپنے خاکوں کے مجموعے "کیسے کیسے لوگ" میں مولانا حسرتؔ موہانی کے انکسار اور فروتنی کا جو واقعہ لکھا ہے، میں اُسے یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں، "ایک صبح میں حسب معمول دکان کھولنے لگا تو دیکھا کہ باہر دروازے کے تھڑے پر ایک درویش نما آدمی جو بظاہر خستہ حال مسافر دکھائی دیتا تھا۔ تہہ کیے ہوئے بستر کا تکیہ بنائے نہایت اطمینان سے لیٹا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ایک تھیلا اخباروں سے ٹھسا

ہوا۔ ایک لوٹا اور ایک چھڑی رکھی ہوئی ہے۔ اس وضع قطع کے آدمی کو دیکھ کر میں نے یہی سمجھا کہ کوئی غریب و درماندہ مسافر رات بسر کر کے اگلی منزل کی سوچ رہا ہے۔ چنانچہ میں نے اس اندازے کے پیش نظر ذرا تلخ لہجے میں اُسے سے اُٹھنے کے لیے کہا۔ جس پر دوسری طرف سے بغیر مزاحمت کے عمل کیا گیا۔ اب یہ درویش اپنا ساز و سامان اُٹھائے سامنے کی دکان کے تھڑے پر جالیٹا... قریباً نصف گھنٹے کی جھاڑ پونچھ کے بعد دکان سے جھانک کر دیکھا تو جناب شیخ مبارک علی حسب معمول دکان کی جانب نظریں اٹھائے چلے آرہے ہیں مگر دور ہی سے بہ آواز بلند، "مولانا۔ مولانا۔" پکار رہے ہیں اور نظریں اُسی درویش پر جمی ہوئی ہیں۔ یاالٰہی یہ سب کیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں آپس میں بغل گیر ہو گئے اور شیخ صاحب اُن کا ہاتھ تھامے دکان پر لے آئے۔ اُدھر اُن کی باتوں سے پتہ چلا کہ آپ مولانا حسرت موہانی ہیں۔"

حزین صاحب کا بیان بڑا دلاویز ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کی دکان پر کیسے کیسے مشاہیر تشریف لاتے تھے اور حزین صاحب نے اُن سے کیا سیکھا۔

شیخ مبارک علی بڑے محتاط ناشر تھے۔ بڑی کتابوں کی تصحیح قرأت سے کرتے تھے۔ اس طرح غلطیوں کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے۔ انہوں نے 'آب حیات' شائع کی تو پروف خود پڑھے، کبھی وہ پڑھتے اور کبھی حزین صاحب۔ اس طرح حزین صاحب نے 'آب حیات' لفظاً لفظاً پڑھی اور ساری کتاب کو ذہن میں اُتار لیا۔ آزاد شناسی کی ایک منزل طے کر لی۔ شیخ صاحب نے آزاد کی دوسری بڑی کتاب 'دربار اکبری' شائع کی تو اس کی تصحیح بھی اسی طرح ہوئی۔ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ کاپیاں کبھی شیخ صاحب پڑھتے کبھی حزین صاحب۔ اس طرح وہ اکبری عہد، اُس عہد کی علمی اصطلاحوں اور آزاد کے بے مثل ذخیرہ الفاظ اور مرصع انداز بیان سے پوری طرح واقف ہو گئے۔ جس کسی نے ان دونوں کتابوں کو 'الف' سے 'ی' تک پڑھ لیا اُسے اردو ادب کے خزانے پر دست رس حاصل ہو گئی۔

حزین صاحب کو شیخ مبارک علی کی دکان پر علم کے اسرار و رموز اور عالموں کے رنگ ڈھنگ سے بڑی اچھی واقفیت ہو گئی۔ انہوں نے شیخ مبارک علی کے خاکے میں بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے شیخ صاحب کی عظمت کے ساتھ ساتھ خود اُن کی ذہنی بلندی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

شیخ کے آستانے پر تین چار برس گزارنے کے بعد حزین صاحب نے خود اپنا مکتبہ 'مکتبہ "معین الادب" کے نام سے قائم کیا۔ علامہ اقبال کے دوست چودھری محمد حسین کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہوا۔ شیخ مبارک علی نے بھی شرکت کی اور بہت سے ادیب شاعر جمع ہوئے۔ اس مکتبے سے حزین صاحب نے کچھ کتابیں شایع کیں۔ پھر انہوں نے مکتبہ معین الادب کے بجائے اپنے مکتبے کے لیے اردو کتاب گھر کا نام اختیار کیا جو اب تک جاری ہے۔ بہت کتابیں شایع کیں۔ درسی کتابوں کا کام کیا۔ سارا کام محنت اور دیانت داری سے کیا اس لیے اللہ نے برکت عطا فرمائی۔ اپنا پریس بھی قائم کیا۔ خود بھی خوش رہے، دوسروں کو بھی خوش رکھا۔

یہ جملہ میں نے لکھ تو دیا لیکن خوش رہنے کا مفہوم میرے نزدیک راضی برضا رہنے کا ہے۔ حزین صاحب نے ایک جوان بیٹے کا داغ سہا۔ بیٹا ہونہار تھا۔ ڈاکٹر ہو گیا تھا۔ اپنوں اور غیروں میں مقبول تھا۔ حزین صاحب کو جو صدمہ ہوا ہو گا وہ ناقابل بیان ہے لیکن بات راضی برضا رہنے کی ہے۔ وہ کبھی اپنے دکھ کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ لیکن سمجھنے والے سمجھتے تھے کہ حزین صاحب کی خوشی میں اداسی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ میں اُنہیں ہمیشہ "شاداں حزین" کہتا اور لکھتا تھا۔ وہ ہنستے اور کہتے، "میرا تخلص بالکل درست ہے۔" حزین صاحب نے ایک بیٹی کے سر پر بیوگی کا سفید دوپٹہ بھی دیکھا لیکن رہے بالکل چُپ۔ ہنستے رہے اور ہنسی میں اپنے دکھ کو چھپاتے رہے۔

حزیںؔ صاحب بڑی ہمت اور حوصلے کے آدمی تھے۔ بی اے کر لیا تھا۔ اپنا کام کر رہے تھے۔ چار بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ ایک دن پروفیسر وقار عظیم نے اُن سے کہا "معین! تم ایم اے کیوں نہیں کر لیتے۔" انہوں نے کاروبار اور مصروفیت کا عُذر کیا۔ کہا "حاضریاں کیسے ہوں گی؟" وقار صاحب نے کہا۔ "دیکھا جائے گا۔ تم ہمت تو کرو۔" حزین صاحب نے ہمت کر لی۔ بڑے اچھے نمبروں سے ایم اے کر لیا مگر کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ "میں ایم اے ہوں۔ میں بھی کوئی چیز ہوں۔" جہاں کہیں اپنا ذکر کیا ہے "اس ناچیز" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایسا انکسار کم دیکھنے میں آتا ہے۔

حزیںؔ صاحب کو لڑکپن ہی سے شعر و شاعری سے دل چسپی تھی۔ غزل کہی۔ بڑے خوش

ہوئے۔ والد کو سنائی۔ وہ بھی خوش ہوئے۔ شیخ مبارک علی کو سنائی تو انہوں نے ڈانٹا کہ "خبر دار۔ شاعری واعری کے چکر میں نہ پڑو۔ اپنا کام کرتے رہو۔" لیکن حزین صاحب نے اُن کی نصیحت اس کان سے سنی اُس کان سے اُڑا دی۔ غزلیں کہتے رہے۔ پھر ایک نظم لکھی۔ نظم لکھی تو چھپوانے کا شوق ہوا۔ 'ادب لطیف' کے دفتر گئے۔ ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں نظم پیش کی۔ انہوں نے لے کر رکھ لی۔ بہت دن گزر گئے۔ ہمت کر کے پھر 'ادب لطیف' کے دفتر پہنچے۔ اپنی نظم کے بارے میں دریافت کیا۔ ایڈیٹر صاحب نے ردّی کی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا کہ "اس ٹوکری کی نذر ہو گئی۔" حزین صاحب مایوس اور دل برداشتہ وہاں سے اُٹھ آئے۔ نقوش والے محمد طفیل سے ان کے تعلقات اُس زمانے سے تھے جب طفیل کتابت سیکھ رہے تھے۔ حزین صاحب ایک دن اُن کے دفتر گئے اور ڈرتے ڈرتے اپنی نظم پیش کی۔ انہوں نے لے کر رکھ لی اور کہا "اس کے بارے میں فیصلہ کچھ دن بعد ہو گا۔" کچھ دن بعد یہ نظم 'نقوش' کے سالنامے میں شائع ہو گئی۔ حزین صاحب کے دل کی کلی کھل گئی۔

نثر کے سلسلے میں بھی پہلا تجربہ مایوسی کا تھا۔ حزین صاحب نے ایک مضمون 'یگانہ چنگیزی' کی شاعری پر لکھا۔ یہ وہ دور تھا جب یگانہ اپنی کج رائی کی وجہ سے بدنام زمانہ ہو چکے تھے۔ ان دنوں اخبار 'امروز' کے ادبی ایڈیشن کی بڑی دھاک تھی۔ چراغ حسن حسرت اخبار کے مدیر تھے۔ حزین صاحب ایک دن اپنا مضمون لے کر اُن کے پاس گئے۔ باقی باتیں حزین صاحب کی زبانی سنیے۔

"ڈرتے ڈرتے مضمون ان کے حوالے کر دیا۔ میں کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ سر سے پا تک میرا جائزہ لے رہے ہیں۔ پھر وہ مضمون پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ میں اُن کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اُن کے تاثرات کا اندازہ لگاتا رہا۔ ایک جگہ رُکے اور اپنی رعب دار آواز اور مخصوص لب و لہجہ میں کہنے لگے۔

"کیا جناب عروض سے واقف ہیں؟"

عرض کی کہ "ہاں۔ کچھ کچھ۔"

مسودہ آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ ذرا یگانہ کا یہ شعر تو پڑھیے۔

صلح کر لو یگانہ غالب سے
وہ بھی استاد تم بھی استاد

میں نے شعر پڑھتے ہی دوسرا مصرع اس طرح پڑھ دیا کہ

وہ بھی استاد تم بھی اک استاد

کہنے لگے۔ "سچ ہے۔ آپ عروض سے آشنا ہیں۔ ورنہ امروز کی ایک قد آور شخصیت کا نام لیتے ہوئے کہنے لگے کہ اس سے کہوں کہ یہ شعر تو پڑھو تو وہ اسے ناموزوں پڑھ جائیں گے۔

اس پر میں نے عرض کیا۔ "جناب یہ سہو قلم ہے اور بس۔"

"جب پورا مورا مضمون پڑھ لیا تو فرمایا کہ صاحب زادے مضمون سے ایک حد تک میں بھی اتفاق کرتا ہوں مگر امروز میں اسے شائع کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ یہ Controversial مسئلہ ہے۔"

چلیے۔ چھٹی ہوئی۔ مگر شاعری کی طرح نثر نگاری سے بھی شغف جاری رہا۔ نشتر جالندھری کی شاگردی اختیار کی۔ نشتر صاحب درویش مزاج، عالم، شاعر تھے۔ ایک پرانے استاد نظم طباطبائی کے شاگرد تھے جو ایک مشہور انگریزی نظم کے اردو ترجمے کی وجہ سے آج بھی اردو ادب میں زندہ ہیں۔ نظم زبان و بیان اور عروض کے بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے کلام غالب کی عالمانہ شرح بھی لکھی ہے۔ نشتر صاحب نے بھی استاد کی پیروی میں غالب کی شرح مرتب کی ہے۔ نشتر صاحب نہ صرف یہ کہ زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے بلکہ علم عروض پر بھی پوری طرح حاوی تھے۔ بقول منٹو "میں نے اول اول جب افسانہ نگاری کی تو زبان و بیان کے رموز سے آشنا نہ تھا چنانچہ میں نے بلا تکلف اپنے افسانے بغرض اصلاح نشتر جالندھری کے سپرد کر دیے۔ ان کی اصلاح سے مجھ پر بہت جگہ زبان و بیان کے رموز آشکار ہوئے۔" حزین صاحب نے نشتر صاحب سے آداب زندگی، شاعری اور نثر نگاری سب میں اکتساب فیض کیا اور ان کی بڑی خدمت کی۔

نشتر صاحب بڑے محنتی اور دیانت دار عالم اور انسان تھے۔ اردو بازار کے ناشر ان کتب کا کام کرتے تھے۔ کام ختم ہو جاتا تو مسودے کے ساتھ بچی ہوئی روشنائی اور کاغذ بھی واپس کر دیتے

تھے۔ پبلشر لاکھ اصرار کرتا لیکن ان کا کہنا یہ تھا کہ بچی ہوئی روشنائی اور کاغذ واپس کرنا میرا فرض ہے۔ ان کی سادگی اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ ہر مہینے کے شروع میں حزین صاحب کو سو روپے کا ایک نوٹ اور اُس کے ساتھ ایک پرچہ دیتے۔ پرچے پر چھوٹے نوٹوں کی تعداد، اٹھنیوں، چونّیوں، دونیوں اور اکنیوں کی تعداد جمع ہوتی۔ حزین صاحب یہ مطلوبہ نوٹ اور سکے جمع کر کے اُن کے حوالے کر دیتے تھے۔ جب وہ اردو بازار کے دکانداروں سے ریزگاری حاصل کرتے تو دکاندار ہنس کر کہتے۔ ''اچھا نشتر صاحب کے لیے جمع کر رہے ہو۔''

حزین صاحب کاروبار زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی مشاغل میں بھی مصروف رہے۔ شعر کہتے تھے۔ مضامین لکھتے تھے۔ مشاعروں، محفلوں اور جلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ بڑی فعال زندگی تھی۔ اُنہیں شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی گہری دل چسپی تھی۔ سُر کا گیان رکھتے تھے۔ بڑے بڑے موسیقاروں کو سنا تھا اور اُن کے فن پر تبصرہ بھی کیا تھا۔ کبھی کبھی فون پر اُن سے موسیقی کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی تو اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس فن سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لاہور کے موسیقار گھرانوں میں محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ موسیقی کے شائق ان میں شریک ہوتے تھے۔ حزین صاحب نے ایسی بہت سی محفلوں میں شرکت کی اور ان محفلوں کے ختم ہو جانے پر افسوس بھی کیا ہے۔ یہاں میں اُن کے موسیقی کے شغف اور سُر کی پہچان کے حوالے سے اُن کا بیان کردہ ایک واقعہ پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ واقعہ قیام پاکستان سے پہلے کا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''ایک بار میں اور میرے ایک مرحوم دوست نصف شب کے قریب رنگ محل کے قریب کسی ہندو آبادی سے گزر رہے تھے۔ کانوں کو ایک نہایت سریلی آواز سنائی دی۔ اس آواز کا پیچھا کرتے ہوئے جب ہم نے اُسے پا لیا تو دیکھا کہ ایک چھوٹے سے مندر میں جس کا رقبہ ایک مرلے سے بھی کم تھا ایک خوبصورت نوجوان لڑکا ہارمونیم پر انگلیاں چلاتے ہوئے طبلے کی معتدل لے پر راگ کیدارا میں پرارتھنا کر رہا ہے۔ راگ کے بول تھے۔ ''شیو شنکر تو ہی مہادیو'' رات کی خاموشی میں یہ سماں اس قدر مسحور کن تھا کہ ہم سے نہ رہا گیا۔ ہم دونوں مندر میں دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے اور راگ کیدارا سے پوری طرح لطف اٹھانے کے بعد وہاں

سے چل دیے۔"

راگ سے مسحور ہونا، راگ کا تعین اور چلتے چلتے ٹھہر جانا یہ سب حزین صاحب کے کن رس ہونے کی شہادت ہے۔

حزین صاحب شاعری، موسیقی اور ادبی تنقید میں اپنے اعلیٰ ذوق کا اظہار تو کرتے ہی رہتے تھے۔ آٹھ شعری مجموعے شائع کیے۔ نثر کے مضامین شائع کیے اور ان سب کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے انسان شناس بھی تھے۔

حزین صاحب کی انسان شناسی کا زندہ ثبوت اُن کے خاکوں کا مجموعہ "کہاں گئے وہ لوگ" ہے یہ ضخیم مجموعہ اکیاسی خاکوں پر مشتمل ہے۔ بعض خاکے مختصر ہیں، بعض بھرپور ہیں۔ لیکن ہر ایک کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے انسان شناس تھے اور اپنے ہر ملنے جلنے والے کی شخصیت کی تہوں کو بڑی کامیابی سے عیاں کر دیتے تھے۔ مولانا حسرت ہوں یا خلیفہ عبدالحکیم، مہر و سالک ہوں یا عدم اور شاد امرتسری۔ اُن کے اس ادبی مرقع میں ہر تصویر سجل اور اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ نمایاں ہے۔ حزین صاحب نے ان خاکوں کے ذریعے سے بعض بڑے لیکن امتداد زمانہ سے معدوم ہو جانے والے افراد کو بھی زندہ کیا ہے۔ نشتر جالندھری کا خاکہ حزین صاحب کی اُستاد پرستی، محبت اور انہیں زندہ رکھنے کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے بڑی محبت اور خلوص سے اپنے بزرگوں اور دوستوں کو بازیافت کی ہے۔ اُن کے خاکوں کے ذریعے سے لاہور کے بے شمار ادیبوں، شاعروں، عالموں اور حکیموں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

حزین صاحب نے اس مجموعے میں بعض حیرت انگیز واقعات بھی لکھے ہیں۔ انہیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ماورائے زندگی بھی بہت کچھ ہے۔ حزین صاحب نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا اور ہماری آگاہی کے لیے قلم بند کر دیا اُس کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔

چودھری محمد حسین لاہور کی معروف شخصیت تھے۔ علامہ اقبال کے گہرے دوست تھے۔ علامہ نے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے جو ٹرسٹ بنایا تھا اُس کے ایک امین وہ بھی تھے۔ حزین صاحب بھی اُن کے بڑے معتقد تھے۔ چودھری صاحب کی وجہ شہرت ایک اور بھی ہے۔ وہ پنجاب گورنمنٹ کی پریس برانچ میں افسر تھے۔ منٹو، عصمت اور شاہد احمد دہلوی پر فحاشی کے

الزام میں مقدمے اُنہیں نے دائر کیے تھے۔ یہ مقدمے ہائی کورٹ نے خارج کر دیے تھے۔ منٹو نے طنزاً اپنی ایک کتاب کا انتساب بھی اُن کے نام کیا تھا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد جب دلّی لُٹی تو شاہد احمد دہلوی لٹے پٹے مہاجر کی حیثیت سے لاہور آ گئے۔ یہاں انہوں نے ساقی جاری کرنے کے لیے ڈیکلریشن کی درخواست دی۔ سال بھر جُھلانے کے بعد چودھری صاحب نے اُن کی درخواست نامنظور کر دی۔ شاہد صاحب دل برداشتہ ہو کر کراچی چلے آئے۔ یہاں آنے کے فوراً بعد انہیں ڈیکلریشن مل گیا اور 'ساقی' کراچی سے جاری ہو گیا۔ اس پس منظر میں حزین صاحب کے اس مشاہدے پر غور کیجیے اور سر دُھنیے۔ حزین صاحب لکھتے ہیں:

''پچھلے برس مجھے اپنے دوستوں کے ہمراہ چودھری صاحب کے مزار پر جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر کہ چودھری صاحب کا مزار بری طرح شکستہ ہو گیا ہے بہت دکھ ہوا۔ مزار کے باہر مدتوں کا مرا ہوا ایک کتا فضا میں تعفن بکھیر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دعائے مغفرت پڑھ سکا۔''

حزین صاحب کا بیان کردہ ایک اور واقعہ بھی توجہ طلب ہے۔ لکھتے ہیں:

''اردو بازار کے وسط میں 'ہری گیان' مندر واقع تھا۔ اس کی بالائی منزل میں میرے تایا زاد بھائی کی بلاک بنانے کی دکان تھی۔ مندر کے پنڈت جی کبھی کبھی میرے بھائی سے ملنے اوپر کی منزل پر آیا کرتے تھے۔ جن کا نام میرے ذہن سے اتر گیا۔ جسم کے بھاری بھر کم۔ نہایت خلیق۔ فراخ دل اور ملنسار انسان تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میرے بھائی نے انہیں داتا گنج بخشؒ کے مزار کے باہر ہاتھ باندھے اور منھ سے کچھ پڑھتے دیکھ لیا۔ جب وہ اس عمل سے فارغ ہو لیے تو میرے بھائی نے اُن سے مل کر کہا ''پنڈت جی، آپ اور یہاں؟'' اس پر انہوں نے فرمایا۔ ''میاں ہم تو خیر کے طالب ہیں۔ کہیں سے مل جائے۔ تعجب کیسا؟ حیرانی کیوں؟ آپ کے سہی۔ یہ بھی تو بھگت ہیں۔'' ایسا ہی نظارہ میں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر کیا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر بھی ایسے ہی احوال نظر آئے۔''

ایک اور منظر۔

''ایک اور صاحب کو دیکھا۔ سریاں والے بازار میں کبوتر بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ دُبلے پتلے، عمر رسیدہ آدمی تھے۔ کبوتر تو شاید کم بیچتے تھے مگر لوگ کہتے تھے اُن جیسا داستان گو لاہور

میں موجود نہیں۔ میں اُن دنوں چھٹی کا طالب علم تھا۔ ایک بار وہاں کھڑا ہو کر انہیں سننے لگا۔ جوں جوں داستان آگے بڑھتی رہی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا گیا۔ دو تین گھنٹے چند منٹوں میں گزر گئے۔ گھر پہنچا تو والدین کی سرزنش کا سامنا کرنا پڑا۔ "کیسا اچھا دور تھا۔ کیسے کیسے لوگ تھے۔ شہر کے اس بیان میں قدیم لاہور کے دل کی دھڑکن واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ اب آبادی کی کثرت نے شہروں کی ثقافتی روایتوں اور شہریوں کے طرز احساس اور فکر کو بالکل بدل دیا ہے۔ بدل کیا دیا ہے۔ شہر نابود ہو گئے ہیں۔ انسانوں کے جنگل وجود میں آ گئے ہیں۔ ایسے جنگل جہاں انسان کی کوئی ثقافت اور انفرادیت نہیں ہے اور نہ کسی محلے کی کوئی روایت زندہ ہے۔

عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ کے بارے میں۔ ناصر نذیر فراق، اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی نے دلّی کے بارے میں خوب خوب لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں لکھنؤ اور دلی کی عام زندگی، بولی ٹھولی اور طرز احساس کی سچی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ حزین صاحب نے بھی لاہور کے بارے میں خوب لکھا ہے۔ بڑے اعتماد کے ساتھ لاہور کی قدیم عظمتوں کو نمایاں کیا ہے۔ کاش وہ اختصار کے بجائے طول کلامی سے کام لیتے۔ پرانے طبقوں کے نقیب اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ مورخ تاریخیں لکھ کر واقعات کے سلسلوں کو محفوظ رکھتے ہیں لیکن کسی شہر کے دل کی دھڑکنوں کو قلم بند نہیں کر پاتے۔ یہ انہیں لوگوں کا کام ہے جو شہروں کی روح میں اتر جاتے ہیں اور دیکھنے والی آنکھ، سننے والے کان اور قلب کے نازک محسوسات کی مدد سے شہر کی روح کی حقیقی جھلک ہمیں دکھا دیتے ہیں۔ حزین صاحب لاہور کی ثقافت ادب و شعر کی زندہ تاریخ تھے۔ انہوں نے مجھے سیکڑوں واقعات سنائے۔ نجانے کتنے لوگوں کے تذکرے کیے۔ میں سنتا رہتا تھا اور ان کی یادداشت پر رشک کرتا رہتا تھا۔

حزیںؔ صاحب نے ایک بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "دراصل اندرون لاہور واقع محلے تیس پچاس گھروں کی تعداد سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ جونہی ایک حد ختم ہوئی۔ دوسرا محلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح ان محلوں میں آدمی کی انفرادیت کبھی گم نہ ہو سکی اور اس کی شناخت میں کبھی دِقت محسوس نہ کی گئی۔" دِقت تو آج کل محسوس ہوتی ہے کہ محلے ختم ہو گئے۔ محض نام رہ گئے اور یہی انداز غالب رہا تو وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ نہ محلے رہیں گے نہ محلے

داری کے آداب۔ سربفلک پلازے محلے داری کی روایت کا منھ چڑاتے اور شہری ثقافت کو نگلتے نظر آئیں گے۔

فون پر گفتگو تو روز ہوتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج شناس بھی ہو گئے تھے۔ ملاقاتیں صرف دو ہوئیں۔ ایک دفعہ میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی کے ایک طالب علم کے زبانی امتحان کے لیے لاہور گیا۔ خاصی دقّت سے گیا مگر چونکہ میرے بیٹے آصف بھی کسی کام سے لاہور جا رہے تھے لہٰذا ہمت کی اور چلا گیا۔ امتحان ختم ہو گیا تو ڈاکٹر سہیل احمد خان مرحوم کے کمرے میں حزیں صاحب ملنے کے لیے آ پہنچے۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ کچھ اور لوگ بھی تھے لیکن حزیں صاحب اور میں ایک طرف بیٹھ گئے اور گفتگو چھڑ گئی چونکہ اُسی شام واپس آنا تھا لہٰذا اُن کے ساتھ اردو کتاب گھر نہ جا سکا۔ افسوس ہوا۔ انھیں دیکھ کر وہ چار تصویریں نظر میں گھوم گئیں جو اُن کے خاکوں کے مجموعے میں شائع ہوئی ہیں۔ ۵۰ء میں وہ جوان رعنا، سوٹ پہنے ٹائی لگائے، ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں۔ دوسری تصویر ۱۹۵۴ء کی ہے۔ ٹائی اس میں بھی ہے۔ تیسری تصویر ۱۹۸۵ء کی ہے۔ اس میں ٹائی اور سوٹ ختم۔ کرتا شلوار پہنے۔ چہرے پر مسکراہٹ اور چوتھی تصویر میں جو ۲۰۰۵ء کی ہے سفید بالوں والا ایک بوڑھا صدری پہنے، چہرے پر بُردباری کا تاثر لیے بہت متین اور سنجیدہ نظر آرہا ہے۔ چہرے کی وہ مسکراہٹ جو شروع کی تین تصویروں میں ہے چوتھی تصویر میں غائب ہے۔ اس کے بجائے فکر اور تدبر نمایاں ہے۔ بخاری ہال کی سیڑھیاں اُترتے وقت انھوں نے جس محبت سے مجھے سہارا دیا اور میرا ہاتھ تھاما، میں اُس خلوص اور گرم جوشی کو اب بھی اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ وہ ہر سیڑھی پر ٹھہرتے۔ آواز دیتے۔ ایک اور ایک اور۔ یہاں تک کہ کوئی اور نہ رہی۔ یہ ملاقات تازہ ہوا کا وہ جھونکا تھا جس کی خوشبو آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

دوسری دفعہ لاہور جانے کا اتفاق شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے صد سالہ یوم وفات کی تقریب کے موقعے پر ہوا۔ دسمبر کا مہینہ، سخت سردی، غضب کا کہر۔ اس دفعہ بھی آصف ساتھ تھے۔ آفریں ہے حزیں صاحب پر کہ رات کو شدید کہر اور سردی میں عزیزی رضوان کے ساتھ آ گئے۔ بڑی ہمت کی۔ میں شہر سے دور پنجاب یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں

ٹھہرا ہوا تھا۔ رات کا وقت، سردی اور کہر، لیکن حزین صاحب آہی گئے اور میری یہ کیفیت کہ "آمد آن یارے کہ ما می خواستیم" کے انبساط میں گم۔ حزین صاحب پرانی روایت کے حامل ہیں۔ خالی ہاتھ نہیں آئے۔ شلوار قمیص کا جوڑا ساتھ لائے۔ میں اس جوڑے کو دیکھتا ہوں، صدری کے کپڑے کو سامنے رکھتا ہوں اور حزین صاحب کے خلوص کی گرمی محسوس کرتا ہوں۔ کیا سیر چشم آدمی تھے۔ کبھی کبھی میں نے اُنہیں کسی کتاب کے لیے لکھا، انہوں نے فوراً بھیج دی۔ فوائد الفوائد کے ترجمے کا ایک اچھا ایڈیشن ان کے پاس تھا۔ ایک دن کہنے لگے، دیکھنے کی چیز ہے۔ پھر تین چار دن بعد اس کا فوٹو اسٹیٹ آگیا۔ انتقال سے چند روز پہلے کہنے لگے، ایک دوست مدینہ منورہ گئے تھے۔ واپسی پر جنت البقیع سے تھوڑی سی مٹی لے آئے۔ مجھے بھی حصہ ملا ہے۔ آپ کا حصہ میں نے اپنے پاس محفوظ کر لیا ہے۔ جیسے ہی کوئی معتبر آدمی ملا آپ تک پہنچ جائے گا۔ ایمان اللہ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا، حزین صاحب "آپ نے میری مٹی کو معتبر بنا دیا۔ کیا اعتبار بخشا ہے مجھے اس خاک جنت البقیع سے۔" میری اس بات سے بہت خوش ہوئے تھے۔ افسوس کہ یہ مٹی مجھے اُن کی وفات کے بعد موصول ہوئی۔

اس واقعے کی اطلاع میرے ایک شاگرد / دوست (دوست زیادہ شاگرد کم) جناب واصل عثمانی کو ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا، "استاد آپ بڑے خوش نصب ہیں۔ دنیا طیبہ کی خاک پاک کے لیے تڑپتی رہتی ہے اور آپ کے پاس یہ خاک پاک خود بخود پہنچ گئی۔ زہے نصیب۔ آپ کو اپنی نعت کا یہ شعر یاد نہیں۔

سرمایہ دارین ہے یہ خاک درِ احمدؐ
پیشانی پہ میں نے بھی یہی خاک ملی ہے

سرزمین طیبیہ میں خاک درِ احمدؐ پیشانی پر ملنے والے کی عزت افزائی گھر بیٹھے ہوگئی اور حزین صاحب کے توسط سے ہوگئی۔ وہ بھی بزرگ اور آپ بھی بزرگ۔ وہ بھی نصیبوں والے اور آپ بھی نصیبوں والے۔" واصل صاحب نے وفور جذبات میں اور بہت کچھ کہا۔ اُن کی یہ فرحت بخش گفتگو میرے لیے اعتماد و افتخار کا سرمایہ بن گئی ہے۔ حزین صاحب کی دوست نوازی کا یہ بھی ایک باب ہے۔

حزین صاحب دل کے مریض تو تھے لیکن ہنس بول کر گزارا کرتے رہتے تھے۔ شعر و شاعری سے دل بہلاتے تھے۔ غزل بھی کہتے تھے، نظم بھی لکھتے تھے۔ آٹھ مجموعے شائع کر چکے تھے۔ کچھ اور مجموعے تیار تھے۔ نثر میں خاصا کام کیا تھا۔ ادبی تنقید کے علاوہ موسیقی کے حوالے سے بھی بڑے اچھے مضامین لکھے تھے۔ لیکن خاص بات یہ تھی کہ وہ معاندانہ ذاتی تنقید برداشت نہیں کرتے تھے۔ جواب ضرور دیتے تھے۔ بڑے سلیقے اور علمی ژرف نگاہی سے جواب دیتے تھے۔ جواب میں برہمی یا درشتی نہیں ہوتی تھی۔ تصوف سے قلبی لگاؤ تھا۔ نقش بندی سلسلے میں باقاعدہ بیعت تھے لیکن ذاتی جھکاؤ چشتیہ سلسلہ کی طرف تھا۔ حضرت سلطان المشائخؒ کی بارگاہ میں بھی حاضری کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

حزین صاحب حزین نہیں تھے۔ ساری زندگی شاداں بھی رہے اور حزین بھی رہے۔ گئے تو خود شاداں گئے۔ دوسروں کو حزین کر گئے۔ ایک دن شوروم میں بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے حلق میں پھندا سا لگا۔ غرغراہٹ کی آواز آئی۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ جا چکے ہیں۔ کیا خوب آدمی تھے۔ ہنستے ہنستے اور "ایمان اللہ" کہتے کہتے چلے گئے۔ مجھے اطلاع ملی تو یقین نہیں آیا۔ ایک دن پہلے ہی اُن سے فون پر حسب معمول بات ہوئی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یوں بے سان و گمان چلے جائیں گے۔ میر صاحب کا مقطع یاد آ گیا۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ میرا خاکہ لکھیں گے۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ مجھے اُن کا خاکہ لکھ کر خاک اڑانا پڑے گی۔

خاک اڑاتا ہوں تو یاد آتا ہے
ہم سفر ہم بھی کبھی تھے دونوں

پنج شنبہ ۲ جون ۲۰۱۱ء
۲۹ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے
(مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں
تبدیل کیا جاتا ہے، ہمارے کتابی سلسلے
کا حصہ بننے کیلئے **وٹس ایپ** پر رابطہ
کریں

حسنین سیالوی

0305-6406067

محمد حسین آزاد:

خواندہ... شنیدہ... فہمیدہ

"یہ اُستاد کے پکھوے سے لگا نیا پکھیرو کون ہے؟ شاید پہلی دفعہ مشاعرے میں آیا ہے۔ بڑا سہما سہما بیٹھا ہے۔ ارے وہی نواب مرزا کی بغل میں۔"

"اچھا، اچھا۔ وہ۔۔۔ تعجب ہے تم نہیں پہچانے۔ اُدھر روشنی بھی کچھ کم ہے۔ بارہا دیکھا ہے تم نے۔ استاد کے یہاں بھی دیکھا ہے۔ اردو اخبار والے مولوی باقر کا بیٹا ہے۔ محمد حسین۔ مدرسے میں پڑھتا ہے۔ استاد کے یہاں کا حاضر باش ہے۔ اُستاد کے ساتھ سایے کی طرح لگا رہتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اب پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ معلوم ہوتا ہے آنکھیں جواب دے گئی ہیں۔"

اتنے میں مشاعرے کا آغاز ہوگیا۔ شمع گردش کرنے لگی۔ نو مشقے 'مبتدی' پڑھنے لگے۔ اعلان ہوا۔ محمد حسین المتخلص بہ آزاد۔ تلمیذِ خاص خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ نوجوان نے ملتجی نظروں سے استاد کی طرف دیکھا۔ استاد نے کہا، "ہاں میاں پڑھو۔" محمد حسین نے غزل شروع کی۔

مشاعرے کا طریقہ راسخہ یہ ہے کہ جب نو مشقے اور مبتدی پڑھتے ہیں تو استادانِ فن چپکے بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ ہاں نہ ناں۔ ایسا ہی اگر کوئی غیر معمولی شعر ہو تو سر ہلاتے ہیں۔ ورنہ منھ میں گھنگھنیاں دیے بیٹھے ہیں۔ اس مشاعرے میں ایک طرف مرزا نوشہ بیٹھے تھے۔ ان کے ایک

طرف جہانگیر آباد والے نواب مصطفی خاں شیفتہ تھے۔ دوسری طرف لوہارو والے نواب ضیاء الدین احمد نیر رخشاں تھے۔ اُن کے سامنے حکیم آغا جان عیش تھے۔ ایک طرف مولانا امام بخش صہبائی اور ان کے تلامذہ تھے۔ حکیم مومن خان مومن کسی خیال میں محو اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ استاد ذوق کا پرا سب سے بڑا تھا۔ اس میں بعض شہزادے اور سلاطین زادے بھی تھے۔ میاں محمد حسین آزاد غزل پڑھتے رہے:

شب نشے میں جو رُخِ یار سے پردا اُٹھا
لطف دُور شبِ مہتاب سے کیا کیا اُٹھا
حرم و دیر میں ہے شورِ قیامت یارب
رُخ سے یہ کس بتِ بیباک کے پردا اٹھا
خلق سے اُٹھ گئے پر سنگِ درِ جاناں سے
روشِ نقشِ قدم پاؤں نہ اپنا اُٹھا
راست رو آتے رہے کج روشوں میں ناکام
بے ثمر سرو ہے گر باغ میں سیدھا اُٹھا
بل بے جذبِ دل مجنوں کہ سوئے نجد آکر
پھر نہ ہرگز قدمِ ناقۂ لیلا اُٹھا
شعر گوئی کا تو دعویٰ نہیں رکھتا آزادؔ
ہاں پر استاد کی خدمت میں ہے بیٹھا اُٹھا

میاں آزاد کی بیس اکیس برس کی عمر، سبزہ آغاز، لباس میں مولویانہ انداز کی جھلک، چوڑا پھیلا ہوا چہرہ، ستواں ناک، روشن آنکھیں، کشمیری خط وخال، گورا رنگ، آواز میں نوجوانی کے زور کی جھلک، بہت ٹھہر ٹھہر کر شعر پڑھتے رہے، ہر شعر پر داد طلب نظروں سے محفل کی طرف دیکھتے، مگر معمولی ہوں ہاں کی آوازیں آتی رہیں۔ مقطعے پر اُن کے استاد بھائیوں نے بڑا غل مچایا۔ استاد خاموش رہے۔ ایک بڑے میاں کہنے لگے، ”بالکل استاد کا سا رنگ ہے۔ ان شاء اللہ ترقی کرو گے۔ اسی طرح کہتے رہو۔“

محمد حسین آزاد استادوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ ہمدان سے کشمیر آئے تھے۔ بعد والوں نے کشمیر سے کشمیری دروازے کا رُخ کیا۔ دلّی میں آباد ہو گئے۔ ان کے دادا مولوی محمد اکبر مکتب پڑھاتے تھے۔ آزاد نے بھی ابتدائی کتابیں انھیں سے پڑھی تھیں۔ ان کی بزرگی اور نیک نفسی کا شہرہ تھا۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر بڑے باصلاحیت، دُور اندیش اور ہوش و گوش کے انسان تھے۔ دلّی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہاں تدریس کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ پھر وہاں سے مستعفی ہو کر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ تحصیل داری تک پہنچے۔ حالاں کہ ملازمت اچھی تھی، تنخواہ بھی بہت معقول، یعنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار جو اُس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی تنخواہ تھی لیکن مولوی باقر اور ان کے والد مولوی محمد اکبر اس ملازمت سے خوش نہیں تھے۔ دونوں انگریزی ملازمت کو غیروں کی غلامی سے تعبیر کرتے تھے۔ چناں چہ مولوی باقر نے ملازمت کے دوران ہی ایک چھاپے خانہ قائم کر دیا۔ اخبار نکالا، اخبار بڑا مقبول ہوا۔ سارے شمالی ہند میں اس کا شہرہ ہو گیا۔ مولوی صاحب کے سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اخبار پر ان کا نام نہیں آتا تھا لیکن سب جانتے تھے کہ اخبار کے کرتا دھرتا وہی ہیں۔ انھیں ایک روشن خیال، بااصول اور مخلص صحافی کی حیثیت سے آج بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔ دراصل مولوی صاحب کو آنے والے دور کے تقاضوں کا احساس ہو گیا تھا۔ اخبار نویسی سے ان کا مدعا عمومی آگہی اور تہذیبی سطح پر رونما ہونے والی اہم تبدیلیوں سے عوام کو آگاہ کرنا تھا۔

مولوی محمد باقر عملی انسان تھے۔ انھوں نے کشمیری دروازے میں مغل طرز کی بڑی سی حویلی تعمیر کروائی تھی۔ ایک حصے میں زنان خانہ تھا، ایک حصے میں پریس اور اخبار کا کاروبار تھا، ایک حصے میں پریس کے عملے اور دوسرے ملازموں کے رہنے کا انتظام تھا۔ مولوی صاحب نے ایک نیلام گھر بھی قائم کیا تھا۔ یہاں پُرانا سامان اور اسباب نیلام ہوتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔

مولوی صاحب بڑے ملنسار اور رسا آدمی تھے۔ بہادر شاہ ظفر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق ان کے ہم مکتب تھے۔ دونوں میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ بھائیوں جیسا سلوک تھا۔ پھر انگریزوں سے بھی صاحب سلامت تھی۔ دلّی کالج کے انگریز پرنسپلوں سے میل

ملاقات تھی۔ دلّی کالج کی ملازمت میں حسن کارکردگی پر انگریز گورنر جنرل ولیم بینٹنگ کے ہاتھوں خلعت بھی حاصل کر چکے تھے اور ایک ذاتی مناقشے میں زخمی بھی ہو چکے تھے۔

روداد اس مناقشے کی کچھ یوں ہے کہ مخالف اور دشمن تو ہر بھلے آدمی کے ہوتے ہیں۔ مولوی محمد باقر کے عروج کو دیکھ کر خار کھانے والے بھی بہت تھے۔ دلّی کالج میں کچھ لوگ اُن کی جان کے لاگو ہو گئے۔ ایک شام جھٹ پٹے کے وقت کسی نے ان کی حویلی کے دروازے پر آواز دی۔ کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔ آواز سن کر مولوی صاحب خود باہر نکلے۔ ڈیوڑھی میں ایک دشمن جاں تاک میں کھڑا تھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پے در پے چھری کے کئی وار کیے اور رفو چکر ہو گیا۔ مولوی صاحب تیورا کر گر پڑے۔ دھماکا سن کر اندر سے کوئی دوڑا آیا۔ مولوی صاحب کو اٹھایا۔ وار کرنے والے نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ علاج معالجے سے مولوی صاحب تن درست ہو گئے۔ وار کرنے والا پکڑا گیا۔ عدالت سے سزا ہو گئی۔

مولوی محمد باقر کو ایک اور مناقشے کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس مناقشے میں ان کے حریف قاری جعفر علی تھے۔ دلّی کے دو امیروں کی چپقلش کی وجہ سے مولوی صاحب اور قاری صاحب دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ جانی دشمنی ہو گئی۔ دلّی کے شیعہ حضرات میں دو گروہ ہو گئے۔ باقری اور جعفری۔ بڑی گندگی اُچھلی۔ ایک دوسرے کے خلاف دل آزار اور توہین آمیز کتابیں لکھی گئیں۔ اشتہار چھپے، فتوے جاری ہوئے۔ بڑا ہنگامہ رہا۔ شہر میں مشہور تھا کہ دونوں کو شاہی دربار کے دو باثر امرا کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اور یہ مناقشہ اُنھیں دو باثر امیروں کی باہمی چپقلش کا نتیجہ ہے۔ ادب و شعر کی دنیا میں بھی اس مناقشے کی گونج نمایاں ہوئی۔ مولوی محمد باقر کے حمایتی تھے استاد ذوق، استادِ شاہ۔ اور مرزا غالب کی راہ و رسم قاری جعفر علی سے تھی۔ بڑی تیز م تازی ہوئی۔ آخر کار وقت کے زبردست ہاتھ نے اس مناقشے کو بھی لپیٹ کر رکھ دیا۔ داستان ہی داستان رہ گئی۔

جس سال مخالفوں نے مولوی محمد باقر کی زندگی کا چراغ گل کرنے کی کوشش کی تھی اُسی سال قدرت نے ان کے کاشانے میں ایک ایسی شمع روشن کر دی جس کی روشنی لازوال ثابت

ہوئی۔ ڈور ڈور تک پہنچی اور دلوں کو منوّر کر گئی۔ اُن کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شاداں و فرحاں دادا نے محمد حسین نام تجویز کیا۔ سب نے دل و جان سے پسند کیا۔ محمد حسین کی والدہ امانی خانم ایک نووارد نجیب الطرفین ایرانی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں لیکن محمد حسین کو جلد ہی ماں کی شفقت سے محروم ہونا پڑا۔ نو عمر بچہ جان چھڑکنے والی ماں کے بغیر بڑا گھبر ایا۔ اُداس اُداس رہنے لگا۔ ہر وقت ماں کا پیارا پیارا چہرہ نظروں کے سامنے رہتا۔ فارسی کے محبت بھرے، شیریں فقرے کانوں میں گونجتے اور رس گھولتے رہتے۔ دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس جان لیوا صدمے میں پھوپی نے سہارا دیا۔ محمد حسین کو پھول پان کی طرح رکھا۔ ہر طرح دل داری کی لیکن کمی کا ایک احساس محمد حسین کی زندگی میں ہمیشہ جاری و ساری رہا۔

اصل میں غضب یہ ہوا کہ کسی نے جوشِ محبت میں بچے کو کفنائی ہوئی ماں کا آخری دیدار کرا دیا۔ بچے نے چیخ ماری اور کہا، "یہ میری امی نہیں ہیں۔ یہ میری امی نہیں ہیں۔" مہینوں وہ روتا اور یہی رٹ لگائے رہتا، "میری امی کو بلاؤ۔ میری امی کو بلاؤ۔" ایسے موقعے پر پھوپھی محمد حسین کو کلیجے سے لگا لیتیں، بھتیجے کے ساتھ خود بھی آنسو بہاتیں۔ محمد حسین پھوپی کو روتے دیکھ کر چپ چاپ آنسو پونچھ لیتے۔ مولوی محمد اکبر نے بھی پوتے کے ساتھ بڑی شفقت برتی۔ ساتھ بٹھاتے، ساتھ کھلاتے۔ تھوڑا بہت پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کیا تا کہ محمد حسین کا دل بہل جائے، دھیان بٹ جائے، دل ٹھہرے اور ماں کے غم میں کمی آ جائے لیکن محمد حسین کے دل میں ماں سے محرومی کی جو گرہ پڑ گئی تھی وہ پڑ گئی۔ ذہن کے نہاں خانے میں یہ پہلا اَن مٹ نقش تھا۔ آگے چل کر ایسے ہی کتنے اَن مٹ نقوش اُبھرے اور ذہن کو کمزور کر گئے۔

دوسرا غضب یہ ہوا کہ امانی خانم کے انتقال کے بعد مولوی محمد باقر نے بہ تقاضائے بشری دلّی کالج کے ایک استاد ماسٹر حسینی کی بہن سے نکاح کر لیا۔ آنے والی نک چڑھی، نخرے پٹی۔ نکاح سے پہلے ہی سن گن لے لی تھی کہ سسرال میں ساس کلیجے کی پھانس تو ہے نہیں، نند گلی کی گند البتہ ہے۔ ہاتھ اختیار بھی اسی کا ہے اُسے زیر کر لینا کیا مشکل ہے۔ چناں چہ اس نیک بخت نے گھونگھٹ اُٹھاتے ہی سب سے پہلے تو نند کو آنند کا سپنا دکھا کر طاق پر بٹھایا، سارا کام خود سنبھال لیا۔ پہلے گھر میں چاندنی کھلی رہتی تھی، اب کتّے لوٹنے لگے۔ گھر کا گھر وا ہو گیا۔ مولوی اکبر یہ سارا

تماشا دیکھتے رہے مگر دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ نند بیچاری آٹھ آٹھ آنسو روتی۔ اپنے آپ کو گھونٹتی رہتی۔ مولوی محمد باقر کو گھر کی بدلی ہوئی حالت کا احساس نہیں ہوا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ مرد جب گھر آتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ گرما گرم کھانا تیار ہے، حقّہ بھرا ہوا ہے، مسہری پر پھول رکھے ہوئے ہیں، بیوی بنی سنوری مہکتی مسکراتی صدقے واری ہونے کو بے قرار ہے تو وہ دنیاومافیہا سے غافل ہو جاتا ہے۔

رہ گئے محمد حسین تو سوتیلی ماں نے آتے ہی انھیں قہر کی نظروں سے دیکھا۔ اُٹھتے بیٹھتے کچوکے دیتی رہتیں، ''ماں یاد آرہی ہوں گی۔ گھر میں دل نہیں لگتا ہوگا۔ ہے تو چھوٹا مگر بلا کا کھوٹا ہے۔'' محمد حسین یہ سب سنتے، کلیجہ مسوس کر رہ جاتے۔ ذہن میں ایک اور گرہ پڑ گئی۔ نفرت کا ایک اور نقش بن گیا۔ اپنی مجبوری کا احساس کچھ اور بڑھ گیا۔ لاکھ پھوپھی دل داری کرتیں مگر محمد حسین کو چین نہیں آتا تھا۔

مولوی اکبر نے پوتے کی مکتبی تعلیم شروع کر دی۔ خالق باری پڑھائی، کریما پڑھایا، مامقیماں پڑھایا، گلستان پڑھی، بوستان پڑھی۔ قدیم نصاب میں اور کچھ ہو نہ ہو یہ خوبی ضرور تھی کہ طالب علم ابتدا ہی سے شعر و ادب کی لذت کو محسوس کرلیتا تھا۔ کریما اور مامقیماں سے ذہن میں شعری آہنگ کا در کھل جاتا تھا۔ گلستان کی چٹخارے دار نثر سے نثر کی ادبیت اور افادیت کا احساس ہوتا تھا۔ بوستان کی دل کش اور زندگی آموز حکایتوں کی شعریت، بچوں کے ذہنوں میں ادبی آہنگ اور شعری افادیت کی جوت جگا دیتی تھی۔ محمد حسین کو ویسے بھی شعر و شاعری اور سعدی کی نثر سے دلچسپی تھی۔ دلچسپی کیا تھی، قدرت نے انھیں غیر معمولی ادبی صلاحیت عطا کی تھی۔ جو پڑھتے، بہت سوچ سمجھ کر پڑھتے اور اُس پر غور کرتے۔ کبھی کبھی باپ بھی اُن کے پڑھنے لکھنے کا جائزہ لیتے اور مطمئن ہو جاتے۔ پھر مولوی اکبر نے انھیں عربی شروع کرادی کہ اُس زمانے کا یہی دستور تھا۔ مگر محمد حسین کو عربی کے مقابلے میں فارسی زیادہ پسند تھی۔ اُن کے بزرگوں اور اُن کے گھر کی زبان تھی۔ آخر کار ایک دن مولوی محمد اکبر بھی انھیں درس دیتے دیتے استادِ ازل کے حضور پہنچ گئے۔ نو عمر محمد حسین کے ذہن میں ایک اور گرہ پڑ گئی۔ شفیق دادا سے انھیں بڑی محبت تھی۔ دیکھتے رہتے کہ وہ فرصت کے اوقات میں ایک قصیدے کی نقلیں

تیار کرتے رہتے تھے۔ اس قصیدے کا تیسرا شعر انھیں بہت پسند تھا۔ اکثر پڑھا کرتے تھے۔ محمد حسین کو بھی یہ قصیدہ یاد ہو گیا تھا۔

شفیق دادا نے ہونہار پوتے کو خوش نویسی بھی سکھائی تھی۔ خوش نویسی اُس زمانے میں جزوِ تعلیم تھی۔ گھر کے پریس کی وجہ سے محمد حسین آزاد کو کاپی لکھنے کی مشق بھی کرائی گئی تھی تا کہ ہاتھ سدھ جائے اور ہنگامی صورتِ حال میں وہ کاتب کا فریضہ بھی انجام دے سکیں۔ محمد حسین نے یہ کام بھی خوشی خوشی سیکھ لیا۔

سوتیلی ماں محمد حسین کو دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹتی رہتیں۔ انھیں بیٹے کی بڑی تمنا تھی۔ نجانے کیسے کیسے تعویذ گنڈے کیے، منتیں، مرادیں مانیں، دلّی کی ہر درگاہ میں حاضر ہوئیں، سیانوں سے جھاڑ پھونک کرائی، چپکے چپکے حکیموں کو بھی دکھایا مگر گود ہری ہونا تھی نہ ہری ہوئی۔ دن رات کے جلاپے نے اندر ہی اندر گھلا دیا اور آخر کار اسی جلاپے میں ایک دن وہ ناشاد و نامراد نگوڑی ناٹھی دنیا سے چلی گئیں۔ محمد حسین کے ذہن میں مرگ زیست کے بے وقت انتشار نے ایک اور گرہ ڈال دی۔

کچھ دن کے بعد مولوی صاحب نے اپنی ایک خانہ زاد سے نکاح کر لیا۔ یہ گھر کی پروردہ دبی پچی بیوی تھیں۔ نند کی مطیع اور فرماں بردار بن کر رہیں۔ اولاد کی تمنا انھیں بھی تھی مگر یہ محمد حسین سے کھنساتی نہیں تھیں، خیال کرتی تھیں۔ لیکن محمد حسین باندی کو بیگم بنتے دیکھ کر کچھ اور اُداس ہو گئے۔ اُن کی ماں تو وہی امانی خانم تھیں۔ انھیں کا دھیان رہتا تھا۔ انھیں کی یاد میں دل تڑپتا تھا یا پھر پھوپی تھیں۔ اللہ آمین کرنے اور جان چھڑکنے والی۔ محمد حسین کے لیے گھر کے معنی تھے پھوپی جان۔

مولوی محمد باقر اور استاد ذوق میں برادرانہ تعلقات تھے۔ استاد مولوی صاحب پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ ان کا کلام مولوی صاحب ہی کے یہاں جمع ہوتا تھا اور انھیں کے اخبار میں گاہے گاہے شایع بھی ہوتا تھا۔ میاں محمد حسین باپ کے ساتھ کبھی کبھی استاد کے یہاں جایا کرتے تھے۔ ایک دن استاد نے نوعمر محمد حسین آزاد کی آنکھوں میں تنہائی اور یتیمی کے کرب کو محسوس کر لیا۔ استاد تھے، فن کار تھے، انسان شناس تھے، جذباتِ انسانی کو خوب سمجھتے تھے۔ اُسی دن سے

استاد کے برتاؤ میں غیر معمولی شفقت پیدا ہو گئی۔ شفیق تو وہ پہلے بھی تھے، اب حد سے زیادہ شفیق ہو گئے۔ اپنے بیٹے میاں اسمٰعیل کی طرح چاہنے لگے۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ محمد حسین بھی استاد کے بندۂ بے دام ہو گئے۔

مولوی محمد باقر کو آنے والے دور کے تقاضوں کا پورا احساس تھا۔ انھوں نے دلّی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں معلّمی کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ محمد حسین کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہو گئی تھی۔ مولوی صاحب نے انھیں کالج کی عربی جماعت میں داخل کرا دیا۔

کالج کیا تھا، ایک نئی دنیا تھی۔ مشرق و مغرب کا سنگم۔ مغرب کو بالادستی حاصل ہو رہی تھی۔ مشرق بے چارہ، پس ماندہ اپنی روایت کی زورازوری سے مقابلہ تو کر رہا تھا لیکن بے دلی سے۔ کالج کے استادوں میں انگریز مستشرقین بھی تھے، مسلمان عالم بھی تھے، ہندو پنڈت بھی تھے۔ استادوں کی ایک کہکشاں تھی۔ سارے استاد اپنے اپنے فن میں طاق۔ طلبہ بھی ذہانت اور صلاحیت میں براق۔ نذیر احمد تھے جو بعد میں شمس العلماڈپٹی نذیر احمد ہوئے۔ یہ عربی جماعت میں محمد حسین کے ساتھ تھے۔ مولوی ذکاء اللہ تھے جو بعد میں خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ ہوئے اور محمد حسین کے ساتھ ساری زندگی بھائیوں کی طرح رہے۔ خواجہ ضیاء الدین تھے۔ بعد میں وہ بھی شمس العلما ہوئے۔

کالج میں محمد حسین کے جوہر خوب کھلے۔ محنتی تھے، مستعد تھے، علم حاصل کرنے میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ گھر کے اخبار اور استاد ذوق کے یہاں حاضر باشی نے ذہن کو اور زیادہ روشن کر دیا تھا۔ کالج میں مضمون نویسی کا سالانہ مقابلہ ہوتا تھا۔ محمد حسین کو اس مقابلے میں دو بار انعام ملا۔ انھیں لڑکپن ہی سے اہل وطن کی تعلیم و تربیت کا خیال تھا۔ حصولِ علم میں ان کی مستعدی اور شوق کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نئے اور اعلیٰ خیالات ملک میں پھیلائے جائیں۔ گھر کے اخبار سے یہ خدمت شروع ہو چکی تھی۔ کالج میں بھی اسی کا خیال رہا۔

ایک بار ایک انگریز ماہر تعلیم ڈاکٹر موویٹ کالج کے معائنے کے لیے آئے۔ ڈاکٹر موویٹ کی ایک عمدہ یادگار، ان کی کتاب "معین الجراحین" ہے جو علم الابدان کا توضیحی اور تشریحی اٹلس ہے۔ اعضائے انسانی کی تصویریں اور نقشے آج کے اٹلسوں سے پہلو مارتے نظر آتے ہیں۔ ایک

صفحے پر اردو میں تشریح، مقابل کے صفحے پر انگریزی میں تشریح۔ اردو درسیات میں ایک سنگِ میل۔ ڈاکٹر موویٹ نے کالج کے معائنے میں طلبہ سے سوالات بھی کیے۔ محمد حسین سے پوچھا، "تم تعلیم سے فارغ ہو کر کیا کروگے؟" انھوں نے کہا، "میں تحصیل علوم کروں گا اور جو خیالات ہیں اور ہوں گے، انھیں اپنے اہل وطن میں پھیلاؤں گا۔"

یہ سب باتیں تو اپنی جگہ صحیح تھیں مگر ایک گڑبڑ بھی ہوئی۔ کالج میں شیعہ دینیات کے استاد تھے، قاری جعفر علی۔ مولوی محمد باقر کے پرانے حریف۔ محمد حسین اکثر اُن کے کلاس میں ایسے سوال اُٹھاتے کہ قاری صاحب کو جواب دیتے بن نہیں پڑتی تھی۔ کلاس میں کھینچا تانی کی فضا قائم ہو جاتی تھی۔ روز روز کی اس تھکا فضیحتی سے تنگ آکر قاری صاحب نے محمد حسین کو اپنی کلاس میں آنے سے منع کر دیا۔

اب کیا ہو؟ دینیات کے نصاب کی تکمیل کیسے ہو؟ سنّی دینیات کے استاد دلّی کے مشہور عالم سیّد محمد دہلوی تھے۔ انھوں نے ایک دن محمد حسین کو بلایا۔ کہنے لگے، "ہم نے سُنا ہے تم تقریر بہت عمدہ کرتے ہو۔ ذرا ہمارے سامنے تو اپنے خیالات کا اظہار کرو۔" محمد حسین نے تقریر کی۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ بولے، "ہم سے پڑھنا ہو تو ہماری جماعت میں آجاؤ۔" پرنسپل نے بھی اس تبدیلی کی اجازت دے دی۔ محمد حسین خوشی خوشی سنّی دینیات کی جماعت میں شریک ہو گئے اور نصاب کی تکمیل کر لی۔ اس طرح انھیں مسلمانوں کے دو بڑے اہم فرقوں کی بنیادی معلومات حاصل ہو گئیں۔ قاری صاحب کی چیرہ دستی سے ذہن میں جو گرہ پڑنا شروع ہو گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔

یہ بڑی مصروفیت اور ریاضت کا دور تھا۔ ذہنی تشکیل اور زندگی کے شعور سے بھرپور شناسائی کا دور تھا۔ صحافت، شعر و ادب اور علمی دید و دریافت کا دور تھا۔ محمد حسین ایک طرف کالج کی پڑھائی میں مصروف رہے۔ دوسری طرف چھاپے خانے کے انتظام اور اخبار کی مصروفیت اور تیسری طرف استاد ذوق کے یہاں کی حاضر باشی۔ ہر طرف مصروفیت، محنت اور مستعدی۔ چھاپے خانے میں چھپنے والی کتابوں پر ان کا نام آنے لگا۔ اخبار پر بھی مہتمم کی حیثیت سے نام شایع ہونا شروع ہو گیا۔ رہ گئے استاد ذوق تو محمد حسین کو اُن سے سچ مچ عشق تھا۔ جُھٹے اور پہنچے۔ استاد بھی

غیر معمولی شفقت فرماتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ ماں کی محبت سے محروم بچہ ہے۔ باپ کو دم مارنے کی فرصت نہیں۔ اُن کا بھی یہ حال کہ کالج کی چھٹی کا پورا دن استاد کے یہاں گزارتے۔ صبح سات آٹھ بجے پہنچ جاتے۔ استاد اُس وقت بیت الخلا میں ہوتے۔ پاؤں کی چاپ پہنچاتے تھے۔ وہیں سے آواز دیتے، "تم ہو۔" پھر ہنستے ہوئے باہر آتے۔ "ہاں تو میاں محمد حسین اُس دن تم نے ہمارا وہ شعر پڑھا تھا۔ یاد ہے۔ اچھا تو اب اُسے یوں بنالو۔" ایک دن اسی طرح ہنستے ہوئے برآمد ہوئے۔ بولے، "میاں محمد حسین! آج تینتیس برس کے بعد اصلاح دینی آئی ہے۔" حافظ ویران استاد کے شاگرد خاص بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے پوچھا۔ "حضرت کیوں کر۔" استاد بولے، "ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا:

کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ

ابتدائی مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے۔ جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔" محمد حسین نے عرض کی۔ "حضرت پھر کیا فرمایا۔" استاد بولے۔ "کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ۔ کمر کو اوپر ڈال دو۔" محمد حسین نے پھر عرض کی، "پھر وہ کیوں کر۔" استاد نے کہا، "تین چار مصرعے اُلٹ پلٹ کیے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے:

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے پیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

استاد کی بارگاہ اُس عہد کا ایک ایسا دبستانِ شعر و ادب تھا جس سے استفادہ کرنے والے ادبی اور فنی نکات سیکھتے تھے۔ شعر کے حسن و قبح سے آگاہ ہوتے تھے۔ خیال، جذبے، تجربے اور زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں کی پہچان کرتے تھے۔ استاد بالعموم اپنے چھوٹے سے گھر کی چھوٹی سی انگنائی میں گھر ّی چارپائی پر بیٹھے حقّہ گڑگڑاتے رہتے تھے۔ کتاب دیکھتے رہتے تھے، اشعار لکھتے رہتے تھے، شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے رہتے تھے۔ شام کو گھر سے باہر تیس ہزاری باغ یا نہر کے کنارے گھنٹوں ٹہلتے رہتے تھے۔ محمد حسین اکثر ساتھ ہوتے۔ ایک شام اسی طرح استاد کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ استاد غزل کہتے جاتے تھے۔ اچانک انھوں نے کہا، "میاں محمد حسین تم

بھی تو کچھ کہو۔" محمد حسین نے کہا، "جی قبلہ کیا عرض کروں۔" استاد بولے، "کچھ ہوں ہاں۔ کچھ غوں غاں۔ اسی طرح کہنا آتا ہے۔" محمد حسین نے ہمت کر کے مصرع پڑھا:

سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

استاد نے خوش ہو کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ دیکھو شعر یوں ہوا:

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

استاد کی صورت میں میاں محمد حسین کو ایک مرکز مل گیا تھا۔ بس دو ہی کام تھے۔ کالج کی پڑھائی اور استاد کے کلام کی چٹیک۔ دن رات یہی جستجو، جس کسی سے استاد کا کوئی شعر سنا، کتابِ یادداشت میں ٹانک لیا اور استاد سے تصحیح چاہی۔ ایک دن ان کے چھاپے خانے میں تذکرہ ہوا کہ رات استاد کے ملازم نے سورج مکھی پر شعر پڑھے۔ بڈھا تھا مگر غضب کے شعر پڑھے۔ دوسرے دن انھوں نے پوچھا، "محمد بخش۔ سورج مکھی پر کیا شعر پڑھے تھے۔" وہ ٹکر گیا۔ بڑی مشکل سے قبولا۔ پھر بولا۔ بچوں کے سامنے شعر نہیں پڑھتے۔ بڑی خوشامد درآمد سے یہ مطلع پڑھا۔

ماتھے پہ ترے جھمکے ہے جھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

میاں محمد حسین نے یہ مطلع استاد کو سنایا۔ بولے، "اوہو۔ ہو۔ تمھیں کہاں سے ملا۔ بڑا پرانا کلام ہے۔" ایسے بے شمار اشعار میاں محمد حسین نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور استاد کو سنائے۔ استاد کلام جمع کرنے کے معاملے میں بے پروا تھے۔ غزلوں اور قصیدوں کے کاغذ تھیلیوں میں بھر کے رکھ دیے جاتے یا میاں محمد حسین کے والد کے سپرد کر دیے جاتے۔ مولوی محمد باقر اور استاد میں صلاح مشورے بھی ہوتے رہتے۔ دیوان کس طرح مرتب ہو، کون کون سے حروف میں غزلیں نہیں ہیں، ان میں کچھ کہہ لیا جائے۔ باتیں بہت ہوتیں لیکن نہ استاد کو فرصت تھی اور نہ مولوی محمد باقر کو۔ میاں محمد حسین سب کچھ غور سے سنتے اور گرہ میں باندھ لیتے۔ استاد کو بھی ان کی فنی اور شعری صلاحیت پر بھروسا ہو چلا تھا۔ کچھ کہتے تو انھیں بھی سناتے۔ اپنے فن پر اظہارِ خیال کرتے۔ اشعار کی تراش خراش پر گفتگو کرتے اور رموز و نکات سمجھاتے۔ ایک دن

بادشاہ کے غسل صحت کے جشن کے لیے قصیدہ کہہ رہے تھے:

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو خامۂ تحریر نغمہ جائے صریر

کہنے لگے حافظ کا یہ شعر بھی اس میں تضمین کریں گے:

مئے دو سالہ و معشوق چہاردہ سالہ
مرا ہمیں ست بس ایں صحبت صغیر و کبیر

پھر جب قصیدے میں یہ قطعہ لکھا تو سنایا:

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدر منیر
اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

پھر محمد حسین کی طرف دیکھ کر کہا، "اب بھئی وہ شعر۔" محمد حسین نے کہا، "اب کیا ضرورت رہی۔" استاد نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، پھر کہا، "یہ اُدھر ہی کا فیضان ہے۔"

اس قصیدے میں جب استاد نے یہ شعر پڑھا:

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست بے زنجیر

تو محمد حسین نے بے اختیار ہو کر کہا، "سبحان اللہ، یہ رنگینی اور یہ زور، ظہوری کا ساقی نامہ مات ہو گیا۔"

استاد چپ رہے پھر کہا، "اس میں زور آتا جاتا ہے، میں گھلا جاتا ہوں۔"

استاد کے یہاں جو معاصر شعرا، ادیب اور عالم آتے، میاں محمد حسین ان کی باتیں بھی بڑے غور سے سنتے۔ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ شعر خوانی بھی ہوتی تھی۔ استاد اور اپنے والد کے ساتھ ایک آدھ مشاعرے میں بھی گئے۔ پھر مشاعرے میں غزلیں بھی پڑھنے لگے۔ آزاد

تخلص قرار پایا۔ تلمیذِ خاص خاقانی ہند حضرتِ ذوق ہو گئے۔ استاد کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ انھیں کے رنگ میں کہتے تھے اور انھیں کے تلمذ سے پہچانے جاتے تھے۔

آزاد کی استاد پرستی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اگر کوئی شخص استاد کے کلام پر اعتراض کرتا تو وہ فوراً منھ توڑ جواب دیتے۔ استاد کے خلاف کچھ نہیں سن سکتے تھے۔

وقت اچھا گزر رہا تھا۔ استاد کی شفقت نے باپ کی مصروفیت اور بے توجہی کو بھلا دیا تھا۔ ذہن میں بچپن سے جو گرہیں پڑی ہوئی تھیں ان کے اثرات آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے تھے۔ کالج کی پڑھائی بھی ختم پر آ گئی تھی۔ دہلی اردو اخبار کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ شہر کے نوجوان اور باصلاحیت سخن وروں میں ان کا بھی شمار ہونے لگا تھا۔ لیکن وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ استاد بیمار پڑے اور ایسے بیمار پڑے کہ ہاتھوں میں آ گئے۔ جس رات کی صبح ان کا انتقال ہوا، اس رات کو سرِ شام آزاد بھی استاد کے پائنتی موجود تھے۔ انتقال سے تین گھنٹے پہلے شعر کہا تھا:

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

آزاد کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی، مرنا سب کو ہے مگر آزاد، استاد کے اس قدر جلد اُٹھ جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے لیے استاد، استاد بھی تھے، باپ بھی تھے، شفیق و ہمدم بھی تھے، سب کچھ تھے۔ استاد کے گزر جانے سے آزاد کا احساسِ تنہائی کچھ اور بڑھ گیا۔ پرانی گرہیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ ایک نئی گرہ اور اُبھر آئی۔

باپ نے بیٹے کو گم صم دیکھ کر کچھ دن غور و فکر میں گزارے۔ پھر وہی تدبیر کی جو بزرگ کرتے چلے آئے ہیں۔ آزاد کی شادی کر دی۔ کوچہ ٔ نثواں میں ایک ایرانی النسل خاندان تھا۔ اسی خاندان کے مرزا محمد علی کی بیٹی آغائی بیگم سے شادی ہو گئی۔ آزاد کا احساسِ تنہائی کچھ کم ہوا۔ لیکن یہ زمانہ ایسا نہیں تھا کہ آدمی گھر گھسنا ہو کر رہ جائے۔ آزاد اخبار اور چھاپے خانے کا کام بھی دیکھتے، اخبار کے لیے مضمون بھی لکھتے، لوگوں سے بھی ملتے جلتے، مشاعروں میں بھی جاتے مگر استاد کی یاد بے قرار رکھتی۔ جدھر سے گزرتے استاد کی رفاقت اور شفقت یاد آتی۔ استاد کے اکلوتے بیٹے وقارالدولہ محمد اسماعیل فوق کے ساتھ مل کر استاد کا دیوان مرتب کرنے کا کام شروع کیا۔ یہ کام

آہستہ آہستہ جاری رہا۔ استاد کے فیضِ صحبت کے باوجود آزاد اپنے کلام سے مطمئن نہیں تھے۔ چناں چہ دلّی کے ایک استاد حکیم آغا جان عیش کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ یہ وہی حکیم آغا جان عیش تھے جنھوں نے ایک مشاعرے میں غالب کے روبرو اپنی غزل میں یہ قطعہ پڑھا تھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

خیر سے دو بیٹیاں بھی ہو گئی تھیں۔ دل کے بہلانے کے لیے یہ کھلونے بہت تھے مگر پھر بھی ذہن میں جو گرہیں تھیں، جو خلش تھی وہ برقرار رہی۔ کبھی کبھی کلیجے میں ایک ہوک اُٹھتی اور آزاد تڑپ جاتے۔

تاریخ نے نیا ورق اُلٹا۔ دس مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں ہندوستانی فوجی، انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گیارہ مئی کو دلّی میں بھی ان کا عمل دخل ہو گیا۔ چار پانچ مہینے تک ہندوستانی فوجیوں کی افراتفری رہی پھر انگریزوں نے اہلِ دہلی کی دنیا تہہ و بالا کر دی۔

آزاد اس سارے عرصے میں اردو اخبار کو سنبھالے رہے۔ شہر کا حال احوال لکھتے رہے۔ انگریزوں کے خلاف مضامین لکھتے رہے۔ نثر بھی لکھی، نظم بھی لکھی لیکن ان کے والد شاہ پرست ہونے کی وجہ سے آزادی کی جدوجہد میں بڑے سرگرم رہے۔ مجتہد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے انگریزوں سے جہاد کرنے کے فتوے پر دستخط بھی کیے۔ بہادر شاہ کے حکم سے انگریز فوجیوں کا مقابلہ بھی کیا۔ ان کی حویلی فرنگی حکومت کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کا بڑا مرکز بن گئی تھی۔ لوگ آرہے ہیں، جا رہے ہیں، فوجی تیاریوں اور کارروائیوں کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ شروع کے دنوں میں انھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی۔ ٹیلر اُن کا پُرانا دوست اور مربّی تھا لیکن بات چھپ نہ سکی اور ٹیلر کو جان بچانے کے لیے مقامی لباس پہن کر باہر نکلنا پڑا۔ لوگ تاک میں تھے۔ اِدھر ٹیلر مولوی باقر کی حویلی سے باہر نکلا اور اُدھر گھات میں بیٹھے ہوئے حملہ آوروں نے اُسے ہلاک کر دیا۔ بعد میں اس قتل کی بڑی عجیب

داستانیں مرتّب ہو گئیں۔ ہو نٹوں نکلی کو ٹھوں چڑھی۔ کہنے والوں کی زبان کو کون روک سکتا ہے؟ مولوی صاحب نے اخبار کا نام بھی بدل کر "اخبار الظفر" کر دیا تھا۔

مقامی لوگوں میں نہ کوئی تنظیم تھی، نہ اتحاد تھا، نہ ایک دوسرے پر اعتبار تھا۔ سارا کام توکّل پر چل رہا تھا۔ مگر توکّل کے لیے بھی 'پائے اُشتر را بہ بند" کی ہدایت ہے۔ انگریز باہر سے بھی بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے اور اندرونِ شہر بھی ان کے جاسوس چھوٹے ہوئے تھے جو پل پل کی خبریں انھیں پہنچا رہے تھے۔ ان میں خاص الخاص مولوی رجب علی تھے جو بعد میں ارسطو جاہ کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔ دلّی کے خبر تراشوں کا یہ کہنا تھا کہ اندرونِ شہر اسلحہ کے میگزین کو اُڑانے کا کام انھیں کی کوشش سے ہوا تھا۔ اس دھماکے میں بے شمار دلّی والے زخمی بھی ہوئے اور مارے بھی گئے۔ مولوی رجب علی، مولوی محمد اکبر کے شاگرد تھے۔ دلّی کالج میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں معلّم بھی رہے تھے۔ مولوی محمد باقر سے ان کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے۔ لیکن دونوں کی راہیں بظاہر الگ تھیں۔

مولوی محمد باقر، شاہ پرست مشہور تھے۔ رجب علی انگریز پرست۔ غدر کے دوران انگریزوں کو اندرونِ دہلی کا سارا احوال خفیہ طور پر لکھ کر بھیجتے رہتے تھے۔ دلّی میں ایک مولوی رجب علی ہی انگریزوں کے جاسوس نہیں تھے، سارا قلعہ معلی جاسوسی میں ماخوذ تھا۔ عہدِ حاضر کے ایک انگریز موٴرّخ ولیم ڈیل رمپل (William Dalryample) نے مولوی محمد باقر پر بھی انگریزوں کے جاسوس ہونے کا الزام عاید کیا ہے۔ ڈیل رمپل کے مطابق مولوی محمد باقر نے ایک خط میں انگریزوں کو یہ اطلاع دی تھی کہ انھوں نے بہادر شاہ کو مشورہ دیا تھا کہ شہر کے دروازے کھول دیے جائیں اور انگریز فوج کو آزادانہ شہر میں داخل ہونے دیا جائے۔ بہادر شاہ نے اس مشورے کو قبول کر لیا تھا لیکن حکیم احسن اللہ خاں نے اس پر عمل نہیں ہونے دیا کیوں کہ وہ سنّی مسلمان ہیں اور میں شیعہ ہوں۔ خدا معلوم کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اس کا فیصلہ موٴرّخوں اور محققوں کا کام ہے۔ صرف یہ بات صحیح ہے کہ جاسوسی سے مولوی محمد باقر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور شاہ پرستی نے انھیں برباد کر دیا۔

اِدھر انگریز دلّی میں داخل ہوئے اور اُدھر قتلِ عام شروع ہو گیا۔ سارے معروف انگریز

دشمن مارے گئے۔ مولوی محمد باقر بھی انگریزی فوج کا نشانہ بن گئے۔ سچ یہ ہے کہ آزادیٔ وطن کی راہ میں شہید ہو گئے۔

مولوی رجب علی مولوی محمد باقر کو بچا نہیں سکے۔ وہ انگریزوں میں بہت با اثر تھے لیکن جوشِ انتقام کے سامنے اثر، سعی، سفارش، کچھ کام نہیں آتا۔ اس گیر و دار میں مولوی رجب علی نے بہتوں کی مدد کی لیکن وہ مولوی محمد باقر کی دست گیری نہ کر سکے۔ آزاد پر جو کچھ گزری ہو گی اُس کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ اُن کی زندگی کی سب سے بڑی گرہ تھی۔ سائبان سر سے اُٹھ گیا۔ بے سہارا ہو گئے۔ مرنا بر حق، مرنا سب کو ہے۔ مگر ایسی موت۔ خدا دشمن کو بھی ایسی موت نہ دے۔

اِدھر تو یہ سانحہ۔ اُدھر فتح یاب لشکر کے سپاہی میاں محمد حسین کی حویلی میں درآئے۔ بندوقیں چھیتالیں۔ "نکلو جلدی نکلو ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ سجے سجائے مکان کے در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالی۔ کیا اُٹھائیں، کیا چھوڑیں۔ اُدھر فوجیوں کی للکار، اُدھر اضطرار، سامنے اُستاد کی غزلوں کا جُنگ رکھا تھا۔ وہی اُٹھا کر بغل میں مارا۔ خیال آیا کہ محمد حسین زندگی ہے تو سب کچھ مل جائے گا مگر استاد کہاں سے زندہ ہوں گے جو اپنے کلام کو مرتب کریں۔ بائیس نیم جانوں، استاد کے کلام کے جُنگ اور اللہ کا نام ساتھ لے کر حویلی سے نکل کھڑے ہوئے۔

سارے شہر میں قیامت برپا تھی۔ تلے تیس اوپر بیس مچی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ سب بھاگ رہے تھے۔ امیر امرا جنھیں محافظ میسر تھے، اپنے اپنے ٹھکانوں میں بیٹھے جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ غریب غربا لوٹ مار کے ڈر سے جان بچا کر سر ہتھیلی پر رکھے مختلف سمتوں میں رواں دواں تھے۔ میاں محمد حسین بھی اپنے قافلے کے ساتھ برف خانے کے قریب ایک جگہ بیٹھ گئے۔ پتھر پر چٹنی پسی۔ پتھروں کے چولھے پر کچی پکی روٹیاں تیار ہوئیں۔ جیسے تیسے حلق سے اُتار لی گئیں۔

یہ قافلہ یہاں دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ توپ کا ایک گولہ بالکل پاس آکر گرا۔ بڑا زوردار دھماکا ہوا۔ عورتیں حواس باختہ ہو کر چیخنے لگیں۔ میاں محمد حسین کی چھوٹی بچی کو سکتہ سا ہو گیا۔

ہاتھوں میں آگئی۔ اسی دھماکے کی نذر ہو گئی۔ یہ بھی ذہنی گرہوں میں ایک اور اضافہ تھا۔

مولوی رجب علی، مولوی باقر اور ان کی حویلی کو تو نہیں بچا سکے لیکن انھوں نے ایک معتبر آدمی کے ذریعے میاں محمد حسین کو پیغام بھجوایا کہ ایک سکھ فوجی افسر کے یہاں پناہ کی خاطر چلے جاؤ۔ قاصد نے انھیں اور ان کے کنبے کو سکھ فوجی افسر کے یہاں پہنچا بھی دیا۔ وہاں ایک اصطبل میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ پھر مولوی رجب علی نے اطلاع بھجوائی کہ اہل و عیال کو سونی پت روانہ کر دو۔ تمھارے منشی کا گھر وہیں ہے، وہاں سب حفاظت اور اطمینان سے رہیں گے۔ سونی پت دلّی اور پانی پت کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ محمد حسین کا کنبہ اُفتاں خیزاں سونی پت روانہ ہو گیا۔ خود ان کے لیے مولوی رجب علی نے یہ پیغام بھجوایا کہ تم بھی دلّی سے کوچ کرو۔ تمھاری گرفتاری کی بھی تجویز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وارنٹ نکل جائے۔ مناسب یہ ہے کہ تم سیدھے لکھنؤ چلے جاؤ۔ میرے دونوں بیٹے وہیں موجود ہیں۔ وہ تمھاری نگہداشت کریں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ محمد حسین آزاد نے لکھنؤ کی راہ لی۔ دلّی چھوٹ گئی۔ ''شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا۔''

ہول جول اور افراتفری کے اس زمانے میں دلّی اور لکھنؤ تک کا پاپیادہ سفر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، پتّا کھڑکا، بندہ بھڑکا۔ تن بہ تقدیر، جان ہتھیلی پر لیے، فراق و مجبوری کے مارے، اللہ کے سہارے، سفر جاری رہا۔ آزاد لکھنؤ پہنچ گئے۔ مولوی رجب علی کے بیٹوں کی پناہ میں آگئے۔ یہ دونوں صاحب زادے لکھنؤ میں وہی خدمت انجام دے رہے تھے جو ان کے والد نے دلّی میں انجام دی تھی۔

محاذ لکھنؤ میں بھی کھلا ہوا تھا مگر دلّی والی ابتری نہیں تھی۔ مولوی رجب علی کے بیٹوں نے آزاد کی بڑی دلداری کی۔ اُن کے ادبی شغف اور شعری دلچسپی کے پیش نظر انھیں لکھنؤ کے شاعروں سے ملوایا۔ میر تقی میر کے بیٹے میر کلّو عرش کے یہاں لے گئے۔ عرش شاعر تو بس واجبی ہی واجبی سے تھے مگر بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ سارا شہر اُن کا احترام کرتا تھا۔ ان کا یہ شعر مشہور تھا:

آسیہ کہتی ہے ہر صبح بہ آواز بلند
رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کے

ملاقات ہوئی تو آزاد چپکے بیٹھے رہے۔ کیا کہتے۔ کیوں کر کہتے کہ "اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں" عرش نے اس ملاقات میں ایک قطعہ بھی لکھ کر مولوی رجب علی کے صاحب زادے کو پیش کیا:

سیّد عالی نسب والا حسب
نام میں اسمِ امیرالمومنیں
رُخ سے روشن ہے چراغِ آفتاب
حکم میں ہے آسماں زیرِ زمیں
تجھ کو بھی کونین پر ہے اختیار
جدِّ اقدس مالکِ دنیا و دیں
تھے علیؓ جیسے سخی مشہورِ خلق
آپ سا بھی اہل ہمت اب نہیں
ہمت عالی کرے گی کامیاب
عرش ہے از بس پریشان و حزیں

سیّد حسن عسکری عرف میر کلو تخلص عرش ولد میر محمد تقی میر ملک الشعرائے ہندوستان۔ "امیدوار پرورش" عرش نے "امیدوار پرورش" لکھ کر حسن طلب کے بجائے شاعرانہ دریوزہ گری کا اظہار کیا ہے۔

آزاد نے سودا کے پس ماندگان کی جستجو بھی کی۔ جو صاحب ملے وہ مفلوک الحال تھے، غالباً یکّہ چلاتے تھے۔ مولوی رجب علی کے صاحب زادے انھیں میر انیس کے یہاں بھی لے گئے۔ یہاں بھی آزاد بجھے بجھے سے بیٹھے رہے۔ پتانشان کیا بتاتے۔ غریب الوطن بے سہارا انسان تھے۔ گفتگو میں بادلِ نخواستہ شریک ہو گئے۔ "تا مرد سخن، نگفتہ باشد" کا سبق یاد تھا اس لیے بات چیت کرنے لگے۔ باتوں میں انھوں نے اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کا یہ مطلع پڑھا:

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
و لیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

میر انیس نے دریافت کیا، "یہ شعر کس کا ہے؟" آزاد نے کہا، "استاد ذوق کا۔" ذہنی اور روحانی خلفشار کے اس دور میں بھی آزاد نے شعر پڑھا تو استاد کا۔

لکھنؤ میں آزاد کا قیام اُن کی زندگی کا بڑا بھیانک واقعہ تھا۔ بیوی، بچی اور پھوپھی کی یاد آتی تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتے۔ حویلی، پریس، اخبار دن رات نظروں میں گردش کرتے رہتے۔ باپ کی حسرت ناک موت کا خیال آتا تو دل میں ہوک سی اُٹھتی۔ اپنی مجبوری، بے بسی اور بے یقینی کی کیفیت ہر وقت تڑپاتی رہتی۔ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں گم رہتے۔ مولوی رجب علی کے صاحب زادے ان کا بڑا خیال کرتے لیکن دل تھا کہ اندر ہی اندر گھلا جا رہا تھا۔ فکروں، پریشانیوں اور ذہنی گرہوں کی وجہ سے آزاد بہت جھک گئے تھے۔ چہرے پر افسردگی کی لہریں اُبھر آئی تھیں۔ کہاں کے آزاد۔ کہاں کی آزادی "ظاہر میں تو آزادی تھی باطن میں گرفتاری۔"

ہر طلوع ہونے والی صبح بے نور نظر آتی۔ اَن جانے خوف اور تذبذب کی پیغام بر ہوتی۔ ہر آنے والی رات، "رات گزرے گی کس خرابی سے" پڑھتی ہوئی آتی۔ آخر کار مارچ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے لکھنؤ فتح کر لیا۔ آزاد کے لیے جاں کنی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔ خاموشی سے بے یقینی، وسواس اور خوف کی سختیوں کو جھیلتے رہتے۔ اُستاد کا مطلع پڑھتے رہتے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اور آنسو بھری آنکھوں سے آسمان کو تکتے رہتے۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں دربار کیا۔ ملکہ وکٹوریا کی طرف سے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ کمپنی بہادر کی حکومت ختم ہوئی۔ ملکہ کی حکم رانی کا دور شروع ہوا۔ معافی سب کے لیے تھی۔ آزاد کو اعلان کی خبر ملی تو سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ امید بندھی کہ اب خیر سے دلّی جانا ہو گا۔ نئے سرے سے زندگی کی جدوجہد شروع ہو گی۔ سر چھپانے کا ٹھکانا ڈھونڈنا پڑے گا۔ روزگار تلاش کرنا ہو گا۔ دیکھیے کیا گزرتی ہے کیسی پڑتی ہے۔

آزاد اسی فکر میں تھے کہ مولوی رجب علی کے صاحب زادے نے مژدہ سنایا کہ "مبارک ہو، آپ کے روزگار کا بندوبست ہو گیا ہے۔ فی الحال دلّی جانا آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔

سکّھوں کی ایک ریاست ہے، جند۔ وہاں کی راہ لیجیے اور ملازمت شروع کر دیجیے۔ اباجان نے سارا انتظام کر دیا ہے۔ خیر سے جایئے۔ اللہ حافظ و ناصر۔"

آزاد جند جانے کے حق میں نہیں تھے۔ سکّھوں کی ریاست۔ اَن جانا ماحول، اجنبی فضا، ریاستی سازشیں۔ ایک اور ہجرت۔ لیکن فقیروں کو انتخاب کا حق نہیں ہوتا۔ کیا کرتے اور کیا کہتے۔ اللہ کا نام لیا۔ لکھنؤ کو خیر باد کہا، دلّی کو یاد کرتے ہوئے:

خاک دِہلی سے جدا ہم کو کیا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

پڑھتے ہوئے جند چلے گئے۔ فروری ۱۸۵۹ء میں محافظ دفتر فوج داری مقرر ہو گئے۔ روز گار سے لگ گئے۔

آزاد نے جند میں دس مہینے کی ملازمت کا دور صحن باغ سے دُور بلبل شکستہ پر کی طرح گزارا۔ دلّی تو ان کے لیے ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ لکھنؤ غنیمت تھا۔ ہم صورت دوچار نظر آجاتے تھے۔ جند میں اجنبی چہرے اور نامہربان خلقت چاروں طرف نظر آتی۔ کرخت لہجے، درشت انداز، نامانوس طور طریقے۔ دن تو کسی نہ کسی طرح دفتر میں گزر جاتا لیکن رات آتی تو اپنے ساتھ یادوں کی برات بھی لے کر آتی۔ یہ اطلاع مل گئی تھی کہ گھر والے خیریت سے ہیں۔ سلامت ہیں لیکن اوسوں سے پیاس کہاں بجھتی ہے۔ اطلاع نے دل میں اور آگ لگادی۔ کاش ہم سب ساتھ ہوتے۔ ایک دوسرے کی غم خواری کرتے۔ وقت سیدھے سبھاؤ گزر جاتا۔ فضا اور ماحول کی اجنبیت اور بے مہری نے ذہن کی گرہوں کو اور زیادہ الجھا دیا۔ مولوی رجب علی پھر کام آئے۔ وہ خود تو لاہور میں گورنر کے میر منشی تھے لیکن اپنے وطن جگراؤں سے ایک اخبار "مجمع البحرین" بھی شائع کرتے تھے۔ انھوں نے آزاد کی پریشانی دیکھ کر انھیں جگراؤں بلالیا۔ "مجمع البحرین" ان کے سپرد کر دیا۔ آزاد کے اہل و عیال بھی سونی پت سے جگراؤں آ گئے۔ بچھڑے ہوؤں کا ملاپ ہو گیا مگر آزاد کے دل کی کلی نہیں کھلی۔

آزاد دلّی کے طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا شمار دلّی کے رودار لوگوں ہوتا تھا۔ خود آزاد بھی بذاتِ خود طبع آزاد کے حامل تھے۔ کسی کے دست نگر نہیں تھے۔

جگراؤں میں انھیں مولوی رجب علی کے ملازم کی حیثیت حاصل ہوئی۔ بڑی تکلیف دہ صورتِ حال تھی۔ مولوی رجب علی اُن کے والد کے دوست تھے۔ اس وجہ سے بھی آزاد کو ان کے ماتحتی بہت کھلتی تھی۔ مگر کرتے کیا۔ دلّی میں اُن کے ذہن میں بڑے بڑے منصوبے تھے۔ یوں تعلیم عام کروں گا، تصنیف و تالیف کا قلم دان سنبھالوں گا، اردو ادب کو طرزِ نو سے آشنا کروں گا، انشاپردازی کے جوہر دکھاؤں گا۔ جگراؤں میں سارے منصوبوں پر اوس پڑ گئی۔ انا بھی مجروح ہوئی۔ بات بات پر سبکی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن ان ساری ذہنی اور روحانی پریشانیوں کے باوجود آزاد نے ہمت نہیں ہاری۔ جہاں کہیں کوئی تنکا نظر آیا اُسے سہارا بنا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

جگراؤں کے قریب ہی لدھیانے کا شہر تھا۔ پنجاب کے ناظم تعلیمات دورہ کرتے ہوئے وہاں آئے اور ڈاک بنگلے میں مقیم ہوئے۔ آزاد کو دورے کی اطلاع تھی۔ چناں چہ وہ لدھیانے گئے اور ناظم تعلیمات سے ملے۔ محکمے کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کیں لیکن بات کچھ بنی نہیں۔

آزاد جند کی طرح جگراؤں سے بھی عاجز آ گئے۔ دونوں جیم ناموافق ہوئے۔ ان کے ایک بہنوئی لاہور میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ ان سے کہا سنا اور پھر جگراؤں کی سکونت اور کام ترک کر کے لاہور آ گئے۔ بہنوئی کی وجہ سے پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں امیدواری کرنے لگے۔

مولوی رجب علی نے اس بات کو پسند نہیں کیا لیکن وہ خاموش رہے۔ آزاد نے تین ماہ تک بلا تنخواہ امیدواری کی اور پھر بزمرہ منشیان ملازم ہو گئے، تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے عزت آبرو سے گزارے کا انتظام کر دیا۔

لاہور میں قدم جمتے ہی آزاد کے فروغِ علم اور تصنیف و تالیف کے منصوبوں میں از سرِ نو جان پڑ گئی۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک کتاب "آئینہ صحت" مرتب کی۔ اشاعت کے لیے سرکار میں پیش کی لیکن حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ کتاب کا نام ہی نام رہ گیا۔ آزاد کو ایک دُوراندیش اور ہوش مند انسان کی حیثیت سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ پنجاب میں فروغِ علم کا ایک ایسا دور شروع ہو رہا ہے جس کی بنیاد مغربی خیالات اور مغربی علوم پر رکھی جا رہی ہے۔ پُرانا محل گرتا ہے نیا محل بنتا ہے۔ وہ اس تعمیر و ترقی میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے قومی بیداری کا فریضہ

انجام دینے کے خواہش مند تھے لیکن تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ ہوا یہ کہ اُن کا تبادلہ اوور سیر کی حیثیت سے ملتان کر دیا گیا۔ افسروں نے ان کے کام اور ان کی مستعدی کو سراہا اور انھیں ترقی کے ساتھ ملتان روانہ ہونے کا حکم دے دیا مگر آزاد ملتان جانے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی علمی اور پیشہ ورانہ جدوجہد کا آغاز لاہور میں کیا تھا۔ دلّی کے بعد اس نئے اُبھرتے ہوئے علم و ادب کے مرکز کو اپنا اُمید گاہ بنایا تھا۔ اسے چھوڑ کر وہ ایک اور ہجرت کے لیے تیار نہیں تھے۔ چناں چہ انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

اب کیا ہو۔ ایک عزیز سیالکوٹ میں تھے، اُن سے جا کر ملے۔ کشمیر کی سیر کی۔ پھر لاہور واپس آکر پُرانی اور کمیاب کتابوں کا کاروبار شروع کیا۔ لشتم پشتم گزر ہوتی رہی۔ مولوی رجب علی اس آڑے وقت میں پھر کام آئے۔ وہ گورنر پنجاب کے میر منشی تھے اور انھیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو دفتر سے جاری ہونے والے فرامین کی نقلیں تیار کرے۔ آدمی درکار تھا، پڑھا لکھا، ہوشیار اور معتبر۔ آزاد میں یہ ساری خوبیاں تھیں۔ چناں چہ وہ فرامین کی نقلیں تیار کرتے رہے۔ یہ بھی زندگی کا ایک حوصلہ شکن تجربہ تھا۔ جس کی تحریر آنے والے دور میں سرمہ اہلِ نظر بننے والی تھی، وہ نقل مطابق اصل کے خیال میں مبتلا رہا۔ مجبوری اسی کا نام ہے۔ تقریباً سال بھر اسی نقلی کام نے آزاد کو اپنی گرفت میں دبائے رکھا۔

تقدیر پھر یاور ہوئی اور اب انھیں محکمۂ تعلیم میں اہلمد تنخواہ کی ملازمت مل گئی۔ یہ محکمۂ تعلیم پنجاب کے ملازموں کی اہلمدیٔ تنخواہ نہیں تھی۔ دلّی سے لے کر مرزا دبیر تک کی تنخواہ سخن کی فرد مرتب کرنے کا ابتدائیہ تھی۔ دل نے آواز دی، "اب تم صحیح ٹھکانے پر پہنچ گئے ہو۔ اپنی صلاحیت کے جوہر دکھاؤ۔ قلم کی آبیاری سے گلشنِ ادب میں نئے نئے پھول کھلاؤ۔ آگے بڑھو۔ کام کرو۔"

آزاد نے دل کی آواز کا پورا احترام کیا۔ فروغِ تعلیم کے تمام منصوبوں میں سرگرمی سے کام کرنے لگے۔ نمایش پنجاب کی فہرست تیار کر دی۔ جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک اور کتاب "نصیحت کا کرن پھول" تصنیف کی۔ اگرچہ اشاعت کی نوبت بہت بعد میں آئی لیکن قلم رواں دواں ہو گیا۔

لاہور میں ''انجمنِ اشاعت علومِ مفیدہ'' کا قیام عمل میں آیا تو آزاد دل و جان سے اس میں شریک ہو گئے۔ جلسوں میں جا رہے ہیں، نئے خیالات اور تجویزیں پیش کر رہے ہیں، لیکچر دے رہے ہیں، مضمون پڑھ رہے ہیں، انجمن کے صدر اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر کو اردو پڑھا رہے ہیں۔ انجمن کے جلسوں میں ان کے لیکچر بہت مقبول ہوئے۔ معلومات کا وفور، زبان، لہجے اور اندازِ بیان کا سُرور، سننے والے مسحور ہو جاتے۔ نجانے کیا جھگڑا پڑا کہ ملازمت جاتی رہی مگر انجمن نے اپنے یہاں لیکچر دینے کے لیے ملازمت کی پیش کش کی۔ آزاد یہ پیش کش قبول کر لیتے لیکن کچھ اور ہی گُل کھلا۔ افغانستان اور وسط ایشیا اُس زمانے میں بھی انگریزوں کے لیے دردِ سر تھے۔ روس کا ہوّا ابھی تھا۔ حکومت نے ایک جائزہ مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مشن کے اراکین عام آدمیوں کی طرح جائیں، عام آدمیوں میں گھل مل جائیں، فضا اور ماحول کا جائزہ لیں، روسی اثرات اور غلبے کی روداد مرتب کریں، امیروں کی رفتار گفتار اور سیاسی جھکاؤ پر نظر ڈالیں۔ غرض کہ ایک تفصیلی جائزہ لیں اور واپس آ کر اطلاع دیں۔ ایک مشن مرتب ہوا۔ آزاد کو مشن کی رُکنیت پیش کی گئی۔ انھوں نے قبول کر لی۔ وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنی وفاداریٔ سرکار کا ثبوت بھی فراہم کرنا تھا۔ وہ تو معافی یافتہ معتوبین میں تھے اس لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسا کام کر جائیں جس سے ان کی مشکوک وفاداری کا الزام ختم ہو۔ جائزہ مشن میں شمولیت اس الزام کو ختم کرنے کا بہترین موقع تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ آزاد کو سیاحت اور فارسی زبان کی محبت، دونوں نے اکسایا کہ موقع بہترین ہے۔ توران کے برفوں کی سفیدی اور جیحوں سیحوں کی وادیاں دیکھ آؤ۔ چناں چہ آزاد تیار ہو گئے۔ ''اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے۔''

سفر کی مدت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے مناسب یہ سمجھا کہ بال بچوں کو دلّی میں اپنی سسرال میں چھوڑ جائیں۔ جائزہ مشن بصیغۂ راز تھا مگر واہ رے دلّی کے خبر تراش اور افواہ ساز۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی کہ مولوی محمد حسین آزاد انگریزوں کے ایما پر فیروز شاہ کو زہر دینے ترکستان جا رہے ہیں۔ فیروز شاہ، بہادر شاہ کے بیٹے تھے جو ۱۸۵۷ء میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا چکے تھے اور انگریزوں کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح بچ بچا کر ترکستان پہنچ گئے تھے۔ انگریز انھیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ یہ اُس زمانے کی ابلاغیات کا شاہ کار تھا۔ باتوں کے

طوطے مینا اسی طرح بنتے ہیں۔

آزاد نے اپنے اس سفر میں کابل کی سیر کی۔ بخارا اور سمرقند گئے۔ (بخال ہندوش۔۔۔) بدخشاں گئے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کے قدیم مرکز دیکھے۔ مدرسے، کارواں سرائیں، عالم، فاضل دیکھے، بازاروں کی گہما گہمی دیکھی، داستانیں سنیں، قدامت کے آثار دیکھے، معاشرتی پستی اور فکری پس ماندگی دیکھی، سیاسی انتشار، افتراق اور روس کی بالادستی محسوس کی، تورانی فارسی کا محاورہ سنا اور سیکھا۔ طالب علم کا روپ دھار کر گئے تھے، علمی تحقیق اور جستجو میں لگے رہے صحیح سلامت گئے، صحیح سلامت آئے۔

واپس آکر رپورٹ دینے کلکتے گئے۔ کلکتہ راجدھانی تھا۔ انگریز حاکموں کا شہر تھا۔ آزاد آخری سانسیں لیتی ہوئی جاں بلب تہذیب، ثقافت اور لرزہ براندام ولایت بالا کو دیکھ آئے تھے۔ علم سے بے بہرہ، حالاتِ حاضرہ سے بے خبر، روایت اور قدامت میں ڈوبے ہوئے عوام کی ذہنی پس ماندگی پر افسوس کرتے اور دل میں ایک نئی کسک محسوس کرتے ہوئے آئے تھے۔ کلکتہ دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بلند بالا کوہساروں کی رفعت دیکھ آئے تھے۔ سمندر کی وسعت دیکھی تو کائنات کی بے کرانی کا احساس ہوا۔ بھاپ سے چلنے والے جہاز دیکھے تو علم اور ذہنِ انسانی کے عمل اور افادی قوت کے برمحل صرف نے متاثر کیا۔ جہاز میں بیٹھے تو آبِ رواں پر سجے ہوئے گھر کا سماں نظر آیا۔ سڑکوں پر گیس کی روشنی دیکھی تو راہ میں جھلملاتے قمقموں کی زنجیر کا عالم نظر آیا۔ تنظیم اور ترتیب دیکھی۔ کالج میں وہ انگریز اساتذہ کو دیکھ چکے تھے۔ پرنسپل ٹیلر ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ لاہور میں بھی انھیں انگریزوں سے واسطہ پڑا تھا۔ بعضوں کو اردو بھی پڑھائی تھی۔ ڈاکٹر لائٹنر سے بھی یاد اللہ تھی مگر کلکتے میں شوکتِ انگلشیہ اپنے عروج پر نظر آئی۔ آزاد نے دربارِ شاہی تو نہیں دیکھا تھا، چرچے ضرور سنے تھے۔ یہاں نائب السلطنت کا موثر لیکن سادہ جاہ و حشم دیکھا۔ زندگی کے نئے رنگ ڈھنگ، فکر کا نیا آہنگ، علوم کی لہر بہر، سرکاری امور کی بجا آوری میں ذمہ دارانہ احساس کا مشاہدہ کیا۔ آراستہ اور مرتب کتب خانے دیکھے۔ کرائے کی گاڑیوں میں کرائے کا نرخ نامہ آویزاں دیکھا۔ ہر قدم پر نت نئے کرشمے دیکھے۔ سب کچھ دیکھا۔ چشمِ حیرت سے دیکھا۔ وسطِ اشیا کی سیاست کے دل دوز مناظر ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ یہاں اور وہاں کا

تقابل کرتے رہے۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے رہے۔ اپنا گھٹنا کھولنا آپ ہی لاجوں مرنا۔

کبھی وطن اور اہلِ وطن کی پس ماندگی کا خیال آتا۔ جہالت، ہٹ دھرمی، ذہنی انتشار، بے بضاعتی، نئے علوم اور نئی فکر سے بے خبری۔ احوالِ عالم سے ناشناسائی، ماضی کے فخر میں گرفتار، لکیر کے فقیر، جیسے جیسے سوچتے، جتنا جتنا سوچتے، لڑکپن کا عزم تازہ ہو جاتا۔ ''میں اہلِ وطن کو نئے نئے خیالات سے آگاہ کروں گا۔ ادب اور شعر کے ذریعے سے ذہنی انقلاب برپا کروں گا۔ انگریزی علم و حکمت کے خزانوں کے قفل کھولوں گا۔ خزانوں کو قوم کے سپرد کردوں گا۔'' یہ سوچتے تو وقتی طور پر ذہن کی بہت سی نفسیاتی گرہیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ کلکتے کے سفر اور حال احوال نے ان کے ذہن میں عرفانِ حقائق کے نئے چراغ روشن کردیے۔

آزاد کے کلکتے جانے سے اڑتیس برس پہلے عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی کلکتے گئے تھے۔ وہ ۱۸۲۸ء میں اکتیس برس کی عمر میں کلکتے پہنچے تھے۔ مرزا محمد حسین آزاد کلکتے پہنچے تو چھتیس برس کے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں اپنی عمر کے عشرہ چہارم میں تھے۔ غالب نے کلکتے میں تہذیبِ مغرب کے رنگ ڈھنگ اور فکر و آہنگ کو دیکھا تو ایک تیر کلیجے میں ترازو ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ (اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے) مشاہدہ کلکتہ کے اثرات اُن کی تخلیقی انفرادیت اور فکری عظمت میں نمایاں ہیں۔ آزاد نے دانش و فکرِ فرنگ سے جو کچھ حاصل کیا اُسے اپنی ادبی کاوشوں کا سرنامہ بنا کر اہلِ ملک کو اندازِ نوی سے آشنا کیا۔ دونوں نے قدامت میں جدت کا پیوند لگا کر طرحِ نو کی بنیادیں استوار کیں۔

کلکتے سے واپسی کے بعد پھر وہی فکرِ معاش۔ انجمن پنجاب نے اپنا سیکریٹری مقرر کرلیا۔ انجمن کے جلسوں میں متعدد مضمون پڑھے۔ ان مضامین کا لبِ لباب، اہلِ وطن کی ترقی کی کوششیں اور علومِ جدیدہ کی معرفت تھی۔ ان میں سے بعض مضمون ان کی آنے والی تصانیف کا پیش خیمہ تھے۔ حکومتِ پنجاب کے حکم پر طلبہ کے لیے تاریخ کی کتاب مرتب کرنے میں مصروف ہوئے۔ سرکاری اخبار کے نائب مدیر مقرر ہوگئے۔ بڑی مصروفیت اور کارکردگی کے نمایاں اظہار کا زمانہ تھا۔ اردو فارسی کی ریڈریں مرتب کیں۔ اردو کی ریڈروں نے اردو کی نصابی کتابوں میں لازوال حیثیت حاصل کرلی۔ پھر ''قصص ہند'' کا دوسرا حصہ تصنیف کیا۔ برصغیر میں

مسلمانوں کی حکومت کے منتخب واقعات، تختِ طاؤس اور جشنِ ماہتابی کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ پڑھنے والوں نے تخت اور جشن دونوں کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ فن کارانہ معجز بیانی اسی کو کہتے ہیں۔

نصابی کتابوں میں تخلیقی اظہار کی ندرت، نثر کی شیرینی اور لطافت، امر واقعہ کے بیان میں صداقت اور متانت دھوم ہو گئی۔ بچوں کے کھلونے بھی ایسے دل کش اور نادر ہو سکتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم میں آزاد کی دھاک بیٹھ گئی۔ ڈائریکٹر سے لے کر ڈاکٹر لائٹنر تک سبھی معترف ہو گئے۔

محنت شاقہ اور دیدہ ریزی کا پھل بھی ملا۔ آزاد، شمالی ہند کے بہترین تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ مولوی علمدار حسین، کالج میں عربی کے پروفیسر تھے۔ وہ بے چارے بیمار ہو گئے۔ چھٹی لے لی۔ تین مہینے کی چھٹی تھی۔ آزاد کا تقرر پہلے پہل تین ہی مہینے کے لیے ہوا۔ مولوی علمدار حسین بیماری سے جانبر نہ ہو سکے۔ آزاد مستقل پروفیسر ہو گئے۔ روزگار کی بے یقینی کا دور ختم ہو گیا۔ عزّ و وقار میں اضافہ ہوا۔ آزاد، پروفیسر آزاد ہو گئے۔ سرکاری اخبار کی ادارت اضافی ذمہ داری تھی۔ وہ کام بھی ہوتا رہا۔

کچھ دن بعد ڈاکٹر لائٹنر بھی ولایت سے لوٹ آئے۔ دونوں میں اور زیادہ ربط ضبط ہو گیا۔ لائٹنر آزاد کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اردو انھیں سے پڑھی تھی۔ سارے شہر میں مشہور ہو گیا کہ آزاد نے لائٹنر کو مٹھی میں کر لیا ہے۔ ستارہ عروج پر ہے۔ کالج کے سیاہ سفید کے مختار بنے بیٹھے ہیں۔ ڈائریکٹر بھی ان سے خوش، پرنسپل بھی راضی۔ حاسدوں نے کہا، آزاد کی پانچوں گھی میں ہیں۔ شہر بھر میں دھوم ہے کہ پرنسپل کو شیشے میں اُتار لیا ہے۔ لیاقت، صلاحیت اور محنت پر کسی نے نظر نہیں کی۔ دلوں کا بخار نکالنے کے لیے پیچھے پڑ گئے۔ ''ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔''

ڈاکٹر لائٹنر نے ایک کتاب مرتّب کی ''سنینِ اسلام'' اِس میں مسلمانوں اور ان کے ادب کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ تاریخ عالم میں ان کا مقام متعین کیا گیا ہے۔ یہ کام لائٹنر جیسا عالم ہی انجام دے سکتا تھا۔ انگریزی کتاب کو اردو میں قلم بند کرنے کا کام آزاد کے سپرد ہوا۔ ان کی انشاپردازی کا شہرا سارے ملک میں تھا۔

آزاد نے بھی جان لڑا دی۔ اپنی انشاپردازی کا سارا زور صرف کر دیا۔ کتاب شایع ہوئی

تو بڑی واہ واہ ہوئی۔ دوسری جلد کی تیاری شروع ہوئی۔ لائٹنر نے سارا مواد مرتب کیا۔ آزاد کے حوالے کر دیا۔ آزاد اہل و عیال کے جنجال میں گرفتار۔ کالج میں علوم شرقیہ کی تدریس کے ذمہ دار۔ پھر اپنی دن رات کی نوشت و خواند کا طومار، اوپر سے سنین الاسلام کی بیگار، کام شروع کیا مگر آہستہ آہستہ۔ لائٹنر ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کے عادی۔ ہوں کریں اور ہاں ہو جائے۔ مزاج کے اعتبار سے اردو غزل کے محبوب تھے۔ بارہ ابھرن، سولہ سنگھار اور مست مئے پندار۔ قتل عاشق پر ہمہ تن تیار۔ ''قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا'' ہیکڑی ایسی کہ رخصت لے کر ولایت گئے۔ واپس آئے تو قائم مقامی کرنے والے پروفیسر کو برخاست کرا دیا۔ اُن کا بس چلتا تو ''سنین اسلام'' کے کاغذ بھیجتے ہی چھپی ہوئی کتاب کا مطالبہ کر دیتے۔ ایک طرف سے کھینچ، دوسری طرف سے ڈھیل۔ یاروں نے اس کش مکش سے پورا فائدہ اُٹھایا۔

پر کا کوّا بنانے اور آسمان میں تھگلی لگانے والے غضب ہوتے ہیں۔ دو دلوں میں اتحاد و اتفاق دیکھتے ہیں تو جی جان سے کوشش کرتے ہیں کہ آپس میں بگاڑ ہو جائے۔ دنیا تماشا دیکھے۔ ان کا اُلّو سیدھا ہو۔ سخن سازوں اور لگائی بجھائی کرنے والوں نے نجانے کیا پٹی پڑھائی کہ اچھے دل بُرے ہو گئے۔ لائٹنر آزاد کے نام سے بیزار ہو گیا۔ اسکولوں کے ایک ڈپٹی مولوی کریم الدین کو سارا مواد حوالے کیا۔ انھوں نے حکم کی تعمیل میں دن رات ایک کر دیا۔ دوسرا حصہ چھپ گیا۔ آزاد معتوب ہو گئے۔ ایسے معتوب کہ چھٹیوں میں لاہور سے باہر جانے پر بھی پابندی عائد ہو گئی۔

ایک دن دلّی کے ایک پُرانے واقف کار آزاد سے ملنے آئے۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ گزرے دن یاد کیے۔ اُن صاحب نے کہا، ''بھائی آزاد! میں اس غرض سے تمھارے پاس آیا ہوں کہ تمھیں دلّی لے جاؤں۔ ایک بڑے مشاعرے کا ڈول ڈالا ہے۔ تمھاری شرکت ہو جائے گی تو مشاعرہ چمک جائے گا۔ میرے ساتھ چلے چلو۔'' آزاد نے عذر معذرت کی۔ اپنی مصروفیت کا اظہار کیا۔ بات بنانا چاہی مگر بنی نہیں۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور وہ صاحب روٹھ کر جانے لگے تو آزاد نے روہانسی آواز میں کہا، ''بھائی۔ کیوں کر کہوں۔ لاہور سے باہر جانے کا حکم نہیں ہے۔ پرنسپل کی قید میں ہوں'' اُن صاحب نے کہا، ''ہاں سنا تو میں نے بھی تھا مگر اب تصدیق ہو گئی۔ اچھا۔ خدا حافظ و ناصر۔''

ڈاکٹر لائٹنز عالم فاضل تھے۔ لسانیات اور علومِ اسلامی پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہ پچاس زبانیں جانتے ہیں۔ لندن کے کنگز کالج میں قانونِ اسلامی کے استاد رہ چکے تھے۔ مشرق کی بیداری کے خواہاں لیکن کانوں کے کچّے اور:

نہ برق میں یہ کرشمہ نہ شعلے میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

لپکتا ہوا شعلہ اور چلتی ہوئی تلوار تھے۔ شعلہ لپکتا ہے تو اپنے پرائے کو نہیں دیکھتا۔ تلوار ستھراؤ کرتی ہے تو کیا اپنا کیا بیگانہ، سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔ لائٹنز آزاد سے بگڑے تو ایسے بگڑے کہ ہر موقعے پر زک دینے کی پوری کوشش کی۔ کوئی کسر چھوڑی نہیں لیکن جس کو اللہ رکھے اُس کو کون چکھے۔ آزاد بھی پورے ادب لحاظ کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔

"کرتا تھا جواں مرد گزارا خوش و ناخوش۔" آزاد بھی خوش و ناخوش گزارا کرتے رہے۔ ذہن میں گرہیں اور گتھیاں پہلے سے موجود تھیں، کچھ اور کا اضافہ ہو گیا۔ آزاد سچ مچ محشرِ خیال ہو گئے، لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی۔ ذہن کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ ادب و شعر کو طرحِ نو سے آشنا کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ "ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی ملتی ہے۔" قدرت نے ایک موقع فراہم کر دیا۔

اسکولوں کے اردو نصاب کی کتابیں گورنر پنجاب کے ملاحظے کے لیے پیش ہوئیں۔ گورنر نے خوشنودی کا رسمی اظہار نہیں کیا۔ یہ لکھا کہ ان کتابوں میں حصہ نظم برائے نام اور نامناسب ہے۔ انگریزی نظموں کی طرح بچوں کی نظمیں لکھوائی جائیں اور نصاب کی کتابوں میں شامل کی جائیں۔

کرنیل ہالرائڈ ناظم تعلیمات کو اپنی ترقی کے لیے اس ہدایت میں بندھی بندھائی، کسی کسائی مضبوط سیڑھی واضح طور پر نظر آئی۔ وہ آزاد کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ انھیں بلایا۔ صلاح مشورے ہوئے آزاد کو ناظم صاحب کی تجویز میں اردو شاعری کے روشن مستقبل کی جھلک نظر آئی۔ زور و شور سے تیاری ہوئی اور پھر بڑی دھوم دھام سے ایک جلسہ ہوا جس میں لاہور کے سارے نامی سخن گو شریک ہوئے۔ انگریز افسروں نے بھی شرکت کی۔ ناظم نے انگریزی میں

تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ ہر مہینے ایک مشاعرہ منعقد ہو۔ شعرا مقررہ موضوع پر کلام پیش کریں۔ سال کے آخر میں بہتر کلام پیش کرنے والے شعرا کو انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ تجویز کامیاب ہو گئی تو ۱۸۷۴ء کا سال ملکی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

آزاد کی تقریر بڑی زبردست تھی۔ فکر انگیز تھی۔ "طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم" کا نعرہ مستانہ بھی تھی۔ انھوں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ "اے اہلِ وطن تمھاری شاعری چند محدود احاطوں میں نہیں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرانے کی کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمھاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی۔" پھر آزاد نے اپنی تجویز کی تائید اور اپنے موٗقف کی وضاحت کے لیے ایک مثنوی "شبِ قدر" کے عنوان سے پڑھی۔ اس مثنوی میں رات کی آمد اور کیفیات کو دل کش شعری انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

اربابِ حکومت جلسے کی کامیابی اور مثبت اثرات سے مطمئن ہو گئے۔ مشاعرے شروع ہو گئے۔ نظمیں لکھی جانے لگیں۔ اِدھر تو یہ ہوا اُدھر دوسری طرف رنگِ قدیم کے پرستاروں نے وہ ہنگامہ کیا کہ جیسے بارود میں آگ لگ گئی ہو۔ "ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔" معلوم ہوا کہ جیسے ایوانِ شعر میں زلزلہ آ گیا ہے۔ لاہور کے "پنجابی" اخبار نے ہر مشاعرے کی دھجیاں اُڑائیں۔ اعتراض، تمسخر، طنز، تضحیک۔ آزاد کی شخصیت میں کیڑے ڈالنا، ان کے علم و فضل کا خاکہ اُڑانا، شعری رجحانات کو بدلنے کی کوشش کو اردو شاعری کی تباہی اور بربادی سے تعبیر کرنا۔ کیا کچھ نہیں ہوا۔ آزاد خاموش رہے۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لفظیات کی تازگی اور شعری پیکروں کی ندرت سے اندازِ قدیم کے حبس کو دُور کرنے کی کوشش میں مصروف رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔ ملک کے روشن خیال بزرگوں نے آزاد کی مساعی جمیلہ کی داد بھی دی۔ سر سیّد احمد خان نے نیچر کی شاعری پر بڑا اچھا مضمون لکھا اور آزاد کی مثنوی "خوابِ امن" کی تحسین بھی کی۔ سو سنار کی ایک لوہار کی، اسی کو کہتے ہیں۔ یہ بڑا مسکت جواب تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ بھی ان دنوں لاہور میں تھے۔ چار مشاعروں میں وہ بھی شریک

ہوئے۔ بعد ازاں ان کا تبادلہ دلّی ہو گیا۔ پر کا کوا بنانے والے اس موقعے پر بھی نہیں چوکے۔ مشہور کر دیا کہ مولانا حالیؔ کی نظمیں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ اس مقبولیت سے آزاد کے سینے پر سانپ لوٹ گیا ہے۔ پنجابی اخبار کے مالک و مدیر حالی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار میں حالی کی مدح اور آزاد کی قدح کا حق ادا کر دیا۔ یاروں نے اپنی سی بہت کی لیکن آزاد اور حالی میں بگاڑ نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ ''پاکباز ادبی مورخوں'' کے لیے آزاد کو مطعون کرنے کا حیلہ ہاتھ آ گیا۔ تاریخ ادب کے اوراق پر آزاد دشمنی کی ایک گہری شکن پڑ گئی۔ ''آزاد حاسد ہیں۔ کم بیں ہیں۔ دوسروں کے کمالات کو دیکھ نہیں سکتے اور نجانے کیا کیا۔'' وقت نے ساری شکنیں مٹا دیں:

سب شور ما و من کو لیے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فسانے نے آخر سُلا دیا

یارانِ فسانہ خواں سو گئے لیکن حالی کو حیاتِ جاوید مل گئی۔ آزاد کو آبِ حیات حاصل ہو گیا۔ تلخیوں اور بدمزگیوں کے کاغذوں کے پُرزے ہوا میں اڑتے اُڑتے غبار پس غبار بن گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی کرم اور بھی ہوا۔ مشاعروں کے اس دور میں آزاد کے کرم فرما ڈاکٹر لائٹنر رخصت پر ولایت گئے ہوئے تھے۔ اگر موجود ہوتے تو نجانے کیا گُل کھلاتے اور اُن کی کرم فرمائی سے کیا کیا شگوفے پھوٹتے۔

آزاد اردو شاعری میں طرزِ نو کی داغ بیل ڈالنے کے بعد تدریس اور تصنیف کے کاموں میں منہمک ہو گئے۔ ''آبِ حیات'' اور ''دربارِ اکبری'' کے کچھ اجزا انجمن مفید عام قصور کے رسالے میں شایع کیے۔ ذاتی دُکھوں میں مبتلا رہے۔ وہ پھوپی جنھوں نے ماں بن کر پالا تھا، اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ پھوپی کیا گزریں، ماں کی ممتا، دادا کا پیار، باپ کی شفقت اور استاد کی عنایت سب کا خاتمہ ہو گیا۔ گھر ویران ہو گیا۔ سر پر کوئی سہارا نہ رہا، دو بچے بھی گزر گئے۔

لائٹنر کی کرم فرمائیاں جاری رہیں۔ آزاد جو بھی درخواست دیتے، لائٹنر اُسے مسترد کر دیتے۔ بال کی کھال نکالتے۔ گڑے مُردے اُکھاڑتے۔ آزاد کو نااہل ثابت کرنے کی تگ و دو کرتے رہتے۔ ادھر آزاد کا یہ حال کہ ایک سر ہزار سودے۔ سرکاری اعتراضوں کے جواب لکھتے۔ حریفوں کے وار سے بچتے۔ اپنے لکھنے پڑھنے میں لگے رہتے۔ دنیا راتوں کو چین کی نیند سوتی

وہ کاغذوں پر آنکھوں کا تیل ٹپکاتے، حرفوں کو اُجالتے، مٹے ہوئے نقوش کو زندہ کرتے۔ مکان میں آگ لگ گئی۔ ان کی بہو کی اتا بے چاری جل مری۔ صدمے پر صدمہ اُٹھاتے رہے۔ نفسیاتی گتھیاں الجھتی گئیں۔ پراگندہ روزی تو نہیں تھے، پراگندہ دل ضرور تھے۔ لکھنے پڑھنے کا سہارا نہ ہوتا تو نجانے کیا ہوتا مگر لکھنے پڑھنے کا سہارا بھی کب تک؟ بہر حال زندگی گزرتی رہی۔ ''آبِ حیات'' اور ''نیرنگِ خیال'' کی تکمیل ہوگئی۔

آزاد نے لڑکپن سے جو ادبی اور شعری روایتیں سُنی تھیں، استاد ذوق سے پیش رووں اور ہم عصروں کے جو تذکرے اور چرچے کانوں تک پہنچے تھے، دلّی اور لکھنؤ میں اساتذہ فن کی خدمت میں حاضر ہو کر جو کچھ حاصل کیا تھا، اردو زبان اور زبانوں کی تشکیل اور تعمیر کا جو احوال مختلف علما سے معلوم ہوا تھا، شعرائے قدیم کے تذکروں سے جو کچھ اخذ کیا تھا، وہ اس سب کو ذہن میں منضبط کرتے آئے تھے۔ خدا خدا کرکے اس انضباط نے اردو زبان و شاعری کی ایک مبسوط تاریخ کی شکل اختیار کرلی۔ ''آبِ حیات'' نام تجویز ہوا اور یہ حیات بخش مرقعٔ ادب اہلِ ذوق کے سامنے آگیا۔

''آبِ حیات'' کے ساتھ ساتھ ایک اور مجموعہ بھی منظرِ عام پر آیا۔ نام تھا ''نیرنگِ خیال۔'' انگریزی انشاپردازوں کے خیالاتِ سے چراغِ شوق روشن ہوا تھا۔ تمثیلی مضامین پر مشتمل تھا۔ ''وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۲۱ ۞'' تمثیل کے شاعرانہ پیرائے اور بیان میں زندگی کے حقائق کے انکشاف و ادراک کی ادبی کاوش۔ بعض مضامین رسایل میں بھی شایع ہوچکے تھے۔ اب انھیں ایک مجموعے کا روپ دیا گیا۔ ''آبِ حیات'' کے ساتھ شایع کردیا گیا۔

حسبِ دستور چشمِ بد بیں نے ''آبِ حیات'' کی تاریخی حیثیت، ثقافتی اہمیت اور جمالیاتی لطافت سے اغماض برتا۔ ''ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔'' آزاد اس کے عادی ہوچکے تھے۔ وہ حسبِ دستور چپکے رہے۔ ''نیرنگِ خیال'' پر سرقے کا الزام عاید ہوا کہ آزاد نے انگریزی انشاپردازی کے خیالات سے اخذ و استفادہ کیا ہے، حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، چناں چہ وہ سارق ہیں۔ مگر ''کم نظر بیتابیِ جانم ندید''۔ اعتراض کرنے والوں نے یہ نہیں دیکھا کہ

"نیرنگ خیال" کے انگریزی سرورق پر انگریز مصنفوں سے اخذ و استفادہ کا اعتراف موجود تھا۔

خار کھانے والے انگاروں پر لوٹ گئے لیکن دل بڑھانے والوں، اردو نثر کے نئے میلانات ورجحانات سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ فکر و نظر، اردو کی نئی لسانی اور ادبی تحقیق و تنقید کے بالائے بام آنے کے منظر سے بہرہ مند ہونے والے صاحبانِ علم و کمال نے آزاد کی کوششوں کو بہت سراہا۔ کہا اور لکھا کہ آزاد نے اردو شاعری کی تاریخ، تذکروں کی یخ بستہ دنیا سے ہٹ کر ادبی تاریخوں کے انداز سے مرتب کی ہے۔ زبان کی ابتدا، تعمیر اور ترقی کا جائزہ لیا ہے، اردو شاعری کے ادوار قائم کیے ہیں، لسانی تغیرات کی نشان دہی کی ہے، ہر دور کے لباس اور اوضاع کو بیان کیا ہے، ہر دور کے ممتاز سخن وروں کی فکر و نظر کا جائزہ لیا ہے اور متعدد شاعروں کے منھ بولتے خاکوں سے انھیں ہمارے دل و دماغ میں نقش کر دیا ہے۔ "آبِ حیات" اردو شاعری کی تاریخ ہی نہیں خود ادب بھی ہے۔

"نیرنگِ خیال" نے اردو میں انشا پردازی کے نئے رجحان کا اضافہ کیا۔ ایک نئی اور خوب تر روایت کے امکانات واضح کیے۔ "نیرنگِ خیال" کے مضامین نے اردو افسانے کی راہ ہموار کی۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ بڑا فن کار ترجمے کو تخلیق کے پیکر میں اس طرح ڈھال سکتا ہے کہ ترجمہ اصل کا ہم پہلو ہو جاتا ہے۔

دونوں کتابوں کی اشاعت سے آزاد کی ادبی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ پروفیسر آزاد کے شاہ کار اردو ادب کے شاہ کار قرار پائے۔ جلد ہی دونوں کتابیں پنجاب یونی ورسٹی کے نصاب میں داخل کر لی گئیں اور آزاد کو دوسری اشاعت کا اہتمام کرنا پڑا۔ انھوں نے اہلِ وطن سے فروغِ علم کا جو وعدہ کیا تھا، ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے اُس کی تکمیل ہو گئی۔

"آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" کے بعد آزاد نے اکبری دربار سجانا شروع کر دیا۔ "سخن دانِ فارس" پر بھی نظر ڈالی۔ "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل ہو گئی تھیں۔ انھیں دوبارہ چھپوانا شروع کیا۔ "آبِ حیات" میں اضافے کیے۔ امتحانی کام، زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ بڑی تمنا تھی کہ "آبِ حیات" کو حیدرآباد دکن والے سر سالار جنگ کے نام معنون کریں۔ خود جائیں اور کتاب کے کچھ حصے سنائیں مگر سالار جنگ ہی نہ رہے۔ یہ تمنا بھی

حسرت میں تبدیل ہو گئی۔ بڑی محنت اور کش مکش کا دور تھا۔ شہرت بڑھتی جاتی تھی، ذہن پسا جاتا تھا، دل بیٹھا جاتا تھا۔

بڑا صدمہ یہ پہنچا کہ جس گورنمنٹ کالج میں انھوں نے عزت آبرو کے پندرہ سال گزارے تھے، اُس گورنمنٹ کالج سے مفارقت ہو گئی۔ وہاں سے پنجاب یونی ورسٹی اور ینٹل کالج بھیج دیے گئے۔ یہ ان کے لیے بڑا جان لیوا احساسِ شکست تھا۔ وہ کالج کے بڑے مقبول استاد تھے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں میں ہر دل عزیز تھے۔ طلبہ کو برف خانے لے جاکر لیمن پلواتے تھے۔ اُن سے ہنستے بولتے تھے۔ دلداری کرتے تھے۔ کالج میں ان کی ایک حیثیت اور انداز تھا۔ چوغہ پہن کر آتے مگر ایک آستین خالی رہتی۔ پیچھے لٹکتی رہتی۔ گھوڑا بھی ساتھ ہوتا تھا۔ مگر گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ ساتھ ساتھ آتا تھا۔ اردو کی پہلی کتاب میں مولوی صاحب کے گھوڑے کا بیان بھی ہے۔ ساری روایتیں ختم ہو گئیں۔ اورینٹل کالج جانے میں انھوں نے سبکی محسوس کی۔ مگر کیا کرتے۔ بندگی بے چارگی، ذہنی دباؤ اور انتشار کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

ایران جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ بزرگوں کا وطن تھا۔ جیحون و سیحون کی وادیوں میں گھوم پھر چکے تھے۔ سرزمین فارس دیکھنے کی تمنا تھی۔ ایران کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے ملنے کا شوق تھا۔ زبان اور محاورے کی درستی منظور تھی اور وہاں سے اپنے کتب خانے کے لیے نادر، نایاب، قدیم کتابیں لانے کا منصوبہ تھا۔ عالم خیال میں ایران کے دل کش مناظر دیکھتے رہے اور خاموشی سے تیاری کرتے رہے۔

غضب یہ ہوا کہ جوان جہان، بیاہی تیاہی بیٹی امۃ السکینہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ امۃ السکینہ آزاد کی چہیتی بیٹی تھیں۔ لائق اور فہیم تھیں۔ تصنیف و تالیف کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ باپ پر جان چھڑکتی تھیں۔ ان کی شادی پٹیالے کے خلیفہ خاندان کے ایک لائق نوجوان خلیفہ محمد کاظم سے ہوئی تھی۔ ہر طرح خوش اور مطمئن تھیں لیکن خدا نہ چاہے تو بندے کی کیا چلے۔ آزاد نے سناؤنی سنی تو سناٹے میں آ گئے۔ تمام عمر کی ناکامیاں اُبھر آئیں۔ نفسیاتی گرہوں اور گتھیوں کا کساؤ اور دباؤ ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ دماغ سُن اور ذہن ماؤف ہو گیا۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ گھر والوں نے طے کیا کہ انھیں پٹیالے لے جایا جائے۔ چناں چہ وہ نہانے کے لیے

غسل خانے گئے۔ ایسے گئے کہ گھنٹوں غسل خانے ہی میں بند رہے۔ زبردستی باہر نکالے گئے۔ ریل کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔ اگلے دن لے جائے گئے۔ اس طرح کہ حال سے بے حال بات میں بے ربطی، انداز میں ناہمواری۔

یہ صدمہ بھی سہہ لیا۔ استاد کا مطلع پڑھتے اور آہ بھرتے:

موت ہی سے کچھ علاج دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

مگر موت مانگے سے نہیں ملتی۔ پھر وہی کالج۔ وہی نئے ماحول اور فضا کے اجنبی در و دیوار، وہی "دربارِ اکبری"، وہی "سخن دانِ فارس"، وہی زندگی کا رنگ ڈھنگ۔ ایران جانے کا منصوبہ بنایا تھا، اس کی تیاری کرنے لگے۔ جس نے سنا اُس نے ٹوکا۔ اس حال اور اس ذہنی کیفیت میں کالے کوسوں کا سفر، گھر والوں نے لاکھ منع کیا مگر آزاد نے کسی کی نہیں سنی۔ رخصت کی درخواست دے دی۔

درخواست پیش ہوئی ڈاکٹر لائٹنر کے سامنے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے تھے۔ انھیں ایسا موقع خدا دے، درخواست یک قلم مسترد کر دی، اپنے نزدیک زیردست کی چھاتی پر مونگ دل دیے۔ ایک ہی وار میں چت کر دیا۔ آزاد ذہنی پراگندگی کا شکار تھے لیکن ایسے گئے گزرے بھی نہیں تھے۔ سیر کے لیے سوا سیر ہو گئے۔ ان دنوں پنجاب کے گورنر تھے سر چارلس ایچیسن۔ انجمن پنجاب قائم ہوئی تھی تو لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ آزاد سے صاحب سلامت تھی۔ آزاد نے انھیں کو پکڑا۔ ملاقات کی، اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا تذکرہ کیا۔ گورنر صاحب مطمئن ہو گئے۔ آزاد کی رخصت منظور ہو گئی۔ لائٹنر نے منھ کی کھائی۔

سفر کی تیاری ہو گئی۔ لاہور سے کراچی آئے، عربیا نامی جہاز پر سوار ہوئے، گوادر، بندر عباس، بحرین ہوتے ہوئے بوشہر پہنچ گئے۔ شاید آزاد گوادر سے گزرنے والے اردو کے پہلے ممتاز ادیب تھے۔ بوشہر سے شیراز۔ "اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا۔" مگر انھیں "ترکِ شیرازی" کی نہیں اہلِ علم اور کتابوں کی جستجو تھی۔ اصفہان گئے۔ "اصفہان نیمہ جہاں

گفتم۔ "طہران گئے، کاشان گئے، مشہد گئے، بزرگوں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھی، تاریخی آثار دیکھے، ایرانی محاورہ سنا، موسموں کی بوقلمونی دیکھی۔ اہلِ علم کی خدمت میں حاضری دی، فیض حاصل کیا، چھکڑا بھر کتابیں خریدیں، بارِ علم سے لدے پھندے ہرات اور قندھار کے راستے واپس ہوئے۔ ہرات اور قندھار میں انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ رات کو سوتے میں اونٹ سے گر گئے۔ بڑی چوٹ آئی مگر اللہ نے خیر کی۔ افغانیوں نے بہت تنگ کیا۔ موقع ملتا تو مار ہی ڈالتے۔ کم وبیش ایک برس کی سیاحت کے بعد آزاد صحیح سلامت گھر پہنچے۔

اہلِ لاہور کا اصرار تھا کہ آزاد سفر کا حال بیان کریں۔ اشتہار جاری ہوا۔ آزاد کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکچر کا اعلان ہوا تو شائقین دُور ونزدیک سے آئے۔ "البرامکہ" کے موٴلف مولوی عبدالرزاق لیکچر سننے کانپور سے لاہور آئے اور لیکچر کا حال احوال قلم بند کر گئے۔ اللہ اکبر کیا لیکچر تھا۔ حاضرین مسحور ہو گئے۔

اورینٹل کالج میں تدریس کا مشغلہ پھر شروع ہو گیا۔ "دربارِ اکبری"، "سخن دانِ فارس"، "دیوانِ ذوق" کی تدوین وترتیب کی، چاہا کہ ایک زرعی فارم قائم کریں۔ حکومت نے زمین دینے سے انکار کر دیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ ایک کتب خانہ قائم کیا جائے۔ حکومت نے لاہور میں شاہ محمد غوثؒ کی درگاہ کے پہلو میں ایک قطعہ زمین عطا کر دیا۔ آزاد عمارت بنوانے میں مصروف ہو گئے۔ ذہن کا یہ عالم کہ اگر خدانخواستہ آسمان پر بادل چھا جاتے تو وہ آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے "یا اللہ بارش نہ ہو"۔ بادلوں کی طرف رُخ کر کے صدا لگاتے۔ "جاؤ۔ کہیں اور برسو۔ آزاد کے کام میں کھنڈت کیوں ڈال رہے ہو۔ کتب خانے کی تعمیر رُک جائے گی۔"

خدا خدا کر کے کتب خانے کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ آزاد نے اپنی ساری کتابیں یہاں رکھ دیں۔ نادر قلمی کتابیں بھی تھیں۔ مطبوعہ بھی تھیں۔ بڑے بڑے افسروں نے کتب خانے کا معائنہ کیا۔ اچھے خیالات کا اظہار کیا مگر جب ذہنی پراگندگی بڑھتی گئی تو کتب خانے میں آنے والوں کی مجال نہیں تھی کہ کسی کتاب کو ہاتھ لگالیں۔ ادھر کسی نے کتاب دیکھی اور وہ بگڑے۔ یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ ناچار کتب خانہ بند کرنا پڑا۔ حکومت کی طرف سے نوٹس آیا کہ کتب خانہ کھولا جائے۔ یہاں اس کی کوئی گنجایش نہیں۔ آخرکار میونسپل کمیٹی نے تعمیراتی اخراجات

ادا کر کے عمارت اپنے قبضے میں لے لی۔ حکومت کی طرف سے سرپرستی جاری رہی۔ شمس العلما کا خطاب مل گیا۔ وہ پہلے شمس العلما تھے۔ مگر چشمۂ آفتاب بے نور ہو رہا تھا۔ عجب طرح کا خلل دماغ تھا۔ ابھی اچھے بھلے بیٹھے ہیں، بات چیت کر رہے ہیں، علم و فضل کے دریا بہا رہے ہیں اور اچانک بے کہے سنے بے ڈھنگے پن سے اُٹھے اور کسی طرف چل دیے۔

نواں کوٹ میں ایک مجذوب کا مسکن تھا۔ وہاں اکثر جاتے تھے۔ وہ مجذوب نہ کسی سے بات کرتے تھے نہ کسی سے کوئی چیز لیتے تھے۔ آزاد جاتے تو دونوں میں خوب گھٹتی۔ دونوں ایک دوسرے کے اداشناس تھے۔

ملازمت سے سبک دوشی کا وقت آ پہنچا۔ پنشن کے لیے تگ و دو ہوئی۔ پنشن بھی مقرر ہو گئی مگر آزاد کو پنشن وصول کرنا میسر نہیں ہوا۔ ضلع لاہور کے جج نے ان کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر ان کے بیٹے آغا محمد ابراہیم کو ان کی جائداد کا متولی مقرر کر دیا۔ پنشن بھی وہی وصول کرتے تھے۔ ایک آنریری اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے سردار نریندر سنگھ۔ عدالت نے انھیں آزاد کی ذات کا نگراں مقرر کر دیا۔ چلو چھٹی ہوئی عدالت نے بھی ان کے جنون پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کچھ دن دارالمجانین میں بھی گزارے لیکن:

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

آغا ابراہیم باپ کی حالت نہ دیکھ سکے۔ گھر لے آئے۔ نجانے جی میں کیا سمائی۔ بے کہے سنے، دلّی چل دیے۔ لاہور میں ڈھنڈیا پڑ رہی ہے۔ کہاں گئے، کب گئے، کیسے گئے۔ کیا الوپ انجن ہو گئے۔ لوگوں نے سارا شہر چھان مارا۔ کہیں ہوں تو ملیں۔ خدا خدا کر کے دلّی سے خبر آئی کہ وہاں ہیں۔ پہلے تو کہیں ٹھہرنے کے روادار نہیں تھے۔ دن بھر مارے مارے پھرتے تھے۔ کبھی قطب صاحب کی سیر کر رہے ہیں، کبھی قدم شریف میں ہیں، کبھی حضرت سلطان جیؒ میں بیٹھے ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ بچپن کے دوست اور ہم جماعت تھے۔ منّت سماجت کر کے اپنے گھر لے گئے۔ بڑی نازبرداریاں کیں۔ دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ادھر آزاد کا یہ مراق کہ بات بات پر ضد، نئے سے نیا شُغلہ۔ ذکاءاللہ، دوست کی دوستی میں سب کچھ برداشت کرتے۔ یار کی یاری سے کام، یار

کے فعلوں سے کیا کام۔

ایک دن ذکا اللہ خط بنوا رہے تھے۔ آزاد بھی بیٹھے تھے۔ یکا یک کھڑے ہو گئے۔ موتراش سے کہا۔ "ادھر ہٹ، اُسترا مجھے دے۔" یہ کہہ کر اُسترا لے لیا اور ذکا اللہ کا خط بنانے لگے۔ اتنے میں آ گئے، مولوی نذیر احمد۔ آزاد اور ذکا اللہ کے پُرانے ہم جماعت اور دوست۔ آزاد خط بناتے رہے۔ نذیر احمد خون کے سے گھونٹ پیتے رہے۔ جب آزاد خط بنا چکے اور وہاں سے چلے گئے تو نذیر احمد نے ذکا اللہ کو ٹوکا۔ "تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اُس جنونی کے سامنے گلا رکھ دیا۔ اور جو وہ گردن اُڑا دیتا تو۔۔۔" دوست ہو تو ذکا اللہ جیسا۔ بولے۔ "آزاد ہمارا دوست ہے۔ ہماری گردن نہیں اُڑا سکتا۔"

نذیر احمد منہ پھٹ تھے۔ دھاکڑ تھے، لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ جو جی میں آتا برملا کہتے۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ان کی ملاقات ہندوستان کے مشہور وائسرائے لارڈ کرزن سے ہوئی۔ لارڈ کرزن نے گفتگو کے دوران کہا، "ہندوستانی جھوٹے ہوتے ہیں۔" نذیر احمد نے برجستہ جواب دیا، "اور آپ جھوٹوں کے بادشاہ ہیں۔" ایسا برجستہ گو اور قادرالکلام بھی اپنے ہمدمِ دیرینہ اور قدیم ہم جماعت کی استادی اور انشا پردازی کا قایل تھا۔ قایل کیا تھا، لوہا مانتا تھا۔ لاہور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ نذیر احمد بھی شریک ہوئے۔ آزاد کو خبر ملی تو وارفتگی کے باوجود ان سے ملنے پہنچے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی الجھی ہوئی، کبھی سُلجھی ہوئی۔ اس دوران نذیر احمد نے کہا، "سرسیّد کی فرمائش ہے۔ کانفرنس میں ایک لیکچر میرا بھی ہوگا، اگر آپ ایک نظر اسے دیکھ لیں تو مجھے اطمینان ہو جائے۔" آزاد نے پوچھا، "کہاں ہے وہ لیکچر۔" نذیر احمد نے لیکچر آزاد کے سامنے رکھ دیا۔ آزاد نے وہیں اُسے دیکھنا شروع کر دیا۔ کوئی گھنٹے بھر میں پورا لیکچر دیکھ ڈالا۔ جگہ جگہ کاٹ چھانٹ کرتے گئے۔ کوئی صفحہ اصلاح سے نہیں بچا۔ پھر بولے، "بھئی نذیر! تم اردو لکھنی بھول گئے ہو۔" آزاد کی اصلاح دیکھ کر نذیر احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگے، "اس ملک میں اب بھی ایک آدمی ایسا موجود ہے جو مجھ بوڑھے بچے کو اصلاح دے سکتا ہے۔" یہ آزاد کی ادبی عظمت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔

جب دلّی میں بہت دن ہو گئے تو آغا محمد ابراہیم گئے اور لاہور لے آئے لیکن:

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

آرجار جاری رہی۔ لاہور سے نکلے۔ نجانے کن کن مصیبتوں سے علی گڑھ پہنچ گئے۔ رات کا وقت تھا۔ سرسیّد کو اطلاع ہوئی، ایک صاحب باہر کھڑے ہیں۔ کچھ ہولا خبطا سے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا معلوم کہاں سے خاک اُڑاتے آرہے ہیں۔ آزاد نام بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں سرسیّد سے ملنے لاہور سے آیا ہوں۔ سرسیّد باہر نکلے تو حیران رہ گئے۔ آزاد ہی تھے۔ پنڈلیوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی۔ پیر سوجے ہوئے، آنکھیں ڈگر ڈگر کر رہی ہیں۔ منھ سے بات نہیں نکلتی۔ اندر لے گئے۔ نہلوایا دُھلوایا کپڑے بدلوائے۔ ذرا ہوشوں میں آئے تو مکالمہ شروع ہوا۔ علامی ابوالفضل کی روح میرے پاس آئی تھی۔ دینِ الٰہی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اُس نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ میں نے یہ جواب دیا۔ پھر ابوالفضل نے یہ کہا۔ میں نے یوں کہا۔ غرض یہ کہ ایک طویل مکالمہ سنایا۔ اسی قسم کی اور باتیں بھی کرتے رہے۔ سرسیّد نے انھیں بڑی محبت سے اپنا مہمان رکھا۔ پوری نگہداشت کی۔ پھر ایک معتمد ملازم کے ہمراہ انھیں واپس بھجوادیا۔

یہ تو ابوالفضل سے مکالمہ تھا۔ اُن کے ذہن میں یہ وہم بھی حقیقت اختیار کر گیا تھا کہ وہ راجا جے چند کے اوتار ہیں۔ یہ راجا جے چند قنوج والے تھے مگر انھیں دیوتا کا روپ اور مرتبہ حاصل نہیں تھا۔ جے چند تاریخ ہندوستان کا وہ راجا ہے جس کی بیٹی سنجوگتا کو دلّی کا راجا پرتھوی راج بھرے سوئمبر سے اٹھا لے گیا تھا۔ خدا معلوم یہ وہم کیسے جاگزیں ہوا۔ عالمِ جنوں میں آزاد چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھتے رہتے تھے اور خود ہی جلد بناتے۔ ان میں سے بعض میں راجا جے چند کا تذکرہ ہے۔ عجب انداز تھا۔ سیدھے سبھاؤ خیالات کا اظہار کرتے جارہے ہیں۔ بیان مربوط، خیالات منظم، انشاپردازی کی شان، طرزِ آزاد کی انفرادیت اور اچانک بہکے تو پھر بہکے۔ چارلس ایچیسن کا تذکرہ ہونے لگا، مولوی رجب علی کی "مدح سرائی" ہونے لگی، بیٹے بہو کا شکوہ ہونے لگا، مولوی محمد باقر کے قتل کی روداد سنانے لگے، مشائین اور اشراقین کا موازنہ ہونے لگا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہن کے خزانے کی دولتِ خفتہ اچانک اور بے محابا منظرِ عام پر آگئی ہے۔ اپنی چھب دکھا رہی ہے اور دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر بجلیاں گرا رہی ہے۔ مزاج میں وہ جو نفاست تھی،

پاکیزگی تھی، لکھنے کا خصوصی اہتمام تھا، قلم دان میں مختلف قسم کے قلم رکھے ہیں۔ رنگ برنگی روشنائیاں ہیں، عمدہ کاغذ کے دستے قاعدے سے رکھے ہیں، فرش پر صاف ستھری چادر، اُس پر پتلا سا گدا۔ سارا اہتمام جاتا رہا۔ خلل دماغ سب کو کھا گیا۔

عالم جنوں میں بڑا سہارا ایہی تصنیف و تالیف کا ذوق اور شہر کی سیر تھا۔ صبح جب آزاد سیر کے لیے نکلتے تو دفتروں کو جانے والے انگریز اور ہندوستانی افسر انھیں دیکھ کر اپنی گاڑیاں رکوا لیتے یا بڑی احتیاط سے گزرتے۔ یہ آزاد کا احترام تھا۔ علم اور آگہی کا احترام تھا۔ یہ عزت و احترام کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

باہر یہ مان جان اور گھر میں یہ بے وقری کہ آنے جانے والے حیران۔ خواجہ میر دردؒ کے نواسے خواجہ ناصر نذیر فراق آزاد کے شاگرد رشید تھے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے استاد کا خیال آیا۔ بے اختیار ہو گئے۔ دلّی سے لاہور گھر آنگن تھا۔ پہنچ گئے۔ جا کر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آزاد کے پوتے آغا محمد یوسف نکلے۔ وہ فراق کو کیا پہچانتے۔ جب انھوں نے کہا۔ "آپ کے دادا جان کی زیارت کو دلّی سے حاضر ہوا ہوں۔" تو انھوں نے کہا، "امام باڑے کے برآمدے میں کھانا کھا رہے ہیں۔ آیئے وہیں چلیے۔" فراق برآمدے میں گئے تو دیکھا کہ ایک طرف کچھ راکھ، ایک طرف کچھ کوئلے اور کوڑا پڑا ہوا ہے۔ بوریے پر ایک زدہ حال نڈھال بوڑھا کھانا کھا رہا ہے۔ قدیم وضع کے صاف ستھرے مولویانہ لباس کے بجائے کثیف کپڑے۔ سامنے مٹی کی رکابی رکھی ہے جس میں شوربہ ہے۔ چنگیر میں روٹیاں ہیں۔ ایک نوالہ توڑتا ہے، شوربے میں ڈبوتا ہے، منھ میں رکھ کر دیر تک چباتا ہے، پھر بڑی مشکل سے نگل لیتا ہے۔ فراق نے بڑھ کر سلام کیا۔ ہمت کر کے اپنا نام بتایا۔ آزاد نے کہا، "میں تو نہیں پہچانتا۔ تم ہو کون؟" فراق نے بڑے ادب سے کہا۔ "حضور آپ کا شاگرد ہوں۔" آزاد نے یہ سن کر کہا، "اچھا میرے شاگرد ہو تو دوڑ کر میرے لیے گرما گرم جلیبیاں لے آؤ۔" فراق ازراہِ سعادت مندی جھپٹ کر باہر نکلے، حلوائی کی دکان پر پہنچے۔ دوپہر کے وقت گرما گرم جلیبیاں کہاں سے آئیں۔ بچی کھچی ٹھنڈی جلیبیاں لے آئے۔ استاد کے سامنے رکھ دیں۔ انھوں نے ایک جلیبی اٹھائی۔ بولے، "میرے ہلتے ہوئے دانتوں سے یہ ٹھنڈی جلیبیاں کیا کھائی جائیں گی۔" فراق نے اصرار کیا، "استاد ایک آدھ چکھ لیجیے۔" ان کا اتنا کہنا

کہ آزاد تھے پرے اُکھڑ گئے۔ گھور کر دیکھا۔ بولے، "جاؤ یہاں سے۔" آغا یوسف نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ دونوں اُٹھ آئے۔ امام باڑے کے صدر دروازے میں بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔ پھر آغا کہنے لگے، "حضرت قبر کا عذاب مردہ ہی جانتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ روٹی دستر خوان میں لے جایئے تو دستر خوان جلا دیتے ہیں۔ سالن چینی کی رکابیوں میں جائے تو رکابیاں توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تانبے کی رکابیوں میں کھانا دیا جائے تو رکابیاں بازار میں بیچ آتے ہیں یا کسی راہ چلتے کو دے دیتے ہیں۔ سیکڑوں برتن اس طرح غارت ہو چکے ہیں۔ صاف ستھرے کپڑوں سے بیر ہے۔ اِدھر پہنائے گئے اور اُدھر انھوں نے پھاڑے۔" یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ آزاد خلال کرتے ہوئے ادھر آنکلے۔ فراق کو دیکھ کر بولے، "ہیں۔ تم دلّی سے کب آ گئے۔ واللہ میں نے تمھیں اُس وقت نہیں پہچانا تھا۔ ہاں میاں! تمھارا نام ناصر نذیر ہے۔" فراق نے موقع غنیمت سمجھ کر عرض کیا، "میں نے ایک سلام کہا ہے۔ وہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔" آزاد نے کہا، "ہاں میاں پڑھو۔" فراق سلام پڑھنے لگے۔ آزاد سنتے رہے۔ کوئی شعر پسند آتا تو کہتے خوب کہا ہے۔ پسند نہیں آتا تو کہتے، "یہ کچھ نہیں۔" فراق مقطع پڑھ چکے تو آزاد نے کہا، "تمھارا سلام بہت اچھا ہے۔ کہیں کہیں جو میں نے، کہہ دیا تھا کہ یہ کچھ نہیں، یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا ہے۔" دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے اور بازار کی طرف چلے گئے۔

شہر میں عجیب عجیب افواہیں اڑتیں۔ "اصل میں وظیفہ اُلٹ گیا۔ وظیفے بہت پڑھتے تھے۔" "بیٹے بہو کی بد سلوکی سے بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔" "کسی کو اپنے مسودوں میں ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ "دربارِ اکبری" کا مسودہ راوی میں پھینک آئے۔" اولیا اللہ کے بارے میں "آبِ حیات" میں بیہودہ اور بے سروپا باتیں لکھی تھیں۔ یہ اُسی کا شاخسانہ ہے۔" کسی بگڑے دل نے کہا۔ "بڑھاپے میں استاد کا کلام مرتب کرنے بیٹھے۔ کلام مرتب کرتے کرتے استاد کو اصلاح دینے لگے۔ اصلاح میں ایسے ڈوبے کہ دنیا مافیہا سے غافل ہو گئے۔ ہوشوں سے جاتے رہے۔" جتنے منھ اتنی باتیں۔ مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے۔ کہنے والے کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

بیٹے بہو کی بد سلوکی افسانہ ہی افسانہ تھی۔ آغا محمد ابراہیم اکلوتے بیٹے تھے۔ جی جان سے باپ کی خدمت کرتے تھے۔ حکیم سے علاج کرانے دلّی لے گئے۔ کوئی فایدہ نہیں ہوا۔ ملازمت

سے مجبور تھے۔ چھٹی ختم ہو گئی تو باپ کو ساتھ لے کر لاہور واپس چلے۔ بیٹے کی جاں فشانی، باپ کی ستم رانی، جگادھری کے اسٹیشن پر چپکے سے اتر گئے۔ اُلٹے پیروں دلّی چل دیے۔ بیٹے کے منھ کو لوکا لگا گئے۔ کہنے والوں نے رڈّا چڑھایا۔ "ارے میاں! خود پڑے سوتے رہے۔ باپ کی کوئی نگہداشت نہیں کی۔"

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک دن گھر میں بیٹھے تھے۔ جنون کا زور تھا۔ آواز آئی، "محمد حسین کو توال کے یہاں سے سواریاں آئی ہے۔" انھوں نے کوتوال کا لفظ تو سنا نہیں۔ دوڑ پڑے۔ "بیوی آگئیں۔ بیوی آگئیں۔" بیوی کو مرے ہوئے کئی برس گزر چکے تھے۔ سب نے تو تھمبو کی مگر وہ عالم وارفتگی میں "بیوی۔ بیوی۔" کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ آنے والی بی بی نے پلنگ کے نیچے چھپنا چاہا مگر انھوں نے زبردستی باہر کھینچ لیا۔ منھ دیکھا تو بھوں چکّے رہ گئے۔ "یہ تو میری بیوی نہیں ہیں۔" کہتے ہوئے واپس لوٹے۔ بچپن کے "یہ تو میری امی نہیں ہیں۔" کی یاد تازہ ہو گئی۔ شہر بھر میں تھڑی تھڑی ہوئی۔ آغا ابراہیم کی بڑی بدنامی ہوئی۔ بدنامی تو ہونا ہی تھی۔

دیوانگی سے قطع نظر آزاد آغا ابراہیم کو بہت چاہتے تھے۔ استاد کے نام پر نام رکھا تھا۔ استاد کے نام پر بھی فدا تھے۔ بیٹے کے بھی فدائی تھے۔ بچپن میں پیار سے ابرو کہتے تھے۔ ہر جگہ ساتھ لیے پھرتے تھے۔ رڑکی کالج میں داخل کرا دیا۔ پھر بیٹے کی جدائی سے ایسے پریشان ہوئے کہ واپس لے آئے۔ بڑی دھوم سے شادی کی۔ بیٹے نے بڑے سلیقے سے زندگی گزاری۔ مولوی محمد باقر کے دلّی والے مکان کا ایک حصہ خرید لیا۔ لاہور میں اکبری منڈی میں آزاد منزل بنوائی۔ باپ کی کتابیں شایع کیں۔ "سخن دانِ فارس" اور "دیوانِ ذوق" اُنھیں کے اہتمام سے شایع ہوئیں۔ "دربارِ اکبری" کا مسودہ آزاد کے شاگرد تہذیب نسواں والے مولوی ممتاز علی کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے شایع تو کر دیا لیکن یہ شگوفہ بھی چھوڑا کہ کتاب کا "تتمہ" ناتمام اور غیر مرتب تھا۔ میں نے اسے مکمل کیا اور ترتیب بھی درست کی ہے۔" اس بیان کا بڑا چرچا ہوا۔ اتفاق سے آغا ابراہیم کی ملاقات مولانا شبلی سے ہوئی۔ انھوں نے دریافت کیا، "یہ جو مولوی ممتاز علی نے "دربارِ اکبری" میں لکھا ہے کہ تتمہ ان کا تحریر کردہ ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔" آغا ابراہیم نے کہا، "مسودہ موجود ہے۔ ملاحظہ فرما لیجیے۔ حقیقت خود عیاں ہو جائے گی۔" اس پر مولانا شبلی نے کہا، "مجھے پہلے ہی

شک تھا۔ یہ تحریر آزاد کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ ان کا طرز چھپائے سے نہیں چھپتا۔" اس گفتگو کے بعد آغا صاحب نے "دربارِ اکبری" جیسی ضخیم کتاب خود ہی دوبارہ شایع کر دی۔ باپ کی اور خدمت کیا کرتے۔ کتاب کا مقدمہ لکھ کر ساری حقیقت بھی واضح کر دی تھی۔

یہ بھی آزاد کی بد قسمتی کہ اچھے شاگرد میسر نہیں آئے۔ ایک شاگرد خواجہ ناصر نذیر فراق تھے۔ دلّی کے دلدادہ۔ ٹکسالی زبان لکھتے تھے۔ سات طلاقنوں کی کہانی ایسی لکھی کہ آزاد نے پڑھی تو ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے مگر فراق پرانی تہذیب کے نوحہ خواں تھے۔ طرزِ نو سے ناآشنا جو کچھ لکھا ہے، خوب لکھا ہے مگر استاد کے نام اور کام کو آگے نہیں بڑھایا۔ "سرگزشتِ الفاظ" والے مولوی احمد دین تھے۔ "سرگزشتِ الفاظ" آزاد کے نام معنون بھی ہے مگر مولوی صاحب آزاد سے فیض اٹھانے کے باوجود لسانیات کا مزید مطالعہ جاری نہ رکھ سکے۔ دوسری راہ پر چل دیے اور اقبال شناسی کا بڑا حوالہ بن گئے۔ ادب سے تعلق رکھنے والے دوسرے شاگرد مولوی ممتاز علی تھے۔ وہ اردو میں ادبِ نسواں اور ادبِ اطفال کا حوالہ بن گئے۔ تاہم وہ بھی استاد کے فیض کا صحیح اظہار نہیں کر سکے۔ ہزاروں شاگردوں کے استاد الاساتذہ کی یہ محرومی اور ناکامی بھی قابلِ افسوس ہے۔ "اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے۔"

"کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے" کتابیں جمع کرتے رہے۔ بڑا شوق تھا۔ کوئی نادر کتاب مل گئی تو نقل کر ڈالی۔ کتب خانہ بنایا۔ ایران سے کتابیں لائے۔ سب کتب خانے میں رکھ دیں۔ کتب خانہ بھی دیوانگی کی نذر ہوا۔ کتابیں پنجاب یونیورسٹی پہنچ گئیں۔ پرانے سکے جمع کرنے کا شوق تھا۔ ایک ہی دفعہ میں تین سو ساڑھے تین سو سکّے جاتے رہے۔ وہ شوق بھی ختم ہوا۔ جنون نے کہیں کا نہ رکھا، ورنہ آزاد خوش مزاج تھے۔ ہمدرد تھے، طلبہ کا بڑا خیال کرتے تھے۔ اس میں ہندو مسلمان کی قید نہیں تھی۔ دوستوں اور غیروں سب کے کام آتے تھے سب کی مدد کرتے تھے مگر واہ رے جنون۔ سب پر پانی پھیر دیا۔

آزاد کے ذہن میں بچپن ہی سے گرہیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ وقت گزرتا گیا، گرہیں بڑھتی گئیں۔ سخت ہوتی گئیں۔ پہلے واہمہ تھا۔ پھر واہمے نے مراق کی شکل اختیار کر لی۔ مراق بڑھا تو خبط میں تبدیل ہو گیا۔ خبط مالیخولیا بن گیا اور آخر آخر جنون ہو گیا:

جگر جورِ گردوں سے خوں ہوگیا
مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہوگیا

آزاد ساری زندگی ان کیفیات سے گزرتے رہے اور حالات کا مقابلہ کرتے رہے مگر چومکھی کب تک لڑتے۔ بیس برس اسی لڑائی میں گزر گئے۔ پورے بیس برس دیوانگی کی کیفیت طاری رہی۔ بیس برس زبان سے کہہ دینا بہت آسان ہے۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے، روحانی کرب اور دمبدم کی اذیت کو وہی سمجھتا ہے۔ آخر کار ہمت ہار بیٹھے۔ دیوانگی نے غلبہ پالیا۔ اسیر جنون ہوگئے۔ بڑھاپے کے عوارض نے بالکل ہی پست کر دیا۔ دیکھنے والے "فاعتبرو یا اولی الابصار" پڑھتے ہوئے اردو ادب کے اس کوہِ گراں کو زلزلوں سے پیہم لرزتے، تڑختے چٹختے، زمیں بوس ہوتے دیکھتے اور پناہ مانگتے رہے۔

عشرہ محرم کی ابتدائی تاریخ، نواب نوازش علی کے امام باڑے میں مجلس کی تیاری۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ کچھ اور آنے والوں کا انتظار ہے۔ اتنے میں ایک بڈھا، ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ سارے جسم پر لرزہ، لمبی لمبی سانسیں، سر پر چکٹ ٹوپی، گلے میں پرانی دھرانی میلی کچیلی اچکن جس کی چولی کے آدھے بٹن ٹوٹے ہوئے۔ ڈبل زین کا کثیف پاجامہ۔ پیروں میں لیتڑے۔ سب نے اُسے دیکھ کر منھ بنایا۔ وہ چپ چاپ اُس طرف بیٹھ گیا، جدھر روشنی کم تھی۔ ذرا دیر بعد اُس نے چلّا کر پوچھا، "مجلس ابھی شروع نہیں ہوئی؟" کسی نے کہا، "شروع ہونے والی ہے۔" ذرا دیر بعد اُس نے پھر یہی سوال کیا اور چیخ کر کہا، نہیں شروع ہوتی تو نہ ہو۔ ہم اپنا سلام پڑھے دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں سلام شروع کر دیا:

اے مجرئی پھرا سر سرور کہاں کہاں
قرآں لیے پھرے ہیں ستم گر کہاں کہاں
پھرتا تھا نیزے پر سر سرور کہاں کہاں
تھا آفتاب حشر سے محشر کہاں کہاں
مشکیزہ بھر کے نہر سے عباسؓ لے ہی آئے
کہتے ہی رہ گئے وہ ستم گر کہاں کہاں

قربان جاؤں دلبرِ مشکل کشاؑ کے میں
مشکل کشائی کرتے ہیں جا کر کہاں کہاں
بندے کو رکھیے اپنی غلامی میں یا امامؑ
آزادؔ ہو کے جائے گا در در کہاں کہاں

وہ تو سلام پڑھ کاغذ پھینک، یہ جا وہ جا، مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ ”از زمیں تا آسمان اک سوختن کا باب تھا۔“ لوگ ذرا سنبھلے تو آوازیں بلند ہوئیں، ”اچھا تو یہ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد تھے۔“ ”آج اُنھیں بھی دیکھنے اور سننے کی سعادت حاصل ہوگئی۔“ بہتوں کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

بیماری بڑھتی گئی۔ دُکھ بڑھتے گئے۔ بے قراری بڑھتی گئی۔ ۱۹۱۰ء کے عشرے کی رات تھی۔ قیدِ جنوں اور قیدِ حیات دونوں سے چھوٹ گئے۔ ”نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔“ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آگیا۔ خود چلے گئے۔۔۔ اردو ادب کو آبِ حیات پلا گئے۔

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے
(مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں
تبدیل کیا جاتا ہے، ہمارے کتابی سلسلے
کا حصہ بننے کیلئے **وٹس ایپ** پر رابطہ
کریں

حسنین سیالوی

0305-6406067